جلد اول

تالیف

حبیب الامت عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی، بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور سنجرپور اعظم گڑھ، یوپی

خلیفہ ومجاز بیعت

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی وحضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری

مکتبۃ الحبیب جامعہ اسلامیہ دارالعلوم

مہذب پور، پوسٹ سنجرپور ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)

ملنے کا پتہ: مکتبہ طیبہ دیوبند، یوپی

MAKTABA-AL-HABIB

JAMIA ISLAMIA DARUL ULOOM

MUHAZZABPUR P.O.SANJARPUR DISTT. AZAMGARH U.P. INDIA

Mobile: 09450546400

يلوح الخط فی القرطاس دهراً
و کاتبه رميم فی التراب

حیات حبیب الامت

جلد اول

تالیف:

حبیب الامت، عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

ناشر

مکتبہ الحبیب

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور

پوسٹ سنجر پور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

نام کتاب: حیات حبیب الامت (جلد اول)
مصنف: حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
صفحات: 320
تعداد اشاعت: 1100
قیمت: 250
ناشر: مکتبہ الحبیب، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور
پوسٹ سنجر پور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ الحبیب جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڈھ، یوپی
۲- مکتبہ الحبیب خانقاہ حبیب گوونڈی ممبئی
۳- مکتبہ الحبیب وخانقاہ حبیب جھٹکاہی ڈھاکہ ضلع مشرقی چمپارن
۴- مکتبہ طیّبہ دیوبند، سہارنپور

فہرست

☆☆☆

کوئی بزم ہو کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلادیا
اک چراغ
تالیف
حبیب الامت عارف باللہ
حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
شیخ الحدیث وصدر مفتی بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور سنجر پور اعظم گڑھ یوپی
خلیفہ ومجاز بیعت
حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی وحضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری
ناشر
مکتبۃ الحبیب جامعہ اسلامیہ دارالعلوم
مہذب پور، پوسٹ سنجرپور ضلع اعظم گڑھ یوپی (انڈیا)
ملنے کا پتہ: مکتبہ طیبہ دیوبند، یوپی

پیش لفظ

حیات حبیب الامت

(جلداول)

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میری امت کے اکثر افراد کی زندگی ساٹھ وستر کے درمیان ہوگی، کم لوگ ایسے ہوں گے جو ستر سے متجاوز ہوں گے، اس لئے موٹا حساب اگر ساٹھ سال کا رکھ لیا جائے تو پھر یہ ساٹھ سالہ زندگی تین مراحل میں منقسم ہوتی ہیں:

(۱)ایک سے بیس سال

(۲)اکیس سے چالیس سال

(۳)اکتالیس سے ساٹھ سال

پھران تینوں مراحل میں سے پہلا مرحلہ جو عموماً بچپن کی نذر ہو جاتا ہے اور دوسرا مرحلہ جوانی کی دیوانگی اور اسباب تزین وتفاخر اور اس کی جستجو وتلاش اور تعیشات کی فراہمی کی نذر ہو جاتا ہے، اور تیسرا مرحلہ تکاثر فی الاموال والاولاد کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، اور صبح وشام کی مجلسوں کی زینت یہی امور بن کر رہ جاتے ہیں کہ میں اتنی جائیداد اور اتنی پراپرٹی اور اتنے باغات اور اتنی فیکٹریوں کا مالک ہوں اور میرے تو ناتی اتنے

ہیں اور پوتے اتنے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے اور کن مقاصد کے تحت انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

لیکن اس دار فانی میں ایسے بھی صلحاء، اتقیاء، انقیاء، اصفیاء، ابرار واخیار پیدا ہوئے اور آئے جنھوں نے اس دنیا کی زندگی کے مقصد کو سمجھا اور اپنے کو اس کام میں بحسن وخوبی لگائے رکھا جس کام کے لئے وہ دنیا میں آئے تھے جس کے نتیجہ میں انھوں نے وقت مقررہ پر اگر چہ اس دنیا کو الوداع کہہ دیا لیکن ان کی زندگی ان کے ارشادات وفرمودات ان کی عبادت معاملات، ان کی خلوت وجلوت، ان کا سفر وحضر، ان کی آسائش وآزمائش، ان کی کشادگی اور تنگی، ان کی انابت اور تقرب الی اللہ، ان کا تقوی اور ان کی خشیت بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے اسوہ ونمونہ وآئیڈیل بن گئے، وہ خود اگر چہ اس دار فانی میں نہیں رہے لیکن جن صفات پر وہ زندگی گزار کر گئے اس نے ان کو ایسا دوام وثبات بخشا کہ وہ اس شعر کے مصداق بن گئے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور اصل زندگی انہی حضرات کی ہے جنھوں نے مقصد حیات کو سمجھا اور اپنے کو اس میں لگا دیا، ایسے حضرات کی زندگی کا ایک ایک گوشہ بعد میں آنے والے خوردوں کے لئے نمونہ اور درس عبرت بنا اور بہت سے خوردوں نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو نمونۂ سلف کہلانے کا مستحق بنا دیا۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ عموماً صلحاء، اتقیاء، اولیاء، اوراصفیاء کے زیراثر رہنے والے تین قسم کے افراد بالعموم ایسے رہے جو اپنے اسلاف کے فیوض وبرکات سے محروم رہے:

(۱) بیوی

(۲) اولاد

(۳) خدام

چونکہ اللہ والوں سے فیض حاصل کرنے کے لئے جتنی دوری بنانا ضروری ہے یہ تینوں اتنی دوری نہیں بنا پاتے اور ضرورت سے زیادہ قربت و راحت ان کو تعیّشات کی راہ پر ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے باطن اور روحانی فیوض وبرکات سے یہ محروم ہوکر صرف مادی نعمتوں کی نذر ہوجاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اصل نعمت مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے مراحل آتے ہیں اور کچھ ایسے نشیب وفراز ہوتے ہیں، کچھ ایسے مد وزجر ہوتے ہیں، کچھ ایسے خدوخال ہوتے ہیں جو خوردوں کے لئے مثال عبرت بنتے ہیں اور خوردوں کو ان سے بہت کچھ سیکھنے وسمجھنے کا موقع ملتا ہے، چاہے وہ زندگی کے کسی بھی لائن سے وابستہ ہو، ہر لائن کے اپنے الگ الگ تجربات ہوتے ہیں، الگ الگ مشاہدات ہوتے ہیں جو خوردوں کی زندگی کی مشکل گھڑیوں میں درس عبرت بنتے ہیں اور سفینۂ حیات کو تلاطم سے

نکالنے میں معین اور معاون بنتے ہیں، لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب خورد اپنے کو خورد سمجھے اور اپنے بڑوں کو بزرگ کا درجہ دے، اگر خوردوں نے خود اپنے کو بڑا سمجھنا شروع کر دیا اور بڑوں کے مقابلہ میں اپنے کو ان سے تجربہ کار اور ذہین سمجھنا شروع کر دیا اور ''أنا خير منه'' کا بول زبان سے نکلنے لگا تو ایسوں کے لئے بڑوں کی زندگیاں اور ان کے تجربات بیکار و بے سود ہوتے ہیں اور پھر ایسوں کے غرور اور کبر اور مزاج ابلیسیت کا علاج اللہ کی طرف سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت بنا دیئے جاتے ہیں۔

یہ خادم نہ اولیاء میں سے ہے نہ صلحاء میں سے، لیکن یہ ضرور ہے کہ سیکڑوں اولیاء وصلحاء کو ان آنکھوں نے ضرور دیکھا ہے اور ان سے روحانی اکتساب فیض کا خوب خوب موقع ملا ہے، اور درجنوں اکابر اولیاء کی بافیض صحبت میں اور ان کی رفاقت ومعیت میں رہنے کی سعادت ایک زمانے تک حاصل رہی ہے ، ان کے علوم ومعرفت، کمال و جمال روحانی فیوض و برکات سے بھی مستفید ہونے کا پورا پورا موقع ملا اور ان حضرات کی حیات طیبہ سے بہت کچھ حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہ خادم اگرچہ اپنے کو اس لائق نہیں سمجھ رہا تھا کہ اپنی حیات کے نشیب وفراز اور خدوخال اور مسائل و مصائب جن سے ایک زمانے تک گزرنا ہوا وہ امت کے ہاتھوں میں آئے اور لوگوں کی نظر سے گزرے اور نہ ہی کوئی ایسا خاص کمال اپنے اندر تھا جو سپرد قرطاس وقلم کیا جائے ''من آنم کہ من دانم'' کا مصداق میں اپنے کو سمجھ رہا تھا۔

لیکن رفقاء واحباب، تلامذہ ومتعلقین، محبین ومنتسبین، خلفاء ومسترشدین کا اتنا اصرار اور دباؤ بڑھا کہ مجبوراً قلم اٹھانا پڑا اور پینسٹھ سالہ زندگی کے کچھ اہم گوشوں کو اپنے ان خوردوں اور عزیزوں کے لئے بطور مشعل راہ سپرد قرطاس کرنا پڑا۔

اس کے ساتھ یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اس خادم کی طرف منسوب بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کو مفروضہ بنا کر بعض لوگ گفتگو کا موضوع بناتے رہتے ہیں، اس طرح ایک موقع ہے کہ اس کے ذریعہ ان لوگوں تک صحیح بات اور صحیح صورت حال پہنچ سکے گی۔ اور ممکن ہے اس سے حقائق کو جاننے کے بعد ان کی سوچ میں تبدیلی آئے گی اور حق اور حقیقت سے وہ آشنا ہوسکیں گے۔

''حیات حبیب الامت'' کے اوراق وصفحات میں جو کچھ بھی آپ پڑھیں گے وہ ساری باتیں مبنی برحقیقت ہیں، اس خادم نے کسی بھی موقع سے نہ کذب بیانی سے کام لیا ہے اور نہ ہی تہمت اور الزام کے قبیل سے کوئی بات کہی ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ہر طرح کے الزام اور غلط بیانی سے پاک وصاف اور مبنی برحقیقت باتیں ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے بہت ساری باتیں وہ ہیں جن کی صحیح صورت حال سے بہت سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ اس خادم کو امید ہے کہ راقم کے ان سطور سے ان کی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور حقائق تک پہونچنے میں ان کو مدد ملے گی۔

نیز اس سے اس خادم کی زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے میں اور واقعات کو جاننے کا اور اس سے عبرت حاصل کرنے کا پورا پورا موقع ملے گا۔

نیز اس خادم کی نیت اس تحریر سے نہ کسی کی تحقیر ہے نہ تذلیل، نہ تنقیص ہے نہ توہین، لیکن اگر کسی کی اس خادم کی تحریر سے دل آزاری ہو تو اس کے لئے بصد احترام پیشگی معذرت خواہ ہے۔

اللہ کرے اس خادم کی تحریر میرے ان احباب و رفقاء، تلامذہ و محبین، خلفاء و مسترشدین کے لئے مشعل راہ کا کام کرے۔

و ما ذلک علی اللہ بعزیز.

احب الصالحین و لست منهم

لعل الله یرزقنی صلاحا

مفتی حبیب اللہ قاسمی

۲۸/ رجب ۱۴۴۲ھ

۱۲/ مارچ ۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ صوبہ بہار

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں صوبہ بہار ایک ایسا صوبہ ہے جو از اول تا آخر نیپال کے پارڈر سے متصل ہے، نیپال کی ساری ندیاں اور ان کا پانی بہار سے گذر کر آگے بڑھتا ہے جس کی وجہ سے صوبہ بہار زرخیز ہونے کے باوجود مادی اعتبار سے ہمیشہ کمزور رہا ہے۔لیکن علمی اعتبار سے اس کمزور سرزمین سے ہر لائن کے کبار علماء ومشائخ پیدا ہوئے اور خطہ کا نام پورے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں روشن کیا،علم کی جستجو اس خطہ کی زمین سے پیدا ہونے والوں میں ہمیشہ رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مرکزی مدارس دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنو جیسے اداروں سے ہمیشہ اکثریت صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے طلباء کی رہی ہے، بلکہ آج ہندوستان کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جہاں اس صوبہ کے طلباء علمی جستجو کے لئے نہ پائے جاتے ہوں۔

بلکہ بہت سے مدارس کے وجود و بقاء میں اس صوبہ کے طلباء کا بڑا دخل رہا ہے اور ہے۔ ہمارے ایک دوست مولانا بشیر احمد صاحب قاسمی جو فیض آباد شہر کے ممتاز

اکابر علماء میں سے تھے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے تلامذہ میں ان کا شمار تھا وہ کہا کرتے تھے اللہ جزائے خیر دے صوبہ بہار کے طلباء کو کہ انہوں نے بہت سے مدارس کو زندہ کر رکھا ہے اگر وہ نہ ہوں تو بہت سے مدرسے بند ہو جائیں اور ہم مولویوں کی روزی روٹی بند ہو جائے کہ انہی طلباء کے طفیل ہم جیسے بہت سے مولویوں کی روزی روٹی چل رہی ہے۔

الغرض صوبہ بہار کے لوگوں میں مادی اعتبار سے غربت وافلاس کے باوجود اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے وابستہ کرنے اور بزرگوں کی تعلیمات کا حامل بنانے اور ان کے علوم وفیوض سے آشنا کرانے کا مزاج ایک زمانے سے رہا ہے۔

تذکرہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ

آج سے اٹھائیس سال قبل حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سفر صوبہ بہار کے ضلع مشرقی چمپارن کا تھا، سیوان تک ٹرین سے سفر ہوا، سیوان سے چمپارن کا سفر جیپ سے تھا، رفقاء سفر میں یہ خادم بھی تھا، دوران سفر حضرت قاری صاحبؒ سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا، دوران گفتگو حضرت قاری صاحبؒ نے خادم کو مخاطب کر کے فرمایا، مفتی صاحب صوبہ بہار میں بہت سے اضلاع ہیں اور ماشاء اللہ پورا صوبہ علمی اعتبار سے بہت زرخیز ہے، لیکن

چمپارن اور صوبہ یوپی کا ضلع اعظم گڑھ مجھ کو بہت پسند ہیں۔ خادم نے عرض کیا حضرت اس کی کیا وجہ ہے؟

حضرت نے فرمایا ان دونوں جگہ علماء بہت ہیں اور ان کی زبان بھی صاف ستھری اور اچھی ہے اور علمی ذوق بھی بہت اچھا ہے۔ اس پر خادم نے عرض کیا کہ حضرت تب تو ایک اچھے ضلع کا رہنے والا دوسرے اچھے ضلع میں پہونچا ہے، چونکہ اسی زمانہ میں یہ خادم جونپور سے ہجرت کر کے اعظم گڑھ منتقل ہوا تھا، اس پر حضرت مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔

تذکرہ ضلع چمپارن

صوبہ بہار کے مردم خیز اضلاع میں بشہادت حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ ایک اچھا ضلع چمپارن بھی ہے جو ابتداء سے انتہاء تک نیپال کے بارڈر سے لگا ہوا ہے، صوبہ یوپی کے گورکھپور کے بعد اس ضلع کا آغاز ہوتا ہے اور مظفر پور سیتامڑھی پر اس کی انتہا ہوتی ہے، لمبا ضلع ہونے کی وجہ سے حکومت نے کاغذی سطح پر اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (۱) مغرب (۲) مشرق۔

مغربی چمپارن کا ہیڈ کوارٹر بتیا ہے اور مشرقی چمپارن کا ہیڈ کوارٹر موتیہاری ہے۔ ضلع چمپارن، ضلع کی حیثیت سے تو معروف ہے لیکن اس نام سے کوئی شہر نہیں

ہے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، بلکہ یہ ضلع اپنے دو مشہور شہروں بتیا اور موتیہاری سے جانا جاتا ہے۔ ضلع چمپارن تاریخی اعتبار سے جہاں اس کی بڑی اہمیت ہے چونکہ گاندھی جی نے ایک عظیم تحریک کا آغاز ضلع چمپارن ہی سے کیا تھا، وہیں علمی اعتبار سے بھی اس ضلع کی مستقل حیثیت رہی ہے۔ مغربی چمپارن کے معروف قدیم ادارے جو شہر بتیا اور ساٹھی اور سمرا میں موجود ہیں، اس ضلع کے علمی گہوارہ ہونے کے لئے شاہد عدل ہیں۔ حضرت مولانا ریاض احمد صاحبؒ کا نام گرامی ساٹھی علاقہ کے ان اکابر علماء میں سے ہے جنہوں نے دارالعلوم دیوبند جیسے ادارہ میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے ایک زمانہ تک علمی خدمت انجام دی ہے۔

تذکرہ ڈھاکہ

اسی طرح مشرقی چمپارن کے علاقہ میں ڈھاکہ ایک ایسا قصبہ ہے جو اپنے اندر مرجعیت کا مقام رکھتا ہے، اس خطہ نے بھی شروع سے علم و آگہی میں ایک خصوصی مقام پیدا کیا ہے، جیسے ڈھاکہ قصبہ کا آزاد مدرسہ اسلامیہ جس انداز سے ایک طویل زمانہ تک مقبول خاص و عام رہا ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے، قصبہ ڈھاکہ کے اداروں میں سب سے قدیم ادارہ آزاد مدرسہ اسلامیہ رہا ہے جس کے سرخیل حضرت مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی رہے۔ پورے خطہ میں ان کے علمی

و دینی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، قصبہ ڈہاکہ کے چہار طرف دور تک مسلم بستیوں کی قطار ہے، ڈھاکہ کے پورب دریائے ''لال بکیا'' کے کنارے ضلع چمپارن کی ایک آخری بستی ہے جس کا نام جھٹکاہی ہے۔ دریا کے اُس پار سے سیتامڑھی ضلع شروع ہو جاتا ہے۔

تذکرہ جھٹکاہی

جھٹکاہی بستی دریا کے کنارے ہونے اور مادی اعتبار سے سیلاب زدہ ہونے کی وجہ سے اور زراعت پر انحصار کی بنا پر ہمیشہ کمزور رہی لیکن مادی کمزوری کے باوجود اہل قریہ نے کبھی ایمانی کمزوری اور علمی سستی اور علمی عدم دلچسپی کو قریب نہیں آنے دیا، چھپر کی مساجد میں اپنے ایمان وعمل کو مضبوط کرتے رہے اور حتی المقدور اپنی پہونچ کے اعتبار سے علمی جستجو کو جاری رکھا۔

تذکرہ مولانا عین الحق صاحب

جھٹکاہی میں سب سے پہلے عالم مولانا عین الحق صاحب نام کے ایک بزرگ تھے، یہ جامع العلوم مظفر پور کے فیض یافتہ تھے، انہوں نے پوری زندگی حتی

المقدور اپنے علمی و روحانی فیوض و برکات سے اہل بستی وقرب و جوار کی بستیوں کے لوگوں کو فیض یاب کیا اور عقائد واعمال کی کامیاب اصلاح فرمائی۔

تذکرہ شیخ محمد حنیف جد محترم

اسی بستی کے ایک بزرگ شیخ محمد حنیف تھے جو میاں جی کے نام سے موسوم ومعروف تھے، جو جناب شمس عالم کے لڑکے تھے، یہ تین بھائی تھے، شیخ حنیف، شیخ صدیق، شیخ دیانت، تینوں بھائیوں میں شیخ محمد حنیف انتہائی سادہ مزاج بزرگانہ روایات کے حامل تھے۔ اہل بستی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، سنت وشریعت کے بے حد پابند تھے، دنیا سے بے رغبت، آخرت کے فکرمند تھے، ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے صلاح شعار ومتقی و پرہیزگار تھے۔ قربانی کے ایام میں لوگ اپنے جانور کو ذبح کروانے کے لئے اعتماد واہتمام سے اپنے گھر پر بلاتے اور جانور کا سر بطور نذرانہ کے پیش کرتے جس کی وجہ سے سر سے گھر بھر جایا کرتا تھا، صوم وصلوۃ کے بیحد پابند تھے، علم کے بیحد قدرداں تھے۔

تذکرہ شیخ دیانت

شیخ دیانت کے دو لڑکے تھے شاہ محمد اور شیر محمد، لیکن یہ دونوں ناخواندہ تھے،

اور زرعی کام کاج میں مصروف رہے، شیر محمد کا عمر طبعی سے قبل انتقال ہوگیا۔ اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی۔

شاہ محمد عمر طبعی پا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اولاد میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔

تذکرہ شیخ صدیق

شیخ صدیق کے ایک لڑکے تھے جن کا نام عبدالجلیل تھا، وہ عمر طبعی پا کر دنیا سے رخصت ہوئے، وہ بھی ناخواندہ زراعت میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، نرینہ اولاد میں انکا صرف ایک لڑکا تھا جن کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ شیخ محمد حنیف کی دو لڑکیاں خاتمہ اور فاطمہ تھیں۔ خاتمہ کی شادی علاقہ ہی کے ایک گاؤں مادھو پور مہووا میں ہوئی اور فاطمہ کی شادی گواباری متصل بھوانی پور ہوئی۔

تذکرہ اولاد شیخ محمد حنیف

نرینہ اولاد شیخ محمد حنیف کے تین تھے (۱) یار محمد (۲) ابومحمد (۳) ولی محمد۔ ابومحمد اور ولی محمد بچپن ہی میں وفات پا گئے، بچے یار محمد۔

شیخ محمد حنیف کی شادی علاقہ ہی کے گاؤں جمواں میں ہوئی، اہلیہ کا نام شریفن تھا جو انتہائی سادہ مزاج، خدمت گزار اطاعت شعار تھیں۔ عمر طبعی پا کر شیخ

محمد حنیف کا انتقال پہلے ہوا اور اہلیہ شریفن کا انتقال بعد میں ہوا، اخیر عمر میں ان کی بصارت ختم ہوگئی تھی، لیکن اس حال میں بھی پوتے پوتیوں کی خدمت بہت شوق سے کرتی رہیں۔

تذکرہ شیخ یار محمد صاحب و پسران

شیخ محمد حنیف کی نرینہ اولاد میں صرف شیخ یار محمد کو اللہ پاک نے حیات دی، ان کی بھی شادی اسی بستی میں ہوئی جہاں کی والدہ تھیں، یعنی جموا اہلیہ کا نام مریم خاتون تھا۔ شیخ یار محمد صاحب کو اللہ پاک نے قلیل المال کثیر الاعمال کے ساتھ کثیر العیال بنایا۔ الحمد للہ نرینہ اولاد میں پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں عطاء کیں۔ ربزہ، حفظہ، امۃ النساء، اور بچے اطیعوا اللہ، صفی اللہ، نجی اللہ، کلیم اللہ، حبیب اللہ۔ پانچ لڑکوں میں سے صفی اللہ، شفیع اللہ سے اور نجی اللہ نجیب اللہ سے مشہور ہوئے۔

پانچ لڑکوں میں سے پسر اکبر قاری صاحب سے آگے چل کر مشہور ہوئے اور اوسط حاجی صاحب سے معروف ہوئے اور پسر اصغر مفتی صاحب کے لقب سے موسوم ومقبول ہوئے۔

شیخ یار محمد چونکہ پانچ لڑکوں سے نوازے گئے اس لئے خاندان والوں میں محسود بن گئے اور حسد کی بنیاد پر مختلف انداز کے آلام ومصائب سے دوچار ہوتے رہے، لیکن تحمل وصبر کے ساتھ سارے احوال کو نظر انداز کر کے اپنی اولاد کی تربیت میں لگے رہے۔

شجرۂ نسب

شیخ گلاب
شیخ شمس عالم
محمد حنیف
محمد صدیق
محمد دیانت
عبدالجلیل
یار محمد
ابو محمد
ولی محمد
شاہ محمد
شیر محمد
عبدالرحمٰن
اطیعوا اللہ
شفیع اللہ
نجیب اللہ
کلیم اللہ
حبیب اللہ
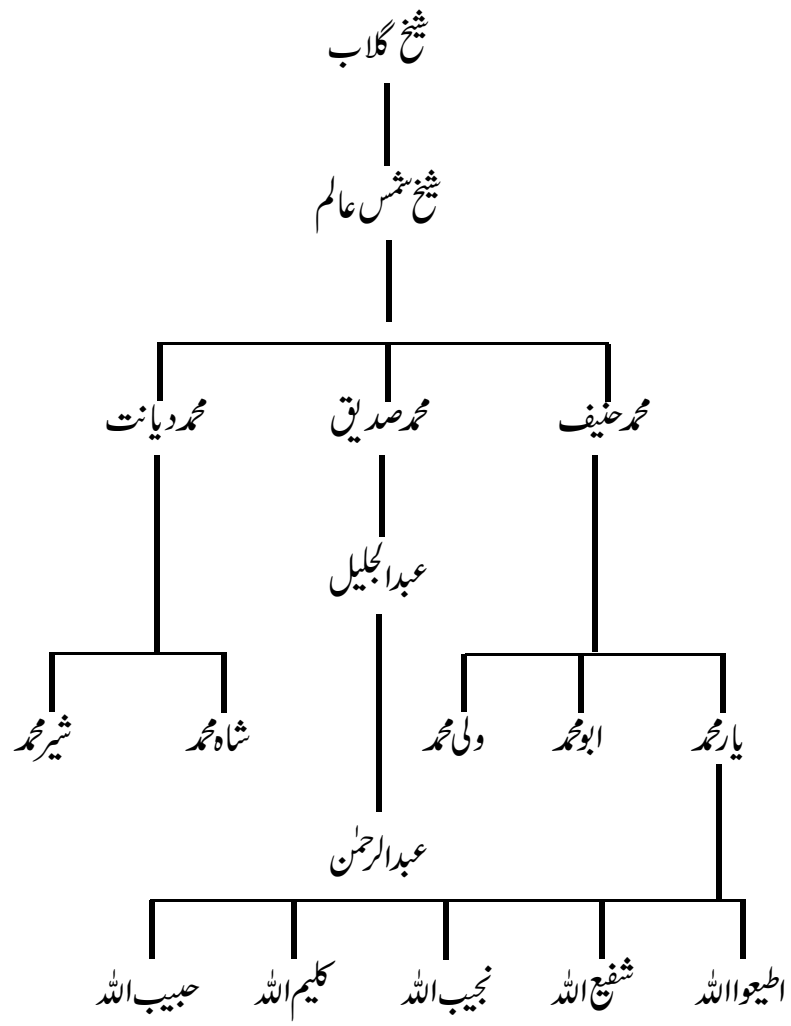
چونکہ اپنے والد بزرگوار شیخ محمد حنیف اور والدہ شریفن کا تعلق مع اللہ تقوی وطہارت، متانت ووقار، سنجیدگی وشائستگی، علم وعمل سے حظ وافر پایا تھا، اس لئے شروع سے ہی اہل اللہ سے محبت، علم وعلماء سے وابستگی قائم رہی، خود بھی عربی فارسی اردو کی تعلیم حاصل کی اورصوم وصلوۃ کے پابند رہے، حج کے بعد سے تاحیات تہجد کے بھی پابند تھے، محلّہ کی مسجد میں اکثر اذان، نماز کے فرائض انجام دیا کرتے تھے، طبعًا چونکہ جھوری الصوت تھے، اس لئے بغیر مائک کے آپ کے اذان کی آواز ایک کلومیٹر تک سنائی دیتی تھی۔ بہت سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے، معاش کے طور پر جوز مین تھی اس پر محنت کرکے اسی کی کمائی سے اپنے تمام بچوں کی پرورش کی اور شادی وبیاہ کے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ فجر کی نماز کے بعد اہتمام کے ساتھ پوری زندگی ترجمہ کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے، اشراق سے فارغ ہوکر ہی کھیت کا رُخ کرتے، لوگ دیر سے کھیت میں پہونچنے پر طعنہ بھی دیتے، لیکن ہمیشہ آپ کی کاشت کردہ زمین میں غلہ زیادہ اوراچھا ہوا کرتا تھا، یہ آپ کے اعمال کی برکت تھی۔

چونکہ والد بزرگوار کا علم دوستی کا مزاج تھا، اس لئے جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے ان کو علم وتعلیم کی راہ پر ڈالتے گئے اور یکے بعد دیگرے ہر ایک کو خواندہ بنانے کی پوری سعی کی۔

چنانچہ جب پسر اکبر اطیعوا اللہ اس عمر کو پہونچے کہ ان کو علم کی راہ پر ڈالا جاسکے تو بلاتکلف معیشت کا سارا بوجھ اپنے سر لیتے ہوئے پسر اکبر کو تعلیم کے لئے وقف کردیا۔ چنانچہ وہ علاقائی مدارس سے فیض یاب ہوتے ہوئے وایا الہ آباد مدرسہ مظاہر علوم

سہارنپور پہونچ گئے اور وہاں داخلہ لے کر باضابطہ تعلیمی سلسلہ سے مربوط ہو گئے۔

سال بھر کے بعد والد بزرگوار سے درخواست کر کے پسر اوسط نجیب اللہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور مظاہر علوم سہارنپور میں انکا بھی داخلہ کروایا، اس کے اگلے سال مزید شوق بڑھا اور مظاہر علوم کے ماحول سے متاثر ہو کر پسر اصغر حبیب اللہ (راقم السطور) کو ساتھ لے گئے۔

تذکرہ راقم حبیب اللہ

مظاہر علوم سہارنپور سے قبل خادم کھیل کود میں مصروف تھا تعلیمی سلسلہ کا آغاز مظاہر علوم ہی سے ہوا۔

جھٹکاہی سے وایا بیرگنیا ضلع سیتامڑھی سمستی پور جانا ہوا، وہاں سے ٹرین بدل کر سون پور جانا ہوا، وہاں سے ٹرین بدل کر لکھنؤ جانا ہوا، وہاں سے ٹرین بدل کر پنجاب میل کے ذریعہ سہارنپور پہونچے، تین دن تین رات میں یہ سفر جھٹکاہی سے سہارنپور کا پورا ہوا۔

مدرسہ خلیلیہ شاخ مظاہر علوم سہارنپور میں حاضری

راقم جب سہارنپور پہونچا تو وہاں کی ہر چیز راقم کے لئے نئی تھی، لیکن

برادران بالخصوص برادر اکبر کی موجودگی نے انجانے پن کو ختم کر دیا اور پوری اپنائیت کے ساتھ وہاں کا قیام شروع ہوا۔

پہلے سال میں مدرسہ خلیلیہ جو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی ایک شاخ ہے سہارنپور کے گھنٹہ گھر چوک کے قریب ایک نالہ کے اوپر تقریباً پندرہ کمروں پر مشتمل ایک راؤ صاحب کی بلڈنگ ہے جس کو ایک راؤ صاحب نے مدرسہ مظاہر علوم پر وقف کیا تھا، اور اس موقوفہ عمارت میں حفظ اور تجوید، فارسی وعربی کے ابتدائی درجات کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ برادران کا قیام بھی پہلے ہی سے اسی شاخ کی عمارت میں تھا، راقم جب وہاں پہونچا تو ان کے ساتھ پہلا سال شاخ ہی میں گزرا۔ اس وقت مدرسہ خلیلیہ شاخ کے ناظم مولانا جمیل الرحمٰن صاحب نام کے ایک بزرگ تھے اور عربی درجات کے لئے مولانا یامین صاحب اور مولانا اطہر حسین صاحب برادر خورد مفتی مظفر حسین صاحب روزانہ آتے تھے اور مولانا قطب الدین صاحب گیاوی مستقل شاخ ہی میں مقیم رہتے تھے اور درجہ فارسی کی تعلیم کے لئے مولانا فضل الرحمٰن صاحب مظاہر علوم سے روزانہ آیا کرتے تھے اور حفظ کی تعلیم کے لئے حافظ صدیق صاحب سہارنپوری کی روزانہ آمد ورفت ہوا کرتی تھی اور تجوید کی تعلیم کے لئے قاری رضوان نسیم صاحب بن قاری ابراہیم صاحب کا روزانہ آنا جانا ہوتا تھا، قاری رضوان نسیم صاحب کی جو درسگاہ تھی پہلے سال کا قیام انہی کی درسگاہ میں طے پایا، کمروں کی کمی کی وجہ سے درسگاہ کا کام انہی کمروں سے لیا جاتا تھا جن کمروں میں طلباء مقیم ہوا کرتے تھے۔

چونکہ اس سے پہلے اس خادم کی عمر بچپن سے مدرسہ خلیلیہ شاخ پہونچنے تک

کھیل کود ہی میں گزری تھی، اس لئے تعلیم کا باضابطہ آغاز یہیں سے ہوا۔ نورانی قاعدہ اورقرآن پاک ناظرہ کی تعلیم کے لئے برادر اکبر نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے سپرد مجھ کو کیا جو فارسی کے بہت پرانے استاذ تھے۔ راقم نے پورے سال میں ناظرہ قرآن کریم مکمل کرلیا جیسا کہ یاد آتا ہے کہ داخلہ کے لئے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے جب میری عمر پوچھی تو برادر اکبر نے سات سال کی عمر لکھوائی اس اعتبار سے میری تعلیم کا پہلا سال ۱۹۶۵ء بنتا ہے۔

تذکرہ تاریخ پیدائش

چونکہ میری پیدائش کا سال وہی ہے جس سال صوبہ بہار کے ضلع سیتامڑھی میں جانوروں کا بہت مشہور میلا لگتا تھا، جس میں کئی اضلاع کے لوگ مسلم و غیر مسلم جانوروں کی خرید وفروخت کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۵۹ء کے اپریل و مئی کے مہینہ میں چیت نومی میلا کے نام سے جب یہ میلا لگا، اور خرید وفروخت کا کاروبار جس دن شباب پر پہونچا، اسی دن ہندو مسلم فساد برپا ہوگیا، جس فساد میں مسلمانوں کا جانی مالی نقصان بہت ہوا اور اس فساد کی آگ کئی کیلو میٹر دور ہر چہار طرف پہونچی جس کی لپیٹ میں خادم کا گاؤں جھٹکاہی بھی آیا، لیکن جھٹکاہی کے بزرگوں کی جرأت و بیبا کی ودانشمندی سے سارے فسادی دریائے لال بکیا کی ریت سے اپنے منھ کی کھا کر بری طرح پسپاں ہوکر فرار ہونے پر مجبور ہوگئے، اس کے بعد جھٹکاہی کا امن وامان بہت

متاثر ہوا، روزانہ پولیس کی گردش اور آمدورفتاور دھڑ پکڑ نے پورے گاؤں میں دہشت کا ماحول پیدا کر دیا اور پورے گاؤں کے لوگ خوف و ہراس کے ماحول میں گھروں میں چھپنے یا گاؤں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہونے لگے خادم کی والدہ کے بقول انہی ایام میں خادم کی پیدائش ہوئی اس اعتبار سے خادم کی پیدائش کا مہینہ اپریل ۱۹۵۹ء یوم جمعہ ہے۔

تذکرہ آغاز تعلیم

مولانا فضل الرحمٰن صاحب جو فارسی کے بہت ماہر اور پرانے استاذ تھے، میری تعلیم کا آغاز انہی کے پاس سے ہوا، حالانکہ وہ فارسی کے استاذ تھے، لیکن برادر اکبر کی درخواست پر انہوں نے مجھ کو قاعدہ بغدادی و قرآن شریف ناظرہ پڑھایا، ایک سال میں شوال سے شعبان تک ناظرہ قرآن کریم میرا مکمل ہو گیا۔

تذکرہ چند واقعات

پورے سال قیام کے دوران چند اہم واقعات بھی پیش آئے، شاخ کے رہنے والے طلباء نے آپس میں باری لگا رکھی تھی، وہ باری باری اپنا کھانا مظاہر علوم کے مطبخ سے پیدل جا کر لایا کرتے تھے جس کی دوری شاخ سے دو کیلومیٹر سے کم نہیں تھی، یہ بہت بڑا مجاہدہ تھا جس کو طلباء تحصیل علم کے شوق میں بخوشی برداشت کرتے تھے،

شاخ کے ناظم مولانا جمیل الرحمٰن صاحب صرف اوقات تعلیم میں موجود رہتے تھے، باقی اوقات اپنے گھر رہا کرتے تھے، چونکہ ان کا مکان سہارنپور ہی میں تھا۔ اسی طرح مولانا یامین صاحب مولانا اطہر حسین صاحب، قاری نسیم احمد صاحب وقت تعلیم کے ختم ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جایا کرتے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا قیام مدرسہ مظاہر علوم کے دار قدیم میں تھا، وہ وہاں واپس ہوجاتے تھے۔ اسی طرح حافظ صدیق صاحب کی بھی واپسی ہوجایا کرتی تھی، ان کا قیام حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھا، مدرسہ خلیلیہ شاخ میں بحیثیت نگراں رات کا قیام مولانا قطب الدین صاحب گیاوی فرماتے تھے، لیکن پنج وقتہ نماز کے مسجد کے وہ امام بھی تھے، اس لئے اوقات نماز میں امامت کے لئے مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ مدرسہ کے احاطہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی جس کے امام برادر اکبر تھے، اپنی عبادت گزاری، سنجیدگی و متانت کی وجہ سے اساتذہ و طلباء ان سے بہت مانوس و قریب تھے اور بہت زیادہ احترام کرتے تھے، گویا کہ بحیثیت نائب ناظم و نائب نگراں ذمہ داروں کی عدم موجودگی میں شاخ میں ہوا کرتے تھے۔

۱- ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں عشاء کی اذان کے بعد بہت دھوم دھام سے مدرسہ کے گیٹ کے قریب روڈ سے ایک غیر مسلم کی بارات گزری جس کو دیکھنے کے لئے تمام طلباء روڈ پر نکل گئے، شاخ کے احاطہ میں برادر اکبر اور موذن اور دربان بچ گئے، اس صورت حال کو دیکھ کر برادر اکبر بہت رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہوئے اور دربان سے کہہ کر شاخ کا صدر گیٹ بند کروادیا اور تین آدمیوں نے عشاء کی نماز ادا کی، جب

گیٹ کے سامنے سے بارات گزر گئی اور طلباء واپس آئے تو ان کو مدرسہ کا گیٹ بند ملا جب طلباء نے دربان کو کھولنے کے لئے کہا تو دربان نے یہ کہہ کر کھولنے سے معذرت کر دیا کہ یہ گیٹ امام صاحب (برادر اکبر) نے بند کروایا ہے، ان کی اجازت کے بغیر میں نہیں کھول سکتا، لیکن طلباء نے اس کے جواب میں کوئی بدتمیزی نہیں کی اور نہ ہی کوئی نازیبا جملہ زبان سے نکالا بلکہ تمام طلباء سنجیدگی کے ساتھ گیٹ پر بیٹھ گئے تا آنکہ مولانا قطب الدین صاحب گیاوی اپنی مسجد سے عشاء کی نماز پڑھا کر واپس ہوئے، جب گیٹ پر پہونچے تو طلباء کا ہجوم دیکھا اور گیٹ کو بند پایا، تحقیق حال کے بعد مولانا نے طلباء کو بہت ڈانٹا اور مولانا ہی کے حکم پر دربان نے گیٹ کھولا، تمام طلباء مدرسہ کے احاطہ میں داخل ہوئے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد برادر اکبر نے تمام طلباء کی خبر لی، لیکن ان کی زجر و توبیخ پر کسی نے نہ سر اٹھایا اور نہ جواب دینے کی ہمت ہوئی، لیکن برادر اوسط نے ان کے احتساب پر بدتمیزی اور بدزبانی کا مظاہرہ کیا، لیکن برادر اکبر نے پورے صبر و تحمل کے ساتھ اس بدزبانی کو برداشت کیا۔ البتہ والد محترم کو پوری صورتحال سے باخبر کر دیا۔

۲- چونکہ خادم کا بچپن تھا اور ماں باپ سے علیحدگی کا پہلا سال تھا اور رات کو اکثر تنہا سونا پڑتا تھا، برادران میں سے کوئی بھی پاس میں موجود نہیں رہتا تھا، اس لئے ڈر اور خوف کی وجہ سے اکثر بستر پر پیشاب ہو جایا کرتا تھا جس کو روزانہ بغیر ڈانٹے بولے کسی خفگی کا اظہار کئے نل پر لے جا کر برادر اکبر تنہا دھوتے اور خشک کر کے شام کو بستر میرے سپرد کر دیتے تھے۔

(۳) اسی سال میری دادی محترمہ شریفن خاتون جن کے لاڈ و پیار اور شفقت کے آغوش سے پہلی بار دور ہوا تھا، ان کا بھی انتقال ہوگیا جس کی خبر والد محترم کے خط کے ذریعہ راقم کو ملی اور بیحد رنج ہوا اور جتنا ہوسکا مرحومہ کے لئے بچپن کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دعاء مغفرت کیا، لیکن قلبی طور پر دادی کی مفارقت کا احساس بہت دنوں تک رہا۔

تذکرہ مدرسہ مجیدیہ جھٹکاہی چمپارن

شعبان کی تعطیل عام کے موقعہ سے جب گھر آنا ہوا تو گھر آنے کے بعد بیماری کی وجہ سے اگلے سال تعلیمی سلسلہ کو باقی رکھنے کے لئے والدین کے مشورہ سے راقم کا سفر سہارنپور کا موقوف کردیا گیا اور یہ طے پایا کہ سال خراب نہ ہو اس لئے راقم صحت یابی کے بعد تعلیمی سلسلہ گاؤں میں موجود مدرسہ مجیدیہ میں جاری رکھے۔

مدرسہ مجیدیہ کی ۱۹۶۴ء میں گاؤں کے ایک بزرگ حاجی عبدالمجید صاحب نے گاؤں کے بچوں کی تعلیم کے مدنظر بنیاد رکھی اور مسلسل انہی کی کاوش سے مدرسہ بالتدریج آگے بڑھتا رہا، شعبۂ پرائمری اور حفظ کے ساتھ عربی، فارسی کی تعلیم ایک زمانہ میں شرح جامی تک پہونچ گئی اور اچھے اور لائق و فائق اساتذہ اس مدرسہ کو ملتے گئے، لیکن گاؤں کے بعض لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے مدرسہ کو ایسی نظر بد لگی کہ بالتدریج زوال پذیر ہونے لگا، مختلف ادوار و احوال سے گزر کر مدرسہ اب بھی زندہ وقائم ہے اور

گاؤں کے بچے اور بچیوں کی پرائمری اور حفظ کی تعلیم کی ذمہ داری کو پوری کر رہا ہے، لیکن تعلیمی عروج کی طرف گامزن نہیں ہو پا رہا ہے۔

بہرحال والدین اور بڑوں کے مشورہ سے راقم ایک سال گھر ہی پر رہا، ماں باپ کی محبت وشفقت سے اپنے صغرسنی کی وجہ سے لطف اندوز ہوتا رہا اور مدرسہ مجیدیہ میں ایک استاذ جو نیپال کے رہنے والے تھے جن کا نام توحید احمد تھا ان کے یہاں روزانہ پہونچ کر قرآن پاک کے حفظ کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ اس طرح جب سال مکمل ہوگیا اور دوبارہ شعبان کا مہینہ آیا تو رمضان کے بعد دوبارہ سہارنپور کا سفر تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے والدین کے مشورہ سے طے پایا۔

دوبارہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی حاضری

اس سال جب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور حاضری ہوئی تو مدرسہ خلیلیہ شاخ کے بجائے دارالطلباء قدیم کے کمرہ نمبر اٹھارہ (۱۸) میں قیام طے پایا، اس کمرہ میں بھی حسب سابق راقم کا قیام رہا اور برادر اکبر حسب معمول درسگاہ اور مسجد میں رات گزارتے رہے، حفظ کی تعلیم حافظ بشیر صاحب کے یہاں طے پائی جن کے یہاں صبح شام حاضر ہوکر سبق اور آموختہ سنایا کرتا تھا۔

دارالطلباء قدیم میں اس وقت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم، مولانا فضل الرحمٰن صاحب، مولانا یونس صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب،

مولانا وقار علی صاحب کا قیام تھا۔ مدرسہ کے احاطہ میں تین کونوں میں تین نل تھے جس سے طلبا اپنی ضرورت پوری کیا کرتے تھے، تحتانی منزل میں تقریباً پچیس (۲۵) کمرے تھے جس میں طلباء واساتذہ مقیم تھے، فوقانی منزل پر صرف درسگاہیں تھیں جس میں تعلیم ہوا کرتی تھی، شوال سے شعبان تک دارالطلباء قدیم ہی میں قیام رہا۔ پانچوں وقت کی نماز مسجد کلثوم نامی مسجد میں تمام طلباء واساتذہ اداء کیا کرتے تھے، جو مسجد کے احاطہ کے غربی وشمالی حصہ میں تھی، جس کے امام قاری احمد گورا صاحب تھے جو حضرت ناظم صاحب کے خادم خاص تھے، پورے سال راقم نے دیکھا کہ امام کے پیچھے صف اول میں پانچوں نمازوں میں ہر موسم میں ناظم صاحب موجود رہا کرتے تھے، جہاں یہ پابندی دیکھی وہیں یہ بھی دیکھا کہ بعض اساتذہ اپنے اعذار کی وجہ سے اکثر نمازوں میں مسبوق رہا کرتے تھے، لیکن ان کے دائیں بائیں جو طلباء مسبوق ہوتے تھے، سلام پھیرنے کے بعد ان کی ران پر وہ (مکا) مارتے ہوئے یہ کہتے نالائق، نالائق نماز چھوڑتا ہے، نماز چھوڑتا ہے۔ لیکن استاذ محترم کے اس عمل سے کسی بھی طالب علم کی پیشانی پر نہ کبھی شکن آئی اور نہ کبھی کسی طالب علم کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ خود تو مسبوق رہتے ہیں اور ہماری کبھی نماز چھوٹ گئی تو ہمیں مارتے اور ڈانٹتے ہیں۔ قاری احمد گورا صاحب حضرت ناظم صاحب کے پسندیدہ امام تھے، ان کی عدم موجودگی میں کسی کے لئے امامت کرنا، حضرت ناظم صاحب کی موجودگی میں بہت مشکل کام تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے قاری گورا صاحب کی عدم موجودگی میں عشاء کی نماز پڑھائی، کسی غلطی کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب نے نماز کے اعادہ کا حکم

دیا، دوبارہ جس نے نماز پڑھائی اس کی قرأت میں بھی غلطی نکل آئی تو تیسری مرتبہ اعادۂ نماز کا حکم دیا، تیسری مرتبہ جس نے نماز پڑھائی حضرت ناظم صاحب نے چوتھی مرتبہ اعادہ کا حکم دیا، چوتھی مرتبہ جس نے نماز پڑھائی اس سے بھی قرأت کی کوئی غلطی ہوگئی، حضرت ناظم صاحب نے پانچویں مرتبہ اعادہ کا حکم دیا، پانچویں مرتبہ جا کر نماز مکمل ہوئی، جب طلباء عشاء کی نماز پڑھ کر نکلے تو سب مسکراتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے نکلے کہ آج ہم لوگ تراویح کی نماز پڑھ کر جارہے ہیں، چونکہ پانچ مرتبہ اعادہ کے بعد عشاء کی کل رکعتیں بیس ہوگئیں۔

تذکرہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب جو مدرسہ مظاہر علوم کے ناظم بھی تھے، اللہ نے علم وفن سے نوازا تھا، لغات پر خصوصیت کے ساتھ آپ کی بہت گہری نظر تھی، علم اللغات کے آپ امام مانے جاتے تھے، اس لئے طلباء تو طلباء اساتذہ بھی حضرت ناظم صاحب سے ملاقات کرتے اور بات کرنے میں گھبراتے تھے، جس سال راقم دار الطلباء قدیم میں تھا، اس سال حضرت ناظم صاحب مسجد کلثوم میں کرسی پر بیٹھ کر طحاوی شریف کا درس دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم آیا اس سے حضرت ناظم صاحب نے پوچھا بیٹا کیا پڑھتے ہو؟ اس طالب علم نے جواب میں کہا حضرت شَرَح جامی پڑھتا ہوں، حضرت

نے فوراً سر پکڑا اور فرمانے لگے، بیٹا تم نے تو سر میں درد پیدا کر دیا، شَرَ ح جامی نہیں بلکہ شَرْ حِ جامی، شَرْ حِ تہذیب، شَرْ حِ عقائد ایسے بولا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم پہونچا اس سے حضرت نے نام پوچھا کہ بیٹا تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا محمد ارشد۔ حضرت نے برجستہ فرمایا ہمہ انبیاء راشد اند ومحمد ارشد، اس کے بعد فرمایا کہ بیٹا اس کا مطلب بتلاؤ وہ طالب علم بہت پریشان ہوا، اخیر میں حضرت ناظم صاحب نے خود ہی اس کی تشریح کی، فرمایا کہ تمام انبیاء راشد ہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ارشد ہیں اور چونکہ اسم تفضیل کے معنی میں اسم فاعل کے مقابلہ میں مبالغہ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے جس رشد و ہدایت کے مالک تمام انبیاء تھے ان کے مقابلہ میں یہ صفت آقا میں زیادہ پائی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے دوران گفتگو خزانہ خاء کے فتحہ کے ساتھ کہہ دیا، حضرت ناظم صاحب نے فوراً پکڑ کرتے ہوئے فرمایا کہ بیٹا **الخزانة لاتفتح والقصة لاتکسر**، پھر اس کی تشریح کرتے ہوے فرمایا کہ خزانہ پر فتحہ نہیں دیا جاتا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ خزانہ کو ہر ایک کے سامنے کھولا نہیں جاتا۔ اسی طرح قصعہ پر کسرہ نہیں دیا جاتا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پیالہ کو توڑا نہیں جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا یونس صاحب تشریف لائے اور کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا شیخ عبدالغنی المُقَدِّسِیُ نے یہ لکھا ہے حضرت ناظم صاحب نے فوراً سر پکڑ لیا اور فرمایا کہ بیٹا کیا کہہ دیا، عبدالغنی المقدسی، عبدالغنی المَقْدِسِیُ اور اس کو کئی بار دہرایا۔ اسی لیے حضرت مولانا یونس صاحب حضرت ناظم صاحب کے علم کے

بہت معترف تھے اور الفاظ کی تصحیح اکثر ان سے کروایا کرتے تھے اور عصر کے بعد ان کی مجلس میں اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔

اور خود حضرت ناظم صاحب کا معمول یہ تھا کہ جب تک صحت وقوت تھی اور پاؤں سے چلنے پر قادر تھے دار الطلباء قدیم سے پیدل چل کر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مجلس میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ کتب خانہ یحیوی کے سامنے ایک لکڑی کی ٹال تھی جہاں عصر کے بعد مجلس ہوتی تھی، دو چار پائی بچھائی جاتی، ایک پر حضرت شیخ اور دوسری چار پائی پر حضرت ناظم صاحب جا کر تشریف فرما ہوتے تھے اور باقی حاضرین نیچے بچھی ہوئی دری پر بیٹھا کرتے تھے، مغرب سے پہلے حضرت ناظم صاحب واپس ہو جاتے اور مغرب کی نماز مسجد کلثوم میں ادا فرماتے۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ نے حضرت ناظم صاحب کے بارے میں حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ان کی قدر کرلو، انہوں نے بہت سے فتنوں کو دبا رکھا ہے، جب یہ نہیں ہوں گے تب ان کی قدر معلوم ہوگی، اور اس وقت ایسے فتنے جنم لیں گے کہ ان کی سرکوبی مشکل ہو جائے گی۔

حضرت ناظم صاحب ناظم صاحب کے لقب سے تمام طلباء اساتذہ میں مشہور تھے، لیکن نظامت سے زیادہ آپ کی محبت وشفقت علم وفن، نسبت وروحانیت کا زیادہ اثر تھا، طلباء کی تعلیم وتربیت پر پوری نظر رکھتے تھے اور بلا تکلف بلا کر اصلاح فرماتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم کو بلایا اور فرمایا کہ بیٹا عصر کے بعد جب گھومنے کے

لئے جایا کروتو جیب سے تسبیح نکال کر ہاتھ میں لے لیا کرو اور چلتے پھرتے تسبیح پڑھتے رہا کرو، تمہارا نفس اس سے تم کو روکے گا اور کہے گا کہ یہ تو ریا کاری اور مکاری ہے اور دکھلاوا ہے، لیکن تم ایسا ہی کرتے رہنا، اس لئے کہ اس سے تمہاری عادت بنے گی اور عادت کو عبادت بنانا بہت آسان ہے۔ اس طرح کی اہم تربیتی باتیں اکثر کیا کرتے تھے اور طلباء ان سے کافی مانوس بھی تھے، دار الطلباء کے کمرہ (ا) میں قیام تھا، اخیر عمر میں جب بہت کمزور ہوگئے، چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے، تب بھی نمازوں کا اہتمام اس قدر تھا کہ قاری احمد گورا حضرت کے خادم خاص حضرت کو وضوء کراتے اور اذان کے بعد پانچوں نمازوں میں مسجد کے صف اول میں امام کے پیچھے لے جا کر بیٹھا دیتے۔ اس طرح عذر کے باوجود تکبیر اولیٰ کے ساتھ صف اول میں امام کے پیچھے نماز کا اہتمام فرماتے رہے، نماز سے فارغ ہوکر قاری احمد گورا گود میں بچوں کی طرح اٹھا کر چارپائی پر لاکر لٹا دیتے۔

اخیر عمر میں وصال سے قبل حضرت مفتی مظفر حسین صاحب اور حضرت مولانا یونس صاحب کو بلا کر اجازت سے سرفراز فرمایا، اگرچہ اس سے پہلے کے بھی آپ کے بہت سے مجازین تھے جن میں حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی بھی ہیں، بعض طلباء کو ان کی صلاحیت کی بنیاد پر دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد بھی اجازت سے نوازا، جن میں برادر اکبر بھی شامل ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ دنیا کو الوداع کہہ کر دار باقی کی طرف کوچ کر گئے، جس وقت انتقال ہوا راقم دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث شریف میں تھا،

دارالعلوم کے مائک سے آپ کے انتقال کی خبر کا اعلان ہوا، بہت سے طلباء بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں طلباء دارالعلوم دیوبند سے جنازہ میں شرکت کے لئے آئے جن میں راقم بھی شریک تھا، راقم نے بھی جنازہ اور تدفین میں شرکت کی، تدفین شاہ ولایت قبرستان میں عمل میں آئی۔

تذکرہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب

جس سال دار الطلباء قدیم کمرہ (۱۸) میں قیام تھا، اس سال حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مسجد کلثوم میں بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، راقم بھی کئی بار درس بخاری میں شریک ہوا اور حضرت شیخ کی تقریر سماعت کی، اس سال دورۂ حدیث کے طلباء میں جو طلباء تھے اس وقت مولانا عبدالحفیظ مکی کا نام یاد ہے، حضرت شیخ ویل چیئر پر مسجد کلثوم تشریف لاتے اور درس کے بعد اپنے مکان کچے گھر میں واپس ہو جایا کرتے تھے، مستقل قیام کچے گھر میں ہوا کرتا تھا، آنے جانے والے مہمانوں کی آمد ورفت بھی وہیں ہوا کرتی تھی، حضرت شیخ کے یہاں مختلف انواع کے مہمانوں کی آمد ورفت تھی، کچھ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین بھی ہوا کرتے تھے، کچھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین بھی ہوتے تھے، کچھ علماء اساتذہ، طلباء وتجار بھی ہوتے تھے، ہر ایک کی خاطر اس کی حیثیت کے مطابق ہوا کرتی تھی، عصر کے بعد روزانہ ٹال میں مجلس ہوا کرتی تھی، جس میں

اساتذہ وطلباء شرکت کیا کرتے تھے، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب بھی پابندی سے اس مجلس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اپنی مجلسوں میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ کی قدر کرلو، انہوں نے بہت سارے فتنوں کو دبا رکھا ہے، وہ نہیں ہوں گے تو بڑے بڑے فتنے جنم لیں گے اور لوگوں کے لئے ان کو دبانا مشکل ہوجائے گا۔

باوجودیکہ حضرت شیخ اس وقت معذور ہوچکے تھے پھر بھی پانچوں نمازیں اہتمام کے ساتھ دفتر کی مسجد میں امام کے بائیں طرف ویل چیئر پر ادا کرتے تھے، خدام پانچوں وقت میں نماز سے پہلے وضوء سے فارغ کراکر مسجد لے جانے کا اہتمام کرتے تھے۔

ہر جمعہ کو عصر سے مغرب تک دفتر کی مسجد میں قیام فرماتے تھے اور ذکر جہری کی مجلس ہوا کرتی تھی، جس میں طلباء اساتذہ ومہمان حسب استعداد شرکت کرتے تھے۔ راقم نے بھی سیکڑوں بار اس مجلس میں شرکت کی اور دیکھا دیکھی از خود ذکر جہری شروع کردیا جس کے نتیجہ میں اسی وقت قلب سے ذکر کی حلاوت محسوس کرلی اور اس کی لذت دل میں اتر گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری زندگی ذکر سے اور ذکر کی مجلس سے ایک مضبوط دلچسپی ہوگئی جو بعد میں چل کر معمولات کا ایک اہم حصہ بن گیا اور اس درجہ اس سے شغف ہوگیا کہ ذکر شروع کرنے کے بعد اسے روکنے کو دل گوارہ نہیں کرتا۔

حضرت شیخ نے اپنے بہت سارے اکابرین کی صحبت پائی تھی، اس لئے ان اکابرین سے بے پناہ آپ کو تعلق تھا جس کی جھلک مجلس میں نظر آئی تھی، گزرے ہوئے بزرگوں میں سے کسی کا جب تذکرہ آتا اکثر حضرت شیخ پر گریہ طاری ہوجایا کرتا تھا، اس

وقت تک رمضان کا اعتکاف دار جدید کی مسجد میں شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مہمانوں کی زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوا کرتی تھی، اس وقت سے لے کر جب تک حضرت شیخ باحیات رہے کثرت سے حضرت کے یہاں حاضری ہوتی رہی اور اکتساب فیض کا موقعہ ملتا رہا جس کا تذکرہ انشاءاللہ آئندہ بھی آئے گا۔

تذکرہ علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری

اس وقت کے موجود اکابر اساتذہ میں علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری بھی تھے جو نحو کے امام اور نامور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، لیکن سادگی کا یہ حال تھا کہ بغیر بٹن لگا ہوا اور بغیر بنیائن کے بدن پر ایک کھدر کا کرتا ہوتا تھا اور نیلے رنگ کی ایک کھدر کی لنگی میں ہمیشہ دکھائی دیتے تھے، احاطہ مطبخ کے کمرہ (۴) میں ان کا قیام تھا جس میں ایک بوسیدہ کھاٹ بغیر چادر اور بستر کے پڑی رہتی تھی اور ایک بوسیدہ چٹائی فرش پر بچھی ہوئی ہوتی تھی، احاطہ مطبخ میں کمرہ ہونے کی وجہ سے دھویں کی وجہ سے پورا کمرہ کالا پڑا ہوا تھا، اسی کمرہ میں اپنے زمانہ کا علامہ، نحو کا امام بے تاج بادشاہ آرام کش ہوا کرتا تھا اور اسی کمرہ میں ملاقات کے لئے اکابرین و اساطین وقت بھی جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ضرورت سے سہارنپور تشریف لائے تو حضرت علامہ کی ملاقات کے لئے ان کے کمرہ میں تشریف

لے گئے، حضرت علامہ چارپائی پر بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے، حضرت قاری صاحب کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور سلام ومصافحہ اور ملاقات کے بعد بلاتکلف اسی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ گئے، حضرت علامہ نے مٹی کا پیالہ اٹھایا جو آپ کے کمرہ میں موجود تھا اور عتیق نامی باورچی کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے ہاتھ میں چار آنہ پیسہ رکھا اور یہ فرمایا: عتیق قاری طیب صاحب آئے ہیں یہ لو چار آنہ اور ایک روٹی اور دال دے دو۔ چنانچہ عتیق نے چار آنہ پیسہ رکھ کر ایک روٹی اور دال دے دیا اور یہ خریدی ہوئی روٹی اور دال لاکر حضرت علامہ نے اپنے دست مبارک سے حضرت قاری طیب صاحب کو پیش کیا، حضرت نے بہت شوق سے دال روٹی تناول فرمایا اور بہت محبت وادب کے ساتھ تھوڑی دیر کے بعد واپس تشریف لے گئے۔

یہ تھے ہمارے اکابر اساطین امت عمائدین ملت، گنجینۂ علم وفن، لیکن سادگی اور محبت ایسی کہ ہزار سلطنتیں ان پر قربان ہوں، اللہ ان کی قبروں کو منور فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین۔

حضرت علامہ کی شرح جامی، میبذی، سلم کا درس خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ مقبول تھا حتی کہ دار العلوم دیوبند چھوڑ کر بہت سے طلباء شرح جامی پڑھنے کے لئے مظاہر علوم آیا کرتے تھے اور دورہ کے لئے دار العلوم چلے جایا کرتے تھے۔

شرح جامی نحو کی درس نظامی کی آخری اور سب سے اہم کتاب ہے اور نحو کا قیمتی ذخیرہ اس میں موجود ہے، لیکن تشتت ضمائر کی وجہ سے اکثر لوگوں کی دسترس سے یہ کتاب بالاتر ہے۔ حضرت علامہ کے درس کا انداز فنی تھا وہ فن پر گفتگو کیا کرتے تھے،

ہرفن کے اصول سمجھاتے تھے،شرح جامی کے بھی پڑھانے کا انداز یہی تھا کہ صاحب کتاب کی باتوں کو فنی اعتبار سے طلباء کے ذہن نشین کرانے کے بعد مراجع کی تعیین کے ساتھ عبارت سے اس طرح انطباق کرادیتے تھے کہ مضمون کے ساتھ کتاب حلوہ بن جایا کرتی تھی اور پورا درس ظرافت کے ساتھ دیا کرتے تھے،طلباء اگر کسی مرجع کی تعیین کے بارے میں سوال کرتے تو پوری ظرافت کے ساتھ سورے کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے، لفظ ''سورے'' حضرت کا تکیہ کلام تھا جس کو اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ راقم نے بھی کئی بار شرح جامی کے درس میں شرکت کی۔ اسی طرح سلم ومیبذی کا درس بھی بہت مقبول تھا اوران دونوں فنون کو بھی فنی اعتبار سے پڑھایا کرتا تھے۔

تذکرہ حضرت مولانا ظریف احمد صاحب

علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری کے بغل کی درسگاہ مولانا ظریف احمد صاحب کی تھی جو اسم بامسمی تھے، اکثر ان کے یہاں قطبی رہا کرتی تھی جس کو پڑھانے کا انداز نرالا تھا، ان کا تکیہ کلام تھا'' گدھا گدھی پر گدھی گدھے پر''، انہی دو جملوں سے قطبی کے مسائل منطقیہ کو سمجھایا کرتے تھے۔

مولانا ظریف صاحب حضرت تھانوی کی تعلیمات وکتابوں کے عاشق تھے، ان کی جملہ کتابوں کا مطالعہ ان کا بالاستیعاب تھا، اکثر کتابوں پر انہوں نے اپنے قلم

سے حاشیہ بھی لکھ رکھا تھا، کتابوں کی بوسیدگی کو بغرض حفاظت اپنے ہاتھ سے کاغذ لگا کر سی کر دور کیا کرتے تھے اور بہت اہتمام والتزام کے ساتھ کمرہ کمرہ گھوم کر طلباء میں حضرت تھانوی کی کتابیں تقسیم کیا کرتے تھے اور مطالعہ کی نصیحت کرتے تھے اور ہفتہ وعشرہ کے بعد پھران کتابوں کو واپس لے کر دوسری کتاب مطالعہ کے لئے دے دیا کرتے تھے سادگی بہت زیادہ تھی، لیکن حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی تعلیمات کے زبردست حامی اور مبلغ تھے، جب دارالطلباء قدیم میں وہ آتے تو طلباء گرد وپیش جمع ہوجایا کرتے تھے اور مولانا بلاتکلف ایک ایک گھنٹہ کھڑے ہوکر طلباء کو نصیحت کرتے اور حضرت تھانوی کے ملفوظات وارشادات سناتے۔

جمعہ کی نماز اہتمام کے ساتھ مسجد کلثوم میں ادا کرتے جہاں طلباء واساتذہ کی اکثریت ہوتی تھی، تھوڑے بہت عام لوگ بھی ہوتے تھے، نماز جمعہ کی امامت وخطابت پابندی کے ساتھ مفتی مظفرحسین صاحب کیا کرتے تھے، لیکن اکثر جمعہ سے قبل کچھ وعظ ونصیحت بھی کھڑے ہوکر حضرت مولانا ظریف احمد صاحب کرتے تھے، شیروانی اکثر پہنا کرتے تھے اور شیروانی کی جیب میں اکثر کچھ کتابیں حضرت تھانوی کی ہوا کرتی تھیں، کبھی کتاب بھی کھول کر کوئی مضمون سنایا کرتے تھے، انگریزی لباس اور انگریزی وضع قطع کے بہت شدید مخالف تھے، اگر جمعہ کی نماز سے پہلے کوئی پینٹ، شرٹ والا نظر آجاتا تو اس کی شامت آجایا کرتی تھی، تقریر کے درمیان موضوع کوئی بھی ہو فوراً پینٹ شرٹ کے خلاف گفتگو کا رُخ ہوجاتا تھا، کبھی کبھی غصہ میں آکر یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ اے بچو! جمعہ کی نماز جب پڑھنے آیا کرو تو ایک بلیڈ لے کر آیا کرو اور

جب یہ پینٹ والے سجدہ میں جایا کریں تو سلائی کی جگہ بلیڈ چلا دیا کرو، لیکن مولانا کے ان جملوں سے کبھی بھی کسی پینٹ والے کو ناگواری نہیں ہوتی تھی، بلکہ چہرہ پر ندامت ہی کے آثار نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ طلباء کے درمیان گفتگو کرتے ہوئے فرمایا جس میں راقم بھی موجود تھا کہ اپنی تنخواہ اور کمائی کی مقدار اور اس کے ذرائع بیوی کو بھی مت بتانا، اگر اس کی سوچ سے کم مقدار ہوئی تو اس کے ذہن میں تمہاری حیثیت کم ہو جائے گی اور اگر اس کی سوچ سے تمہاری کمائی زیادہ نکلی تو اس کی فرمائش بڑھ جائے گی، اس کے بعد فرمایا کہ آج تک میں نے بھی کبھی مدرسہ سے جو تنخواہ ملتی ہے نہیں بتایا۔

ایک مرتبہ مجھ کو تنخواہ ملی شیروانی میں رکھ کر گھر پہونچا گرمی کا موسم تھا، شیروانی اتار کر کھونٹی میں ٹانگ دیا اور میں غسل کے لئے چلا گیا جب غسل میں نے شروع کر دیا تو بیچ میں یاد آیا کہ تنخواہ کے پیسے تو جیب ہی میں پڑے رہ گئے، میں بھول کر نہانے چلا آیا، فوراً خیال آیا کہ آج تمہاری خیر نہیں بیوی نے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔ اور ایک لمبی فہرست جیب میں پہونچ چکی ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا جب میں غسل کر کے واپس پہونچا اور شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیسوں کے ساتھ ایک لمبی فہرست بھی ملی، اس کے بعد غسل خانہ میں جو بات از راہ تصور آئی تھی وہ تصدیق میں تبدیل ہوگئی۔

داہنے ہاتھ میں ایک چھڑی بائیں ہاتھ میں کپڑے کا ایک جھولا اور اس میں حضرت تھانوی کی چند کتابیں، بدن پر شیروانی، چلتے پھرتے ہر ایک سے بات کرتے ہوئے نظر آتے تھے، اللہ پاک غریق رحمت فرمائے، قبر کو منور فرمائے۔ آمین

تذکرہ مولانا وقارعلی صاحب

حضرت مولانا وقارعلی صاحب بجنور کے رہنے والے تھے اور دار الطلباء قدیم میں گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد داہنے طرف حضرت ناظم صاحب کا کمرہ تھا اور بائیں طرف والے کمرہ میں مولانا وقارعلی صاحب قیام پذیر تھے، لیکن درسگاہ ان کی مولانا ظریف صاحب کے بغل میں اور مسجد کلثوم کے شرقی جانب بالائی منزل پر تھی۔

مولانا دار الطلباء قدیم کے نگراں بھی تھے اور بحیثیت نگراں طلباء پر بہت گہری اور اچھی نظر رکھتے تھے، مولانا مطالعہ بہت کرتے تھے، وقت کا ضیاع گویا کہ ان کے یہاں حرام تھا، سراجی میں بہت ماہر تھے، خاص طور پر مناسخہ میں، اس لئے سراجی کا درس بھی انہی کے ذمہ تھا اور دار الافتاء میں آنے والے میراث ومناسخہ کا جواب بھی وہی لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہدایہ آخرین بھی ان کے ذمہ تھی جسے بہت محنت اور مطالعہ سے پڑھاتے تھے۔ فتح القدیر کے ایک ایک سطر کا مطالعہ کیا کرتے تھے، اس کے باوجود درس دیتے وقت ہدایہ کے ساتھ فتح القدیر بھی کھول کر رکھتے تھے یا تو سوء حافظہ کی وجہ سے یا اس وجہ سے تاکہ شرح اور تشریح، شراح کی ذکر کردہ عبارتوں پر بلفظہ منطبق رہے کوئی جملہ یا لفظ اپنی طرف سے نہ کہا جائے۔ دوران درس آواز بھی کافی زوردار آیا کرتی تھی، جس کی گونج مسجد کلثوم کے صحن اور دار الطلباء کے احاطہ میں نیچے تک سنائی دیتی تھی، چونکہ دار الاقامہ کے نگراں بھی تھے، اس لئے مسبوق طلباء کی پٹائی بھی کیا کرتے تھے، اگرچہ خود بھی مسبوق ہوتے لیکن اس کی وجہ سے مسبوق طلباء

کونظر انداز نہیں کرتے تھے اور نہ ہی طلباء اس کو برا مانتے تھے بلکہ وہ اپنی اصلاح اور تربیت کے لئے اس کو ضروری سمجھتے تھے حالانکہ ان میں ہر درجہ کے طلباء ہوتے تھے۔

مولانا نے اپنے کمرہ میں چار فٹ لمبا اور کافی موٹا لکڑی کا ایک گول ڈنڈا رکھ رکھا تھا جس کو کسی غلطی پر ہاتھ پر ایک ڈنڈا لگا دیتے، وہ کئی روز تک اس ضرب کو محسوس کرتا تھا، اپنے کمرہ کے سامنے برآمدہ میں گزرنے والے طلباء پر نظر رکھتے تھے اور جس طالب علم کو بلا لیتے ان میں سے اکثر ڈنڈا کھا کر ہی واپس ہوتے تھے، اس لئے ان کے کمرہ کے سامنے برآمدہ سے گزرتے ہوئے طلباء کتراتے تھے اور اپنے کو بچاتے تھے، مولانا کا تکیہ کلام ''نالائق'' تھا جس کو کثرت سے استعمال کرتے تھے اور چلنے کا انداز مجاہدانہ و بہادرانہ تھا، اور نگراں ہونے کی وجہ سے چلتے پھرتے ہر طرف نگاہ رکھنے اور دیکھنے کے عادی تھے۔

مدرسہ مظاہر علوم کے اختلاف میں حضرت مفتی مظفر حسین صاحب کے گروپ میں شامل تھے اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کئی سال ادارہ کی خدمت کرتے رہے۔

تذکرہ مولانا عبدالمجید صاحب

دارالطلباء قدیم میں جو اکابر اس وقت قیام پذیر تھے ان میں ایک نام مولانا عبدالمجید صاحب کا بھی ہے جو غالباً کمرہ (۲۰) میں قیام پذیر تھے اور شعبہ تعلیمات

کے کام کو بہت خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے اس کے ساتھ اکثر مطبخ کی نگرانی کرتے ہوئے بھی مطبخ میں نظر آتے تھے۔

مولانا کا دفتر مدرسہ مظاہر علوم کی اس بلڈنگ میں تھا جس بلڈنگ میں دفتر محاسبی، مہمان خانہ، دفتر نائب ناظم اور بالائی منزل پر کتب خانہ تھا، مولانا کی نشست اس جگہ تھی جہاں آپ کے دائیں طرف مولانا عبدالمالک صاحب بیٹھا کرتے تھے جو دفتر محاسبی کے ذمہ دار تھے۔

مولانا بہت ذہین تھے اور وہ ذہانت آخری عمر تک بھی کام کر رہی تھی، امتحان کے نتائج کا رجسٹر آپ ہی کے پاس ہوتا تھا، ہر طالب علم کے نمبرات نام کے ساتھ ان کے ذہن میں محفوظ رہتے تھے، اس وقت قانون یہ تھا کہ جو طلباء فیل ہوتے تھے ان کا کھانا بند ہو جایا کرتا تھا، اس لئے طلباء کو نمبرات کے جاننے کی جستجو رہتی تھی، راقم نے خود دیکھا کہ جب کوئی طالب علم مولانا کے پاس نمبرات دریافت کرنے کے لئے آتا تو مولانا سب سے پہلے بہت محبت سے اس کا نام پوچھتے اس کے نام بتاتے ہی مولانا کے ذہن میں اس کے نمبرات آجاتے بغیر نتائج امتحان رجسٹر کے کھولے ہوئے وہ طالب علم پاس ہے یا فیل مستحضر ہو جاتا، اگر وہ طالب علم پاس ہوتا تو اس کو ڈانٹ کر بھگا دیتے کہ جب چاہے نمبر پوچھنے چلے آتے ہو کام نہیں کرنے دیتے، پریشان کر کے رکھ دیا ہے، بھاگ جاؤ یہاں سے، اور اتنا زور سے ڈانٹتے کہ پورا دفتر ان کی آواز سے گونج اٹھتا اور وہ طالب علم بھاگنے پر مجبور ہو جاتا اور آپ کا ڈانٹنا یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ وہ طالب علم پاس ہے فیل نہیں۔

لیکن اگر کوئی طالب علم فیل ہوتا اور نمبرات معلوم کرنے کے لئے آجاتا تو اس سے حسب معمول نام پوچھتے اور حسب معمول نام کے ساتھ اس کے نمبرات آپ کے ذہن میں آجاتے، اس کے بعد رجسٹر نتائج کھولتے، اور ایک کاغذ لیتے اور اس پر ساری کتابوں کا الگ الگ نمبر لکھتے اور اس سے بہت محبت اور شفقت سے بات کرتے اور نمبرات لکھنے کے بعد اس کے نیچے یہ لکھ دیتے کہ آج شام سے اس کا کھانا بند کردیا جائے اور دے کر فرماتے کہ یہ پرچہ لے کر مطبخ چلے جاؤ اور جا کر ناظم مطبخ مولانا نذیر صاحب کو دیدو۔

لیکن ممکن تھا کہ وہ کاغذ بچہ پھاڑ کر کے پھینک دے اس لئے اپنے یہاں بھی ایک کاغذ پر اس کا نام نوٹ کر لیتے اور اس پر دوپہر تک جتنے بچے آتے ان سب کا نام نوٹ کرتے جاتے اور چھٹی کے بعد سیدھے مطبخ پہونچتے اور اس فہرست کو مطبخ کے اعلان گاہ پر چسپاں کردیتے جس پر طلبا کے نام کے ساتھ نیچے یہ لکھا ہوتا کہ ان طلباء کا کھانا آج شام سے بند کیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا طالب علم جو امتحان میں فیل ہوتا اور نتیجہ معلوم کرنے کے لئے دفتر تعلیمات مولانا کے پاس نہ پہونچتا تو اس کو کسی طالب علم کو بھیج کر بلواتے اور بندش طعام کا رقعہ دے کر بہت محبت اور شفقت کے ساتھ مطبخ کے لئے روانہ کردیتے اور چھٹی کے بعد اس کے نام کا اعلان خود جا کر آویزاں کردیتے۔

مولانا کے اندر ایک خوبی یہ تھی کہ مولانا دفتر آتے جاتے راستہ میں گرے پڑے کاغذ کے اوراق کو جھک کر اٹھاتے اور بائیں ہاتھ میں موجود تھیلے میں ڈالتے

جاتے اور اس تھیلہ کو لاکر اپنے کمرہ میں رکھ دیتے اور صبح شام اور ظہر بعد کی چائے انگیٹھی میں انہی کاغذات کو جلا کر بنایا کرتے تھے اور چائے پی کر دفتر تشریف لے جاتے تھے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے حامل تھے، لیکن ایک وقت آیا کہ ان تمام خوبیوں کے ساتھ دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب

مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی ان اکابر اساتذہ میں سے تھے جن کا قیام دار الطلباء قدیم کے صرف ایک نشست والے ایک چھوٹے سے کمرہ میں تھا جو حضرت ناظم صاحب کے بغل میں تھا حضرت ناظم صاحب کا قیام کمرہ (۱) میں تھا اور مولانا کا قیام کمرہ (۲) میں تھا اور قاری احمد گورا صاحب کا قیام کمرہ (۳) میں تھا جو زینہ کے نیچے چھوٹا سا کمرہ تھا مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا قد میانہ تھا نگاہ کمزور تھی سادہ مزاج تھے لیکن فارسی اور پرانے رسم الخط کے ماہر استاذ مانے جاتے تھے چونکہ درجہ فارسی کی تعلیم مدرسہ خلیلیہ شاخ میں ہوتی تھی، اس لئے مدرسہ مظاہر علوم سے روزانہ تقریباً دو کیلو میر کا پیدل سفر کر کے شاخ جایا کرتے تھے، وہاں آپ کی درسگاہ گیٹ کے سامنے غربی حصہ میں تھی آپ کی درسگاہ کے دکھن طرف حافظ صدیق صاحب کی درسگاہ تھی جو حفظ کے استاذ تھے اور اتر طرف مولانا جمیل الرحمٰن صاحب کی درسگاہ تھی اور ان کا دفتر بھی تھا جو شاخ کے ناظم بھی تھے۔

مولانا روزانہ شاخ پیدل آتے جاتے تھے اور طلباء کو بہت محبت اور شفقت کے ساتھ فارسی کے ساتھ پرانی اردو جو کسی زمانہ میں سرکاری دفاتر میں کبھی چلا کرتی تھی جس کے لکھنے کا انداز ایسا تھا کہ اسے بمشکل تمام پڑھا جاتا تھا، لیکن مولانا اس کے ماہر تھے اس ٹیڑھی اور پرانی نستعلیق اردو کو بلا تکلف پڑھتے اور پڑھاتے تھے راقم نے بھی اردو ان سے پڑھی ہے اور قرآن شریف ان سے اور حافظ صدیق صاحب سے پڑھا۔ مسجد کلثوم کے جمعہ کے امام وخطیب بالالتزام مفتی مظفر حسین صاحب تھے جو اس وقت مدرسہ کے نائب ناظم بھی تھے، جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد پابندی کے ساتھ مفتی صاحب اور مولانا اطہر حسین صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے کمرہ میں تشریف لاتے اور کافی دیر قیام کرتے اور تینوں حضرات ایک ساتھ وہیں کھانا کھاتے، اس کے بعد واپس جاتے، ان تینوں حضرات کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری بلا ناغہ برادر اکبر کی تھی اور ان کی خدمت کے طفیل میں اکثر ان بزرگوں کے کھانے کا بچا ہوا تبرک اس راقم کو بھی مل جایا کرتا تھا، مولانا بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، لیکن یہ دنیا دار فانی ہے، ہر ایک کو جانا ہے، تمام خوبیوں کے ساتھ ایک دن وہ آیا کہ مولانا بھی فضل الٰہی میں پہونچ گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے درجات کو بلند فرمائے، قبر کو منور فرمائے۔

تذکرہ مولانا یونس صاحب جونپوری

حضرت مولانا یونس صاحب جونپوری دار الطلباء قدیم کے غالبًا کمرہ (۱۱)

میں قیام پذیر تھے اور دارالاقامہ میں مقیم اساتذہ و منتظمین میں سب سے نوعمر تھے اور قریب العہد بالتدریس بھی تھے، جلدی ہی ان کی تقرری عمل میں آئی تھی، طبعی اعتبار سے نزاکت کے پیکر تھے، ان کے کمرہ میں ہر طرف کتابوں کا انبار تھا، بلا ترتیب کثرت سے ان کے کمرہ میں کتابیں موجود تھیں، کئی کتابوں کو کھولے ہوئے ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔

ان کا کھانا بہت اہتمام سے حضرت شیخ کے مکان سے آیا کرتا تھا اور کھانا کھلانے کی ذمہ داری برادر اکبر کی تھی، کھانا کھلانے کے بعد بچا ہوا کھانا برادر اکبر اکثر کمرہ میں لے کر آجاتے جس سے از راہ تبرک استفادہ کا موقعہ راقم کو بھی ملتا تھا۔

اکثر درسی کتابیں جو ان کے سپرد ہوتیں اس کو ذاتی طور پر خرید کر منگاتے اور سادے اوراق اس میں لگا کر ان کی تجلید کرواتے اور دوران مطالعہ جو اہم باتیں ہوتیں ان کو ان سادے اوراق پر نقل فرماتے جس سے مطالعہ کا نچوڑ درسی کتابوں کے سادے اوراق میں محفوظ ہو جایا کرتا تھا اور تدریس کے لئے اسی ذاتی کتاب کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر درسگاہ تشریف لے جاتے تھے جس سے تدریس میں کافی مدد ملتی تھی۔

حدیث پاک کے علاوہ اور بھی دوسرے فنون کی کتابیں گاہ بگاہ ان کے سپرد ہوتی تھیں، انکا درس بھی بلا تامل دیا کرتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب جب درس بخاری سے معذور ہو گئے تو آپ نے خود اپنے نائب کی جستجو شروع کی اور بالآخر حضرت نے اپنا نائب مولانا یونس صاحب جونپوری کو مقرر فرمایا اور بخاری شریف ان کے سپرد کی، چونکہ

مدارس کے عرف میں بخاری شریف جلد اول جس کے سپرد ہوتی ہے وہ شیخ الحدیث کے لقب سے ملقب ہوتا ہے، لہٰذا مولانا بھی حضرت شیخ کی زندگی ہی میں شیخ الحدیث کے خطاب سے سرفراز کئے جانے لگے۔

مولانا کا آبائی وطن ضلع جونپور کا چوکیہ نامی گاؤں ہے جو گورینی کے متصل ہے اور مظاہر علوم جانے سے پہلے ابتدائی تعلیم آپ نے مدرسہ عربیہ ضیاء العلوم مانی کلاں سے حاصل کی، حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب فیض آبادی ھنسور کے قریب برہی کے رہنے والے تھے اور مدرسہ ضیاء العلوم کے کامیاب مدرس تھے، ان کے مزاج وطبیعت کا زیادہ اثر مولانا نے قبول کیا اور طبیعت میں لطافت ونزاکت وہیں سے آئی، چونکہ مولانا کے استاذ محترم مولانا ضیاء الحق صاحب بھیلی بھی چھلوا کر کے استعمال کرتے تھے، مولانا نے علمی جستجو میں اپنے کو ایسا لگایا کہ مدرسہ مظاہر علوم ہی کے ہو کر رہ گئے اور گھر کی آمد ورفت بھی گویا کہ انہوں نے ترک کردی، اگرچہ بعد میں سال دو سال پر گاہ بگاہ اعزا واقارب سے ملنے کے لئے جانے لگے، لیکن شروع میں مکمل منی تھے بعد میں معرب بنے۔

مدرسہ مظاہر علوم کے اختلاف کے زمانہ میں دار جدید میں جو اساتذہ داخل ہوئے اور اندر جا کر وہ متمکن ہو گئے اور الحمدللہ اب تک ان کا تمکن باقی ہے، ان میں مولانا کا بھی نام ہے، اس کی پاداش میں وقف کے منتظمین نے دار الطلباء قدیم کے اس کمرہ کو مقفل کردیا جس کمرہ کی حیثیت قیام گاہ سے زیادہ ذاتی کتب خانہ کی تھی، دار جدید میں آنے کے بعد اس کا قلق و درد کافی دنوں تک محسوس کرتے رہے، جس کا اظہار بھی مولانا کرتے تھے، لیکن ضلع اعظم گڈھ کے بعض اکابر علماء کی مداخلت اور

مسلسل کاوش کے بعد وقف کے منتظمین نے ان کی کتابیں واپس کردیں جن کے مشکور مولانا تاحیات رہے۔

جب تک دار جدید میں آپ کے مزاج کے مطابق قیام گاہ کا وجود عمل میں نہیں آیا حضرت مولانا طلحہ صاحب کی رفاقت میں کچے گھر کی بالائی منزل پر قیام پذیر رہے، بعد میں دار جدید میں دارالحدیث کے متصل قیام گاہ جب تیار کردی گئی وہاں منتقل ہوگئے، اور بالآخر سحر وآسیب کے مختلف مراحل سے گزر کر شاہ ولایت قبرستان کا دائمی سفر کرلیا۔ اللہ پاک درجات کو بلند فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے ملقب کئے گئے۔

کچھ طلباء کا تذکرہ

راقم جن ایام میں دار الطلباء قدیم میں مقیم تھا اس زمانہ میں بہت سے نامور طلباء بھی زیر درس تھے جو بعد میں چل کر اونچے اونچے مناصب اور مقام پر فائز ہوئے اور اللہ نے ان سے دین کا بہت کام لیا۔ اس وقت ان میں سے چند کے نام ذہن میں ہیں، مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا اجمالی تذکرہ آجائے۔

(۱) مولانا عبدالحفیظ مکی:

ان کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے قدیم زمانہ میں مکہ مکرمہ پہونچ

گیا تھا اور وہیں مستقل قیام پذیر ہو گیا تھا، مولانا کی پیدائش بھی وہیں کی تھی، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ مکی لگایا جاتا تھا، دورہ حدیث پڑھنے کے لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے پاس تشریف لائے اور حضرت شیخ کی بخاری کے آخری درس کے تلامذہ میں مولانا عبدالحفیظ صاحب کا بھی شمار ہے جو حضرت شیخ کے بہت چہیتے اور منظور نظر تھے اور تاحیات منظور نظر رہے۔

(۲) مولانا حبیب اللہ چمپارنی

مولانا چمپارن کے خیروا گاؤں کے رہنے والے تھے اور انتہائی ذہین طلباء میں ان کا شمار تھا، مطالعہ کے بہت شوقین تھے، دارالحدیث کے شرقی اور جنوبی حصہ میں بالائی منزل پر ایک کمرہ میں رہا کرتے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی مراسلات کے محرر بھی تھے، فراغت کے کچھ دنوں کے بعد مدینہ طیبہ چلے گئے اور تاحیات مدینہ طیبہ ہی میں ان کا قیام رہا۔

(۳) مولانا وسیم احمد صاحب سنسار پوری:

سنسار پور ضلع سہارنپور کی ایک زرخیز بستی ہے جہاں کے آپ رہنے والے تھے، آپ بھی مولانا حبیب اللہ صاحب کے رفیق حجرہ تھے، ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے، مدرسہ مظاہر علوم کے ممتاز طلباء میں آپ کا بھی شمار ہوتا تھا، بعد میں مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ کے مدرس تجویز پائے اور تاحیات اسی ادارہ سے منسلک رہ کر حدیث پاک اور دوسرے فنون کا درس دیتے رہے۔

(۴) مولانا طٰہٰ مظفرپوری:

اس زمانہ میں مظفرپور کے رہنے والے ایک جوان بزرگ صفت مولانا طٰہٰ صاحب تھے جو صوفیانہ مزاج کے حامل تھے، حضرت ناظم صاحب کے بہت قریب تھے اور وہ بھی دارالطلباء قدیم ہی میں مقیم تھے۔

(۵) مولانا کلیم اللہ بستوی:

(۶) مولانا عبدالقیوم بستوی:

یہ دونوں بستی ضلع کے رہنے والے تھے، مولانا عبدالقیوم صاحب بعد میں حضرت ناظم صاحب کے مجاز ہوئے اور مولانا کلیم اللہ صاحب کو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی طرف سے اجازت حاصل ہوئی، کافی عرصہ تک سورت شہر میں محلّہ مکلائی میں ایک مسجد کی خدمت انجام دیتے رہے اور وقت موعود پر اس دارفانی کو الوداع کہہ گئے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے طلباء تھے جو اپنی اپنی شناخت رکھتے تھے، لیکن اتنا طویل وقفہ ہوگیا کہ اب نہ ان کے نام یاد ہیں اور نہ ان کی شکل ذہن میں ہے، جن چند حضرات کے نام یاد تھے ان کا تذکرہ راقم نے سپردِ قلم کردیا ہے۔

مزمل آسامی کا واقعہ

دارالطلباء قدیم میں مقیم طلباء میں ایک نام مزمل آسامی کا بھی ہے جو آسام

کے رہنے والے تھے اور بہت نیک طبیعت تھے۔ حضرت ناظم صاحب کے بہت قریب تھے، ایک مرتبہ سخت علیل ہو گئے، اس علالت میں اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور اتنا سخت اسہال کہ تقریباً ساٹھ ستر کپڑے اسہال کی وجہ سے خراب ہو گئے اور ان کے ساتھیوں میں کوئی بھی ان کپڑوں کو دھونے کے لئے تیار نہیں تھا، بالآخر مدرسہ کے منتظمین اور اکابر اساتذہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے عصر کے بعد دار الطلباء قدیم میں جمع ہوئے اور مدرسہ کے بھنگی کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ کپڑے لے جاؤ اسے ندی یا نالہ سے دھوکر کے لئے آؤ اور اس کی مزدوری سو روپیہ مدرسہ تم کو دے گا، باوجودیکہ وہ روزانہ دار الطلباء قدیم کے بیت الخلاء کی غلاظت کڑاھی میں بھر کر ٹھیلہ یا ٹریکٹر پر لادکر پھینکتا تھا اور اس کی مزدوری ماہانہ طے تھی اور یہی اس کا کام تھا، اضافی مزدوری ملنے کے باوجود وہ تیار نہیں ہوا، وہاں طلباء کی بھی ایک بھیڑ جمع تھی، بھنگی کے انکار کرنے کے بعد برادر اکبر آگے بڑھے اور ساٹھ ستر گندے کپڑوں کی گھٹری اٹھائی اور سب کے سامنے سے لے کر نکلے اور دار جدید کے شرقی جانب ایک نالہ سے دھوکر سکھا کر لاکر دے دیا، اس واقعہ کو دیکھ کر سارے منتظمین اساتذہ اور طلباء حیران ہو گئے اور ہر ایک کی زبان پر مدح سرائی کے ساتھ دعائیہ کلمات تھے۔

مولانا طہ صاحب مظفر پوری کے بھتیجہ کا واقعہ

مولانا طٰہ صاحب مظفر پوری جن کا تذکرہ اس سے قبل آچکا ہے ان کا ایک

بھتیجہ بھی ان کے ساتھ رہتا تھا جس کی عمر تقریباً راقم کے ہم عمر تھی اور ہم دونوں اس وقت حفظ کے طالب علم تھے اور مغرب کے بعد ہم دونوں مسجد کلثوم میں اپنا سبق یاد کیا کرتے تھے۔ ایک دن عشاء کی نماز پڑھ کر راقم مسجد کلثوم سے نکلا تو جوتوں کے پاس پانچ کا نوٹ گرا ہوا نظر آیا جس کو راقم نے اٹھالیا اور اس کی خبر مولانا طہ صاحب کے بھتیجہ کو دی پھر اس سے مختلف چیزیں خرید کر ہم دونوں نے تنہائی میں کھایا، اس واقعہ کی خبر کسی طرح برادر اکبر کو ہوگئی، انہوں نے اس کی اصلاح کے لئے اتنا سخت رُخ اختیار کیا جو راقم کے تحمل سے عمر کے اعتبار سے باہر تھا، بات چیت مکمل بند کردی، کمرہ سے باہر نکال دیا، ایک ہفتہ تک کھانا بند کردیا، لیکن ان کی سختی کی وجہ سے جو اصلاح ہوئی وہ آج تک یاد ہے، اس کے بعد انہوں نے مالک کو تلاش کر کے اپنی جیب سے پانچ روپیہ واپس کیا۔

برادر اکبر چونکہ مشرباً تھانوی تھے اور حضرت تھانوی کی تالیفات سے بے پناہ لگاؤ تھا اور اس سے استفادہ بھی مسلسل کرتے رہتے تھے، حضرت تھانوی کے سلسلہ کے مشائخ سے بھی گہرا لگاؤ تھا، اسی لئے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کا رسالہ معرفت حق ہر مہینہ پابندی سے منگاتے تھے اور حضرت ناظم صاحب سے بھی بہت گہرا تعلق تھا، یوں تو تمام اساتذہ کے منظور نظر تھے لیکن گہرا تعلق حضرت ناظم صاحب اور مفتی مظفر حسین صاحب سے تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ دورہ سے فراغت کے بعد ہی حضرت ناظم صاحب نے اجازت وخلافت سے سرفراز کردیا اور فراغت کے بعد آزاد مدرسہ ڈھاکہ کی تدریس سے مربوط ہوگئے اور جامع مسجد کی امامت وخطابت بھی آپ کو

دے دی گئی۔علاقہ میں احیاء سنت امحاء بدعت کی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرتے رہے اوراس کے لیے اپنی پوری توانائی انہوں نے صرف کی، رسومات و بدعات کے خلاف حضرت تھانوی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے پوری جدوجہد کرتے رہے اوراس کا خاطرخواہ نتیجہ بھی سامنے آیا۔

لیکن کچھ لوگوں کی ایسی نظر بد لگی کہ آزاد مدرسہ چھوڑنا پڑا اور جامع مسجد کی امامت وخطابت سے بھی سبکدوش ہونا پڑا، لیکن اپنے مشن اور کام میں لگے رہے آج بھی علاقہ ہی میں رہ کر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

چندواقعات

دارالطلباء قدیم کے سامنے دوروڈ کے بیچ میں ایک سردار جی کی کرانہ کی دکان تھی، ایک مرتبہ ایک سامان خریدنے کے لئے راقم اس کی دکان پر گیا، راقم نے اس سے تیج پات مانگا، دوکاندار میری زبان نہیں سمجھ پایا، اس نے کئی مرتبہ پوچھا لیکن راقم اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتا رہا، بالآخر اس نے سامنے سے گزرنے والے ایک بڑے طالب علم کو بلایا اور اس سے دوکاندار نے کہا کہ اس بچہ سے پوچھو کہ کیا چاہئے، اس طالب علم کے پوچھنے پر راقم نے وہی لفظ دہرایا تو اس طالب علم نے اس کا ترجمہ کرکے بتایا تب اس نے کہا کہ جو تم مانگ رہے ہو اس کو یہاں تیز پات کہتے ہیں۔

(۲) ایک مرتبہ روڈ پر گزرتے ہوئے ٹھیلہ والا نظر آیا تو اس کے پاس پہونچ

کر راقم نے ایک ککڑی خریدی وہ ککڑی بہت کڑوی نکلی، راقم نے ٹھیلہ والے کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ ککڑی بہت تیتی ہے، دوسری دے دولیکن ٹھیلہ والا میری زبان نہیں سمجھ پا رہا تھا جس کی وجہ سے کافی دیر تک مجھے کھڑا رہنا پڑا، بالآخر ایک بڑا طالب علم جاننے والا وہاں سے گزرا اس کو روک کر راقم نے جب بتایا تو اس نے ترجمہ کر کے اس کو سمجھایا کہ یہ بچہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ ککڑی کڑوی ہے، تب سمجھ میں آیا کہ یہاں تتا کو کڑوا کہتے ہیں، اس کے بعد ٹھیلہ والے نے بدل کر دوسری ککڑی دی۔

(۳) دابکی کی دعوت

دابکی شہر سہارنپور سے چند کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے، اسی گاؤں سے موسوم دعوت ہے۔

دابکی گاؤں کے لوگ سال بھر ایک ایک دودو پیسہ جمع کرتے تھے اور سال میں ایک مرتبہ مظاہر علوم کے تمام اکابر واصاغر منتظمین اساتذہ وطلباء کی دعوت کیا کرتے تھے جس کا باضابطہ دفتر کی طرف سے اعلان آویزاں ہوتا تھا اور طلباء واساتذہ بہت شوق کے ساتھ مختلف ذرائع سے اس گاؤں میں جلوہ افروز ہوتے تھے، جب طلباء واساتذہ وہاں پہونچتے تو گاؤں والوں کی مسرت دیکھنے کے لائق ہوتی، دعوت کے قریب پوری بستی کے لوگ گاؤں کے ہر گھر کی رنگائی کرتے تھے، گلی کوچوں کو صاف کرتے تھے اور بہت محبت واہتمام کے ساتھ دعوت کھلاتے تھے، ان کی دعوت کے دو

خاص جز تھے (۱) رسیاول (۲) گھی بورا۔ راقم بھی جب تک مظاہر علوم میں رہا کرایہ کی سائیکل لے کر جو طلباء وہاں جاتے تھے اس پر بیٹھ کر جاتا رہا۔

کتب خانہ رحیمیہ کی دعوت

(۴) کتب خانہ رحیمیہ دیوبند کا بہت مشہور اور پرانا کتب خانہ ہے، لیکن کتابوں کی طباعت میں بہت زیادہ ان کے یہاں اہتمام نہیں ہوتا اس سے زیادہ مقبول بعد میں کتب خانہ رشیدیہ ہوا، کتب خانہ رحیمیہ والے کتابوں کے اچھے تاجر تھے وہ ہر سال کئی ہفتہ مسلسل ہر جمعرات کی شام کو مظاہر علوم کے طلباء کی دعوت کیا کرتے تھے، دعوت میں دو چیزوں کا اہتمام رہتا تھا (۱) پلاؤ (۲) زردہ۔ یہ دعوت عموماً سال کے اخیر میں ہوا کرتی تھی اور طلباء بہت بے صبری کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب وہ ایام آجاتے تو طلباء کی خوشی دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ راقم بھی جب تک مظاہر علوم میں رہا اس دعوت سے مستفید ہوتا رہا۔

(۵) دارالطلباء قدیم سے نکل کر چند قدم کے فاصلہ پر ایک کباب والا تھا جو دس پیسے میں ایک کباب دیا کرتا تھا، جب کباب کھانے کو دل چاہتا تو ایک نان دے کر کباب والا ایک کباب دے دیا کرتا تھا۔ راقم نے بھی بارہا ایک نان کے بدلہ ایک کباب لے کر کھا کر اپنے تشنہ ذوق کی تسکین کی، کیونکہ حالات ایسے نہیں تھے کہ پیسہ دے کر کباب خریدا جاسکے، اس لئے ایک کے بدلے ایک پر اکتفاء کیا جاتا تھا۔

(۶) جن دنوں مظاہرعلوم میں قیام تھا راقم کے کرتہ کا بٹن اکثر کھلا رہتا تھا جس کو دیکھنے والے طلباء اکثر اپنے ہاتھ سے بند کردیا کرتے تھے، اورٹوپی اکثر ٹیڑھی رہتی تھی جس کوطلباء ازراہ شفقت سیدھی کردیا کرتے تھے اس کے بعد سے راقم نے لمبی ٹوپی پہننا ہی بند کردیا اور گول ٹوپی استعمال کرنے لگا جس میں الٹی سیدھی کا فرق ہی نہیں رہا بلکہ اس کا ہر گوشہ سیدھا ہوتا ہے، اس کے بعد سے پوری زندگی گول ٹوپی پہننے کی عادت بن گئی۔ طالب علمی کے زمانہ میں کوئی بھی گول ٹوپی پہن لیتا تھا۔ اگرچہ ایک زمانہ تک حضرت رائے پوری جیسی ٹوپی جس کو حضرت شیخ بھی پہنا کرتے تھے اپنے ہاتھ سے سل کر پہنتا رہا لیکن ۱۹۸۰ء سے وہ گول ٹوپی سر پر آگئی جو تھانوی ٹوپی کے ساتھ موسوم ہے، جب سے اب تک وہی ٹوپی سر پر موجود و باقی ہے۔

سہ بارہ مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور کی حاضری

اس سال جب مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور حاضری ہوئی، مدرسہ مظاہرعلوم دار جدید میں قیام طے پایا۔ اس وقت دار جدید میں تحتانی عمارت تھی اور فوقانی منزل پر صرف دو کمرے تھے جس میں سے ایک کمرہ میں برادران کے ساتھ راقم کا قیام تھا اور دوسرے کمرہ میں جو مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری کی قیام گاہ کے متصل بالائی منزل پر بنا ہوا تھا اس میں دربان کا قیام تھا۔ ان ایام میں دار جدید میں دارالاقامہ کے ساتھ ایک کشادہ مسجد اور اس کی انتہاء پر ایک حوض اور اس کے متصل کئی غسل خانے

اس کے تھوڑے فاصلے پر دس عدد بیت الخلاء تھے۔

اس وقت دار جدید میں زیادہ تر بیرونی طلباء قیام پذیر تھے، اساتذہ میں دو اساتذہ مستقل وہاں قیام فرماتے تھے۔

(۱) مفتی عبدالعزیز صاحب جو اونچے اساتذہ میں سے تھے اور مسجد کے اتر طرف نالہ کے کنارے دو کمرے بنے ہوئے تھے جس میں آپ کا قیام تھا اور انہی کمروں میں سے ایک کمرہ کا دروازہ مسجد کی طرف بھی کھلتا تھا جس سے پنجوقتہ نمازوں کی امامت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے، چونکہ پنجوقتہ نماز کے امام بھی آپ ہی تھے۔لیکن درس کے لئے دار قدیم تشریف لے جایا کرتے تھے، چونکہ ان ایام میں دارالحدیث کے ساتھ عربی درجات کی دوسری درسگاہیں دار قدیم کی بالائی منزل پر بنے ہوئے مختلف کمرے تھے، مولانا عاقل صاحب، مولانا ظریف احمد صاحب، مولانا وقار علی صاحب، علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری، مفتی عبدالعزیز صاحب، مفتی عبدالقیوم صاحب، مولانا سلمان صاحب، مولانا یونس صاحب جیسے اکابر اساتذہ انہی درسگاہوں میں درس دیا کرتے تھے۔البتہ موقوف علیہ میں جب طلباء کی کثرت ہوگئی تو اس کی درسگاہ دار جدید منتقل کر دی گئی اور موقوف علیہ کی کتابیں پڑھانے والے اساتذہ اپنی گھنٹیوں میں دار جدید تشریف لا کر درس دینے لگے۔

(۲) مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری، مفتی صاحب ایک باوقار اور سنجیدہ بزرگ صفت درجات علیاء کے استاذ تھے، ان کا قیام بھی دار جدید ہی کے کمرہ میں تھا جو طلباء کے نگراں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

راقم کا یہ سال بھی تحفیظ کا تھا بڑوں کے مشورہ سے حافظ بشیر احمد صاحب جو محلّہ ٹھٹھریان کی ایک مسجد کے امام تھے اور سنسار پور کے رہنے والے تھے اور مفتی مظفر حسین صاحب کے بہت قریبی تھے ان کے یہاں محلّہ کے بہت سے طلباء حفظ کیا کرتے تھے اور حافظ صاحب بہت محبت اور خلوص کے ساتھ مسجد کی شرقی جانب اپنی قیام گاہ کے متصل ایک سہدری میں حفظ کی تعلیم دیا کرتے تھے، راقم بھی صبح شام وہاں جانے لگا اور پابندی کے ساتھ سبق اور آموختہ سنانے لگا۔

سال میں ایک دو مرتبہ استاد محترم حافظ بشیر احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم کے اساتذہ کی بہت اہتمام سے دعوت بھی کیا کرتے تھے جس میں مفتی مظفر حسین صاحب، مولانا اطہر حسین صاحب، مولانا عبدالمالک صاحب خصوصیت سے شرکت کیا کرتے تھے۔

دار جدید کا قیام اور اس کے چند واقعات

راقم کا قیام جس کمرہ میں تھا وہ کمرہ مدرسہ کی طرف سے برادران کا تھا لیکن اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ تین آدمی رات گزار سکیں۔ اس لئے برادر اکبر نصف شب تک درسگاہ میں اپنا وقت گزارتے تھے، تکرار ومطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں چلے جاتے اور فجر کی اذان تک ذکر وتلاوت اور نوافل میں مشغول رہتے، برادر اوسط اور راقم پابندی کے ساتھ کمرہ میں رات گزارتے تھے۔ راقم کے ذمہ مطبخ

سے کھانا لانا برتن دھونا، ناشتہ بنانا، کمرہ کی صفائی ستھرائی کرنا اور دیگر سارے کام رہا کرتے تھے، مطبخ سے کھانا چونکہ برادران ہی کا ملتا تھا اور کھانے والے تین ہوتے تھے، اس لئے کھانا لانے کے بعد کبھی راقم اور کبھی برادر اوسط کھانے سے فارغ ہوتے اور برادر اکبر ہمیشہ تیسرے نمبر پر برادران کا بچا ہوا کھانا کھایا کرتے تھے اور کبھی بھی کھانے کی کمی کا شکوہ نہیں کرتے تھے بلکہ جو کچھ موجود ہوتا تھا چاہے کم ہو یا زیادہ صبر وشکر اور پوری بشاشت کے ساتھ کھالیا کرتے تھے۔

(۲) مطبخ سے دونوں وقت کھانا لانا راقم کی ذمہ داری تھی، احاطہ مطبخ دارقدیم کے سامنے روڈ پار کر کے تھا جو مطبخ کا اسٹور بھی تھا اور کھانا بھی وہیں ملتا تھا اور تقسیم بھی وہیں ہوتا تھا۔ علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری کا قیام بھی احاطہ مطبخ ہی کے ایک کمرہ میں تھا، کھانا پکنے کے دھویں کی وجہ سے پورا احاطہ مطبخ سیاہ پڑا ہوا تھا جس سیاہی سے ہر کمرہ اور ہر گوشہ متاثر تھا، انہی دھواں رسیدہ کمروں میں سے ایک کمرہ امام النحو کا بھی تھا۔ دونوں وقت کھانا تقسیم کے اوقات میں طلباء کی لمبی قطاریں لگتی تھیں، لیکن تمام طلباء راقم کے صغرسنی کی وجہ سے لائن میں لگنے کا مکلّف نہیں بناتے تھے، اکثر بغیر لائن کے گھس کر کھانا لے لیا کرتا تھا، طلباء بھی ایک دوسرے سے واقف تھے اور آپس میں پیار ومحبت اور یگانگت بھی بہت تھی، ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہونے کا عام مزاج تھا، خوردوں میں بزرگوں کا احترام تھا اور بزرگوں میں خوردوں پر شفقت کا مزاج تھا، چھوٹے بڑے ہر درجہ کے طلباء ایک دوسرے کے ساتھ بہت اپنائیت کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

(۳) جمعرات کے دن ہفتہ میں ایک مرتبہ راقم تھیلہ لے کر تمام کمروں سے بچی ہوئی سوکھی تندوری روٹی جمع کیا کرتا تھا اور لوہے کے ہاون دستہ میں کوٹ کر باریک کر کے ڈبہ میں بھر کر رکھ لیا کرتا تھا جو ہفتہ بھر ناشتہ کا کام دیتا تھا، صبح کو فجر کے بعد راقم اسٹوپ جلاتا اور ڈبہ میں پانی گرم کرتا اور اس میں سوکھی روٹی کا برادہ ڈال کر حلوہ بناتا اور وہی ناشتہ کے کام آتا تھا۔

نیز ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھنے کا التزام تھا، واپسی پر ایک کیلو چنا، ایک کیلو چینی ایک کیلو مٹی کا تیل برادر اکبر خرید کر میرے سپرد کرتے تھے جو پورے ہفتہ کا خرچ ہوا کرتا تھا، عموماً جمعرات کے دن چنا اور سوکھی روٹی کا برادہ ختم ہو جاتا اور اکثر جمعہ کے دن ناشتہ کچھ اور ہوا کرتا تھا۔

جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد تلاوت وغیرہ سے فارغ ہو کر جب ناشتہ کا وقت آتا تو برادر اکبر راقم کے پاس آتے اور کہتے کہ بابو آج تو ناشتہ ختم ہے، کھانے کے لئے کچھ ہے نہیں تو ناشتہ کیا کرو گے؟ اس کے بعد خود کہتے ایسا کرو دو رکعت صلوۃ الحاجہ پڑھ کر اللہ سے دعاء کرو میں کچھ دیکھتا ہوں، یہ کہہ کر مسجد کے باہر چلے جاتے، راقم دو رکعت صلوۃ الحاجہ پڑھتا، دعاء کرتا، اکثر دعاء کے دوران ہی مٹھائی لے کر واپس آتے اور کہتے لو بابو ناشتہ کر لو، اللہ نے تمہاری دعاء قبول کر لی اور ناشتہ میں تمہارے لئے مٹھائی بھیج دیا، اس کے بعد جمعہ کی تیاری میں نہانے دھونے میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔

دوران طالب علمی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کپڑا دھونے کا اور بغیر پریس کئے

ہوئے پہننے کا معمول رہا۔

برادر اکبر اکثر ساتھیوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، ہمارے بعض اساتذہ کا حال یہ ہے کہ ان میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ صابون خرید کر اور اس سے کپڑا دھلوا کر پہن سکیں بلکہ صابون کی جگہ ریہ کی مٹی سے وہ کپڑا دھلواتے اور دھوتے ہیں ایسے اساتذہ کے سامنے ہم دھوبی سے کپڑا دھلوا کر پریس کروا کر تحصیل علم کے لئے جائیں گے تو ہمیں کیا خاک علم آئے گا، اس لئے جو طلباء دھوبی سے کپڑا دھلاتے تھے اور دھوبی کا دھلا ہوا پہنتے تھے جن میں برادر اوسط بھی شامل تھے ان کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

(۴) اس زمانہ میں ملک میں جنگی حالات کی وجہ سے رات میں بلیک آؤٹ رہا کرتا تھا جس کی وجہ سے پورے شہر میں اندھیرا ہوتا تھا، آٹا پیسنے والی چکی مشین بھی بند رہا کرتی تھی، جس کی وجہ سے اکثر چاول پکا کرتا تھا، کبھی کبھی بریانی اور تہاڑی بھی بن جایا کرتی تھی، جو طلباء چاول کے شوقین ہوتے تھے ان کی عید ہو جایا کرتی تھی اور وہ چاول اور بریانی وزن کر کے فی کس ایک کیلو دیا جاتا تھا جو عموماً ایک طالب علم کے لئے کافی ہو جایا کرتا تھا۔

چونکہ مطبخ سے کھانا برادران ہی کا آتا تھا اور راقم ان دو میں تیسرا اضافی تھا، اس کے باوجود جس دن چاول یا بریانی ہوتی برادر اکبر ناشتہ دان کے ایک ڈبہ میں بھر کر غائب ہو جایا کرتے تھے اس کے بعد حسب معمول کمرہ میں آ کر سب سے اخیر میں بچا کھچا کھا لیا کرتے تھے، تسلسل کے ساتھ کئی مہینے تک یہ دیکھتا رہا، لیکن پوچھنے کی ہمت

نہیں جٹا پایا، ایک طویل عرصہ کے بعد یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ چاول کا وہ ڈبہ لے کر مفتی مظفر حسین صاحب کے گھر جایا کرتے تھے اور وہ چاول دیکر آیا کرتے تھے، یہ جان کر مزید حیرت ہوئی کہ مفتی مظفر حسین صاحب اور مولانا اطہر حسین صاحب دونوں سگے بھائی تھے اور ایک ہی کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، ان دونوں میں سے مفتی مظفر حسین صاحب اس وقت علیاء کے مدرس تھے، ترمذی شریف پڑھایا کرتے تھے اور مدرسہ کے نائب ناظم بھی تھے، لیکن دونوں حضرات کی تنخواہ اتنی قلیل اور معمولی تھی کہ چاہنے کے باوجود چاول خرید کر پکانے کی صلاحیت واہلیت نہیں رکھتے تھے، اس لئے مسلسل صرف روٹی ہی کھاتے تھے، یہ بات برادر اکبر کو معلوم تھی، اس لئے جس دن مطبخ سے چاول ملتا تھا تو ایک ڈبہ چاول یا بریانی مفتی صاحب کے گھر پہونچا دیا کرتے تھے، اس طرح مفتی صاحب کے گھر والوں کی چاول کی طلب کی تکمیل ہوجاتی تھی۔

(۵) اس وقت مدرسہ مظاہر علوم کے دارجدید میں نالہ کے کنارے جو بیت الخلاء بنا ہوا تھا اس میں دروازے نہیں تھے، بلکہ کھانس کر اندر جانا پڑتا تھا اور نیچے پکے فرش پر گندگی جمع ہوتی تھی جس گندگی کو بھنگی روزانہ دوپہر میں اکٹھا کر کے لے جاتا تھا، لیکن اوپر کے حصہ میں پیشاب کی نالیوں میں مٹی کے ڈھیلوں کے جماؤ کی کثرت کی وجہ سے بدبو کے ساتھ لمبے لمبے کیڑے بھی پیدا ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے قضاء حاجت کے لئے اس کے اندر جانا مشکل ہو گیا تھا، بھنگی سے صاف کرنے کو جب طلباء کہتے تو طلباء کو یہ جواب دیتا کہ مجھے صرف نیچے کی گندگی اٹھانے کی تنخواہ ملتی ہے اوپر کی صفائی کی نہیں، لہٰذا میں نہیں صاف کروں گا۔

اسی دوران ایک جمعہ کو دیکھا کہ برادر اکبر نے لنگی بدلی کرتا نکالا بالٹی اور جھاڑو لیا اور بیت الخلاء کی صفائی کے لئے پہونچ گئے، آپ کو دیکھ کر آپ کے کئی ساتھی جو معتقد اور محبّ تھے وہ بھی ساتھ آ گئے اور چند گھنٹوں میں جمعہ سے قبل سب نے مل کر سارے بیت الخلاء کو صاف کیا اور اس گندگی کو دور کیا اور چونہ وغیرہ ڈال کر ایسا بنا دیا کہ دار جدید کے تمام طلباء دعائیں دینے لگے، اس کی اطلاع جب دفتر انتظام کو پہونچی تو کئی منتظمین اور اساتذہ شام کے وقت اس کو دیکھنے کے لئے آئے اور اس حسن کارکردگی پر سب نے برادر اکبر اور ان کے رفقاء کی تحسین کی اور کسی صاحب نے ان تمام طلباء کی بریانی کی دعوت کی جس کے کھانے میں یہ راقم بھی شریک تھا۔

(۶) برادر اکبر کا تمام طلباء ان کی عبادت و زہد اور خشیت و انابت اور ریاضت و مجاہدہ اور تواضع و توکل علی اللہ کی وجہ سے احترام کیا کرتے تھے، اور سب محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دار جدید کی مسجد کے امام مفتی عبدالعزیز صاحب کی عدم موجودگی میں امامت کے فرائض بھی یہی انجام دیا کرتے تھے، اپنی بعض بیماریوں کی وجہ سے کبھی کبھار وقت مقررہ سے لیٹ پہونچا کرتے تھے، لیکن تمام طلباء بلا چون و چرا انتظار کرتے تھے، کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر کے نماز پڑھا دے، لیکن ایک مرتبہ بعض طلباء نے چہ می گئی شروع کر دی جس کی اطلاع برادر اکبر کو ہو گئی تو آپ مسجد پہونچے اور وقت ہو جانے کے بعد مصلی پر امامت کے لئے نہیں بڑھے، جب چند منٹ گزر گئے تو طلباء نے آپ سے کہا کہ وقت ہو گیا ہے نماز پڑھا دیجئے، تو آپ نے کہا جسکو پڑھانا ہو پڑھا دے میں نہیں پڑھاؤں گا۔ پندرہ

منٹ تک تمام طلباء اسی کشمکش کے شکار رہے، لیکن کسی طالب علم کی ہمت نہیں ہوئی کہ مصلیٰ پر بڑھ کر امامت کر دے بالآخر مجبوراً برادر اکبر آگے بڑھے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد کسی کی زبان نہیں کھلی اور نہ ہی تاخیر پر کوئی چہ می گوئی ہوئی۔

(۷) دار جدید میں موجود طلباء میں فقیر محمد نام کے ایک طالب علم تھے جن کا تعلق جزیرہ انڈمان سے تھا، وہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بیعت تھے اور فجر سے پہلے سحر کے وقت مسجد کے کھلے صحن میں پابندی کے ساتھ ذکر جہری کیا کرتے تھے جس کی گونج پورے احاطہ دار جدید میں سنائی دیتی تھی، چونکہ وہ جہوری الصوت تھے اس لئے پورے احاطہ میں ان کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن اس قدر بلند آواز سے ذکر پر کبھی بھی کسی طالب علم نے نیند میں خلل واقع ہونے کی شکایت نہیں کی۔

(۸) اس وقت دار جدید میں جو طلباء موجود تھے ان میں کئی طلباء پر مشتمل ایک جماعت تھی جو صوفی منش کے نام سے جانی جاتی تھی جن میں مولانا منیر احمد صاحب بستوی، مولانا سکندر بہرائچی وغیرہ بھی شامل تھے۔ اور ان سب کے مقتداء بڑے برادر اکبر سمجھے جاتے تھے، رات کو درسگاہ میں تکرار ختم ہونے کے بعد اکثر یکجا ہو کر کچھ دیر مذاکرہ بھی کرتے تھے اور سب ایک دوسرے سے مانوس اور قریب تر تھے، طلباء کے ساتھ اساتذہ و منتظمین بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(۹) برادر اوسط جن کے مزاج میں سختی اور خشونت تھی وہ اگرچہ ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے لیکن اکثر کسی نہ کسی بات پر زجر و توبیخ ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے جس کی اطلاع برادر اکبر کو ہوتی تو وہ ناراض ہوتے اور برہمی کا اظہار کرتے اور

ناپسندیدگی کی نظر سے اس کو دیکھتے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی بات پر انہوں نے راقم کو مارا، راقم روتا ہوا برادر اکبر کے پاس پہونچا تو اس حال میں مجھ کو پاکر اشک بار اور کبیدہ خاطر ہوئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری کے پاس پہونچ گئے اور پوری صورتحال کی ان کو اطلاع دی، انہوں نے پوری بات سننے کے بعد مشورہ دیا کہ اوسط کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لگا دو، انشاء اللہ بالتدریج وہاں سے اس کی اصلاح ہوجائے گی۔

حضرت مفتی صاحب کی یہ رائے برادر اکبر کو پسند آئی اور حضرت شیخؒ کی خدمت کے لئے سیٹ کروادیا۔

چنانچہ روزانہ عشاء کے بعد برادر اوسط کی آمد و رفت حضرت شیخؒ کے یہاں شروع ہوگئی اور مراسلت و مکاتبت کا کام ان کے سپرد ہوگیا، چونکہ خوشخط تھے اس لئے یہ کام پابندی کے ساتھ کرنے لگے، دھیرے دھیرے کام میں جب جماؤ شروع ہوا تو حضرت شیخؒ کی توجہ بھی ان کی طرف ہونے لگی، واپسی کے وقت آتے ہوئے ہدیوں میں سے کچھ چھوٹا سا حصہ بھی ان کو ملنے لگا، جب وہ ہدیہ کمرہ میں لے کر آتے تو راقم کو دکھاتے، دیکھو آج یہ ہدیہ ملا ہے، اس کے بعد اکیلے پورا ہدیہ کھا جاتے۔ راقم دل برداشتہ ہوکر برادر اکبر کے پاس پہونچتا اور طفلانہ انداز میں پوری بات نقل کردیتا، برادر اکبر کو یہ سن کر حیرت بھی ہوتی اور افسوس بھی اور بے حد رنج ہوتا اور ملال بھی، اس وقت موجود گرد وپیش بیٹھے ہوئے رفقاء کو مخاطب کرکے یہ کہتے دیکھتے ہو کتنا بڑا نادان

ہے وہ، یا تو اس کو وہیں کھا کر آنا چاہئے اور بتانا بھی نہیں چاہئے، اس کے بجائے وہ وہاں سے لے کر آتا ہے اور دیکھا کر چڑھا کر اکیلے پورا کھا جاتا ہے۔اس کو دیتا بھی نہیں، اس کے بعد اگر وقت ہوتا تو اسی وقت جاتے اور بازار سے وہی چیز خرید کر لاتے اور مجھ کو دیتے اور یہ کہتے کہ چھپا کر کھالینا اس کو دیکھانا اور بتانا نہیں اور اگر دیر ہو چکی ہوتی تو کل ہو کر وہی چیز ضرور خرید کر لاتے اور اکیلے میں بلا کر مجھ کو دیتے اور وہی بات پھر دہراتے کہ چپکے سے کھا لینا اس کو دکھانا اور بتلانا نہیں ، یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔

مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں حاضری

چوتھی مرتبہ جب سہارنپور راقم کی حاضری ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس سال مدرسہ مظاہر علوم کے بجائے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ جانا ہے۔

برادران سے دوری عمر کی کمی کے ساتھ نئی جگہ جانے کا تذکرہ سن کر وحشت کے ساتھ تکلیف بھی ہوئی، لیکن نہ صاحب رائے تھا کہ اپنی رائے کا اظہار کرتا اور نہ ہی انکار کی کوئی گنجائش تھی، سوائے سمع وطاعت کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگر چہ بعد میں چل کر یہ معلوم ہوا کہ برادران کا مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیمی آخری سال تھا اور اس کے بعد ان حضرات کو مدرسہ مظاہر علوم چھوڑ کر تدریسی

ذمہ داریوں میں لگنا تھا، اور راقم کا یہ سال حفظ قرآن کے دور کا تھا، اس کے بعد فارسی سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم کا مسئلہ تھا، برادر اکبر نے مظاہر علوم میں رہتے ہوئے اپنے سے الگ رکھ کر یہ دیکھنا چاہا کہ برادران سے الگ ہو کر کسی دوسرے ادارہ میں جم سکتا ہے یا نہیں اور اپنے تعلیمی سلسلے کو باقی رکھ سکتا ہے یا نہیں تا کہ اس کے سلسلہ میں اسی کے تناظر میں فیصلہ کیا جا سکے۔

چنانچہ برادر اکبر نے راقم کو اپنے ہمراہ لیا اور مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ پہونچا کر اور داخلہ کروا کر واپس آ گئے۔

خرچ کے لئے سات روپئے کا تذکرہ

واپسی کے وقت برادر اکبر نے تسلی دی اور اس کے ساتھ یہ کہا کہ ہم تینوں بھائیوں کے خرچ کے لئے والد صاحب بیس روپیہ ماہانہ بھیجتے ہیں، اگر چہ یہ رقم بھی ہر مہینہ بھیجنا والد صاحب کے لئے کسی بڑے مجاہدہ سے کم نہیں تھا، چونکہ زراعت کے علاوہ اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا، والدین کے ساتھ تین بہنیں اور دو بھائی جو گھر پر موجود تھے ان کے اخراجات کی تکمیل کے ساتھ بیس روپیہ ہر مہینہ نکالنا اور تین بچوں کی تعلیم کے خرچ کے لئے بھیجنا بڑا کام تھا، لیکن والد صاحب اور والدہ دونوں کی انتہائی خواہش تھی کہ چاہے ہمیں نمک روٹی پر گزارہ کرنا پڑے لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کو نہ موقوف ہونے دیں گے نہ متاثر۔

چنانچہ اس کے لئے جو زمین ابا کے پاس تھی پوری فکر اور لگن کے ساتھ اس پر محنت کرتے تھے اور والدہ اس میں برابر کی شریک رہا کرتی تھیں، اس کے علاوہ گھر پر دودھ دینے والی ایک بھینس تھی جس کا دودھ بیچ کر اور گھی بنا کر فروخت کر کے پیسہ جمع کرتے تھے۔ اسی طرح والدہ نے بچوں کی تعلیم کی خاطر مرغیاں پال رکھی تھیں جس کا انڈا فروخت کر کے بچوں کی تعلیم کے لئے پیسہ جمع کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ والدہ ہاتھ سے رسی بانٹ کر جمع کرتیں اور پھر اس کو فروخت کر کے اس کا پیسہ بھی بچوں کی تعلیم کے لئے محفوظ کرتیں۔

زمین سے جو غلہ پیدا ہوتا اس کا مہنگا اور قیمتی حصہ فروخت کیا جاتا اور وہ پیسہ بھی بچوں کی تعلیم کے لئے محفوظ رکھا جاتا، گھر کے کھانے پینے میں موٹی جھوٹی روکھی سوکھی چیزوں کا استعمال کیا جاتا اور ہر چیز میں بچوں کی تعلیم کی بقاء اور ان کے اخراجات کی فراہمی پر والدین کی پوری فکر کے ساتھ نظر ہوتی، آج جب والدین کی یہ قربانیاں یاد آتی ہیں تو رونا آتا ہے اور ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ پاک والدین کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور جنت کی ہر طرح کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے اور اپنی رضاء و خوشنودی نصیب فرمائے اور اس عظیم قربانی کو قبول فرمائے اور راقم کے ساتھ برادران کی تعلیم و تربیت کو بطور صدقہ جاریہ کے ان کے لئے قبول فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

الغرض برادر اکبر نے سات روپیہ راقم کو رخصتی کے وقت دیتے ہوئے یہ کہا

کہ والد صاحب ہم تین بھائیوں کا خرچہ بیس روپیہ مہینہ بھیجتے ہیں، اب تک مشترکہ خرچ میں چلاتا تھا لیکن اب تم الگ رہو گے اس لئے تمہارا حصہ سات روپیہ بنتا ہے جو ایک مہینہ کا خرچ ہے اس سے اپنی ذاتی ضرورت پوری کرنا، انشاء اللہ ہر مہینہ تمہارے اخراجات کے لئے سات روپئے تمہارا حصہ مل جایا کرے گا۔

چنانچہ اس کے بعد راقم نے اس مدرسہ کی چہار دیواری اور منتظمین واساتذہ سے دھیرے دھیرے اپنے کو مانوس کیا اور یہ طے کرلیا کہ اب مجھ کو یہیں رہنا ہے اور محنت ولگن کے ساتھ اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے منزل مقصود تک پہونچنا ہے۔

ابتداءً مدرسہ اشرف العلوم میں دل لگنے کی وجہ

شروع شروع میں اگرچہ چند دنوں اجنبیت وحشت اور تنہائی کا احساس رہا، چونکہ عمر بھی کم تھی اور والدین کے ساتھ برادران بالخصوص برادر اکبر کی شفقتوں سے محرومی کا یہ پہلا سال تھا، لیکن چونکہ وہاں کے اساتذہ میں ایک موقر استاذ حضرت مولانا سراج الحق صاحب قاسمی تھے جو چمپارن کے رہنے والے تھے اور ان کے طفیل اور ان کی برکت سے دوسرے بہت سے طلباء چمپارن کے رہنے والے وہاں زیر تعلیم تھے جن میں ضیاء اللہ، فرحت، رفاق، حاجی مسلم جیسے کچھ نام یاد ہیں، ان کے ہم وطن ہونے کی وجہ سے وہ اس کا ذریعہ بنے اس کے ساتھ مولانا سراج الحق صاحب قاسمی کی شفقت نے بھی بہت کام کیا ماشاء اللہ حضرت مولانا بےنفس آدمی تھے اور چمپارن کے

طلباء کی خدمت بے لوث کیا کرتے تھے، صبح ناشتہ کے وقت اپنے ہاتھ سے اسٹوپ پر روٹی پکاتے تھے اور چمپارن کے بہت سے طلباء کو ناشتہ کراتے تھے۔ راقم کو بھی کئی بار اس سے استفادہ کا موقعہ ملا، اس کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی طلباء چمپارن پر خصوصی نظر رکھتے تھے اور کتابوں کو سمجھانے اور یاد کرانے میں کافی محنت کرتے تھے۔ اس طرح حضرت مولانا سراج الحق صاحب اور چمپارن کے طلباء ابتداءً مدرسہ اشرف العلوم میں راقم کی دلبستگی و دلجمعی کا ذریعہ بنے۔ اللہ پاک حضرت مولانا کو اپنی شایان شان اس کا اجر عطا فرمائے اور دارین کی فلاح کا ذریعہ بنائے۔

مدرسہ اشرف العلوم میں پہلے سال کا قیام

غالباً ۱۹۶۸ء میں جب پہلی مرتبہ مدرسہ اشرف العلوم میں حاضری ہوئی اس وقت مدرسہ ایک مسجد جو محلّہ اشرف علی میں واقع تھی، اس کے گرد و پیش بنے ہوئے چند کمروں میں چل رہا تھا، اس کے ساتھ اسی کے متصل چند کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بلڈنگ بھی تھی جو مطبخ اور اس کے اسٹور اور پرائمری درجات کی درسگاہ کے ساتھ حافظ یٰسین صاحب اور ماسٹر جمیل صاحب کی قیام گاہ بھی تھی۔ حافظ کامل صاحب مطبخ کے ذمہ دار تھے، جو مطبخ کی تمام تر ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد جب مئو آئمہ (الہ آباد) کے کچھ طلباء آئے جس میں ایک اہم نام اشرف علی کا بھی تھا جو مئو آئمہ کے بڑے دین دار صالح متقی مخیّر بزرگ حاجی سعید الدین

صاحب سیٹھ کے برخوردار تھے ایک ساتھ عبد المجید انصار وغیرہ کئی طلباء تھے جن کے لئے اسی بلڈنگ کی بالائی منزل پر ایک کمرہ بنایا گیا جو ان کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی، اس کے علاوہ قاری اسلام صاحب وحافظ اقبال صاحب کے طلباء کی رات کی تعلیم کے لئے بالائی منزل کی کھلی ہوئی چھت بھی استعمال میں ہوتی تھی۔ اور اسی بلڈنگ کے تحتانی حصہ کے ایک کونہ میں چند بیت الخلاء تھے جس سے طلباء واساتذہ اپنی حاجت پوری کرتے تھے۔

مسجد کے اتر طرف ایک چھوٹا سا خام کمرہ تھا اور اس کے سامنے ایک برآمدہ تھا جو ماسٹر جمیل صاحب کی درسگاہ تھی اور اسی کے سامنے ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا، مسجد کے اتر حصہ میں صحن کے کونے پر ایک کنواں تھا جس سے حسب ضرورت پانی نکالا جاتا تھا اور اسی کے متصل گلی میں ایک دروازہ تھا اور دروازہ کے متصل پورب طرف چند غسل خانے تھے، اور ان غسل خانوں کے دکھن طرف ایک حوض تھا جو طلباء و اساتذہ کے علاوہ نمازیوں کے وضوء کے کام آتا تھا اور حوض کے پورب طرف اتر والے کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں مولانا سراج الحق صاحب اور مولانا فیاض صاحب کا قیام تھا، اور اس کے سامنے ایک برآمدہ تھا جو حضرت مولانا فیاض صاحب کی درسگاہ تھی۔ اور برآمدہ کے پورب طرف ایک ہال نما بڑا کمرہ تھا جو دفتر اہتمام کے کام میں استعمال ہوتا تھا۔ حضرت قاری شریف احمد صاحب اسی میں تشریف فرما ہوتے تھے اور وہی ان کی درسگاہ بھی تھی، اور اسی ہال کے متصل اتر طرف ایک کمرہ تھا جو کتب خانہ کے کام میں آتا تھا۔

دفتر اہتمام کے دکھن طرف ایک راستہ تھا جو گیٹ سے نکل کر مین روڈ پر چلا جاتا تھا اور وہی راستہ پچھّم طرف سیدھے مسجد میں جاتا تھا، گویا کہ صدر گیٹ سے جب آپ داخل ہوں گے تو آپ کے سامنے مسجد ہوگی اور اتر طرف دفتر اہتمام ہوگا اور دکھن طرف گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا کمرہ تھا جو ماسٹر لئیق احمد صاحب کی درسگاہ تھی اور اسی کے متصل پچھّم طرف زینہ کے نیچے ایک چھوٹا سا خام کمرہ تھا جس کی دیوار بغیر پلاسٹر کی تھی اور فرش کچا تھا، یہی کمرہ راقم کی قیام گاہ تھی جس میں پہلے سال پورا وقت گزرا، اس کمرہ میں چمپارن کے اور بھی طلباء تھے لیکن کمروں میں طلباء کا وقت صرف کھانے پینے کے وقت ہی گزرتا تھا، باقی تکرار و مطالعہ اور قیلولہ و رات کا سونا مسجد میں ہوا کرتا تھا۔ راقم کے کمرہ کے بغل میں بالائی منزل پر جانے کے لئے ایک سیڑھی تھی اور بالائی منزل پر دو کمرے تھے جو درسگاہ کے کام آتے تھے، مسجد کے پورب اور دکھن والے حصہ میں ایک کمرہ تھا جس میں مولانا وسیم احمد صاحب کا قیام تھا اس کمرہ سے دکھن طرف کونہ میں ایک کمرہ تھا جو حافظ اقبال صاحب استاذ شعبہ حفظ کی درسگاہ تھی جن کو راقم نے پورے سال قرآن کریم کا دور سنایا، اس سے متصل پچھّم طرف حافظ شبیر صاحب کی درسگاہ تھی جو پرائمری کے استاذ تھے، اس درسگاہ کے پچھّم طرف ایک گلی تھی جس میں دروازہ لگا ہوا تھا جو محلّہ اشرف علی کی گلی میں کھلتا تھا جس کے ذریعہ محلّہ کے نمازی آتے جاتے تھے۔

مسجد پنجوقتہ و جمعہ کی نماز کے علاوہ ہمہ وقت تعلیم و تعلم سے مصروف رہتی تھی۔ حافظ یاسین صاحب جو شعبہ حفظ کے استاذ تھے ان کی درسگاہ بھی یہی مسجد تھی ان کے

علاوہ عربی، فارسی کی درسگاہ کے طور پر بھی مسجد کا استعمال ہوتا تھا، نیز طلباء تکرار و مطالعہ اور آرام بھی مسجد ہی میں کیا کرتے تھے۔

مدرسہ اشرف العلوم میں تعلیم کا پہلا سال

راقم اپنا حفظ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے دوران قیام مکمل کر چکا تھا، اس سال حفظ کلام اللہ کا دور کرنا تھا۔ چنانچہ حافظ اقبال صاحب جودھولا پڑا ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے اور پرانے مشاق حافظ تھے، شعبہ تدریس سے بھی زمانہ سے وابستہ تھے، طبعاً انتہائی شریف اور محنتی استاذ تھے، انہی کی درسگاہ میں دور سنانے کے لئے راقم کا نام آیا۔

چنانچہ شروع سے ہی ایک پارہ یومیہ دور سنانا شروع کیا، اس طرح پورے سال میں تقریباً دس بارہ دور سنانے کا موقع میسر آیا اور الحمدللہ قرآن پاک کا حفظ بہت اچھا یاد ہو گیا۔ صبح کی آخری گھنٹی میں ماسٹر جمیل صاحب کے یہاں جا کر اردو کے ساتھ نقل واملاء لکھنے کا معمول تھا، تھوڑی سی ہندی بھی ماسٹر جمیل صاحب نے پڑھایا جو آج بھی کام آرہی ہے، لیکن انگلش کے سلسلہ میں اس وقت عام طور پر طلباء کا ذہن یہ تھا کہ یہ مشکل زبان ہے اور اسلام دشمنوں کی زبان ہے اس لئے اس کے سیکھنے کا مزاج ورجحان نہیں تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے راقم انگلش کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور آج حالات نے جو کروٹ لیا اور انگلش کا ہر طرف بول بالا شروع ہوا حتی کہ مدارس کے نصاب میں

بھی یہ زبان جزوِتعلیم بن کر داخل ہونے لگی تو نہ سیکھنے کا احساس ہونے لگا۔ اگرچہ ہر جگہ ضرورت پوری ہوجاتی ہے لیکن ناواقفیت کا احساس رہتا ہے۔

دھیرے دھیرے جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اساتذہ اور منتظمین سے تعلق و قربت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ مدرسہ کے ناظم حضرت قاری شریف احمد صاحب نے مدرسہ کی ڈاک کی خدمت راقم کے سپرد کی۔ چنانچہ روزانہ صبح کے وقت ایک پارہ کا دور سنانے کے بعد ڈاک لینے کے لئے پوسٹ آفس جانے لگا، مدرسہ سے پوسٹ آفس کی دوری کم وبیش ایک کیلومیٹر تھی، ڈاک لاکر حضرت ناظم صاحب کے سپرد کرتا، وہ تمام خطوط پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے اس کے بعد طلباء واساتذہ کے خطوط میرے سپرد فرمادیتے جس کی تقسیم راقم کی ذمہ داری تھی۔ دوپہر کی چھٹی کے بعد طلباء واساتذہ کے خطوط روزانہ پہونچانے کے بعد کھانا لیتا اور کھانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر آرام کے بعد ظہر کی نماز پڑھتا، پھر درسگاہ پہونچ جاتا۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ مدرسہ کی یہ خدمت پہلے ہی سال میں راقم کے سپرد ہوگئی۔

تذکرہ حضرت قاری شریف احمد صاحب
ناظم مدرسہ اشرف العلوم

اس طرح دھیرے دھیرے حضرت قاری صاحب سے قربت بڑھتی گئی، گنگوہ چونکہ بزرگوں کی جگہ ہے، کثرت سے مہمانوں کی آمد ورفت بھی ہوتی رہتی تھی،

مزارات قدوسی ورشیدی کی زیارت وحاضری کے لئے بھی اکثر مہمان آتے جاتے تھے، چندمہینوں کے بعد حضرت ناظم صاحب نے ان مہمانوں کی خدمت بھی راقم کے سپرد کردی۔ چنانچہ جب کوئی مہمان آتا تو راقم طلب کیا جاتا اور ان مہمانوں کو مزارات پر لے جانا اور واپس لانا راقم کی ذمہ داری ہوتی۔ دھیرے دھیرے آنے والے سالوں میں یہ خدمت بڑھتی گئی تا آنکہ راقم حضرت ناظم صاحب کے خدام میں شمار ہونے لگا۔ حضرت ناظم صاحب بہت ہی بے نفس انتہائی شریف الطبع باوقار سنجیدہ صاحب زہد وتقوی مدرسہ کے بے پناہ مخلص اور طلباء واساتذہ کے لئے بے حد شفیق تھے۔ لباس وضع قطع میں سادگی کے ساتھ اتباع سنت کا اہتمام بہت تھا، مدرسہ کے معاملات میں بے پناہ دیانت داری راقم نے خود دیکھی، مدرسہ کی تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ صبح کی پہلی گھنٹی میں پابندی کے ساتھ قرآن کریم کا اجراء بروایت حفص کراتے تھے، اس کے ساتھ مشق کرانے کا بھی معمول تھا، صبح کی آخری گھنٹی میں نفحۃ الیمن کا درس دیا کرتے تھے، باقی اوقات میں مدرسہ کے انتظامی امور انجام دیتے تھے، شروع شروع میں حساب وکتاب کے لکھنے کا کام بھی خود ہی کیا کرتے تھے، چونکہ دفتری کاموں کو دیکھنے اور لکھنے پڑھنے کے لئے کوئی مستقل آدمی نہیں تھا کچھ دنوں کے بعد منشی عبدالحمید صاحب جو سنسار پور کے رہنے والے تھے وہ جب آ گئے تو حضرت ناظم صاحب کا یہ بوجھ ان کے سپرد ہوجانے کی وجہ سے ہلکا ہوگیا۔ حضرت ناظم صاحب کی بچیاں بڑی تھیں، نرینہ اولاد میں تین لڑکے تھے، طیب، عبید، خالد جن میں سے طیب کی عمر شعور والی تھی، لیکن گھریلو کام کاج میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور عبید

وخالد ابھی کمسن تھے جو کسی ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل نہیں تھے، نتیجۃً راقم کی ذمہ داری بالتدریج بڑھتی گئی، جب مدرسہ کے کاموں کے ساتھ مہمانوں کی خدمت اور گھریلو بہت سارے کام وکاج راقم کے سپرد ہوگئے تو راقم اپنی کم عمری کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب کے گھر کے اندر بھی جانے لگا اور دھیرے دھیرے ایک ایک کرکے درجنوں کام کی ذمہ داری پوری بیدار مغزی اور مستعدی کے ساتھ بروقت انجام دینے لگا جس کی وجہ سے قربت بڑھتی چلی گئی اور گھر کے ایک فرد بلکہ ایک ممبر کی حیثیت سے لوگ جاننے لگے اور طلباء واساتذہ خادم خاص کی حیثیت سے پکارنے لگے۔

نوبت بایں جا رسید کہ تعلیمی سلسلہ کے ساتھ روزمرہ آنے جانے والے مہمانوں کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے مزار پر لے جانا وہاں سے حکیم نھو صاحب کی ملاقات کرانا، اس کے بعد حسب وقت وگنجائش حاجی کامل صاحب کی زیارت کروانا اس کے بعد شاہ عبد القدوس گنگوہی و شاہ ابوسعود کے مزارات کی زیارت کروانا، اخیر میں شاہ ابوالمعالی کے مزار کی زیارت کرواتے ہوئے حضرت ناظم صاحب کے گھر لانا، کھانے سے فارغ کرواکر مہمان خانہ سے بس اڈہ پہونچا کر رخصت کرنا اس کے علاوہ ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، آنے والے مہمانوں کے کھانے کی اطلاع حضرت ناظم صاحب کے گھر کرنا، حسب فرمائش مہمانوں کے لئے گوشت سبزی وغیرہ گھر پہونچانا، حضرت ناظم صاحب کے گھر کے لئے لکڑی کا انتظام کرنا، آٹا پسوانا، دھوبی کے یہاں کپڑا پہونچانا اور لانا، حضرت ناظم صاحب کے پیغامات گھر پہونچانا اور جواب سے مطلع کرنا، اور دیگر چھوٹے بڑے بہت سے کام یہ

راقم اطمینان بخش انداز سے کئی سال تک مسلسل کرتا رہا اور کبھی بھی کسی طرح کی گرانی یا خیانت کا احساس نہیں ہونے دیا، حالانکہ اپنی کم عمری کی وجہ سے کبھی کبھار ضرورت سے زیادہ تھکن بھی ہوجاتی تھی، لیکن اپنے بڑوں کو کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''ہر کہ خدمت کرد مخدوم شد'' کے تحت اللہ نے آج مخدومیت کا سہرا بغیر طلب کے سر پر باندھ دیا جس کی وجہ سے بہتوں کے لئے راقم محسود بن گیا۔

ان ساری خدمتوں کے ساتھ ایک معمول یہ بھی تھا کہ روزانہ حضرت ناظم صاحب عشاء سے قبل کھانے سے فارغ ہوکر عشاء کے بعد مدرسہ کے دفتر میں تشریف لایا کرتے تھے یہ راقم پابندی کے ساتھ عشاء کے بعد خدمت کے لئے روزانہ حاضر ہوتا، اکثر دو تین ساتھی ساتھ ہوا کرتے تھے جن میں سے عمیر پورنوی کا نام آج بھی یاد ہے، ایک ڈیڑھ گھنٹے کے قیام کے بعد جب گھر واپسی ہوتی تھی تو راقم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ روزانہ بلا ناغہ گھر تک پہونچانے کے لئے جایا کرتا تھا، واپسی کے بعد پھر اپنی تعلیم میں مشغول ہوجاتا۔

حضرت ناظم صاحب کی دیانت داری

ایک طویل عرصہ تک مدرسہ اشرف العلوم میں زیر تدریس رہنے کا موقع ملا اور کئی سال تک مسلسل مدرسہ اور گھریلو معاملات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لیکن اتنی طویل مدت میں تقوی و دیانت کے خلاف کوئی بات دیکھنے کو نہیں ملی، مدرسہ

کی تنخواہ کے علاوہ حضرت ناظم صاحب کی اپنی زراعت کے علاوہ پیاز کا کاروبار بھی تھا جس سے گھریلو اخراجات کی تکمیل میں بہت مدد ملتی تھی۔

بارہا اس کی نوبت آئی کہ راقم کو حضرت ناظم صاحب نے بلایا اور بلا کر فرمایا میں سہارنپور جانے والا ہوں جاؤ آپا سے پوچھ کر کے آؤ کہ وہاں سے گھر کے لئے کچھ لانا ہے۔ حضرت ناظم صاحب کی اہلیہ کو گھر کے تمام بچے آپا کہا کرتے تھے، اس لئے راقم بھی ان کو آپا ہی کہا کرتا تھا، اس علاقہ میں والدہ کو آپا کہا جاتا ہے، آپا جواب میں تقریراً یا تحریراً جو کچھ کہتی راقم آ کر حضرت ناظم صاحب سے بتلا دیتا۔ اگر کچھ لانے کی فرمائش ہوتی تو فوراً یہ کہہ کر مجھ کو واپس کرتے کہ جاؤ آپا سے پیسے مانگ کر لاؤ میرے پاس جو پیسے ہیں وہ مدرسہ کے ہیں میں مدرسہ کے پیسے سے ان کا سامان خرید کر نہیں لاؤں گا۔ چنانچہ میں واپس جاتا، ان سے پیسے لے کر آتا اور حضرت ناظم صاحب کے سپرد کرتا، حضرت ناظم صاحب جب واپس آتے تو سامان کے ساتھ پورا حساب مجھ کو بتاتے اور فرماتے کہ جاؤ آپا کو یہ سامان دیدو اور یہ حساب بتا دو۔

کئی بار ایسا ہوا کہ آپا نے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، تو ناظم صاحب نے سامان لانے سے معذرت کر دیا اور مدرسہ کے پیسے سے سامان خرید کر نہیں لائے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ حضرت ناظم صاحب نے راقم کو یہ کہہ کر گھر بھیجا کہ میرے کمرہ میں بارجہ کے اوپر ایک ڈبہ ہے اس میں میرے ذاتی پیسے رکھے ہوئے ہیں اس میں سے اتنے پیسے نکال کر کے لے آؤ۔ چنانچہ میں جاتا اور پیسے واپس لا کر دیدیتا، لیکن الحمدللہ حساب و کتاب میں کبھی بھی ایک پیسہ کی بھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر

حضرت ناظم صاحب کا اعتماد راقم پر اتنا بڑھا کہ دفتر میں بلا کر تجوری کی چابھی مجھ کو دیتے اور فرماتے تجوری کھول کر اس میں ایک بیگ ہے جس میں مدرسہ کے پیسے ہیں اس میں سے اتنے پیسے نکال کر لے آؤ تجوری دفتر کے متصل اس کمرہ میں تھی جو کتب خانہ کے کام میں استعمال ہوتا تھا اور تجوری کی چابھی کبھی بھی راقم کے علاوہ کسی بھی استاد یا طالب علم یا اپنے بچوں کو نہیں دی۔ اس طرح طرفین کا اعتماد مضبوط ہوتا گیا اور قربت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور راقم خوشی خوشی تا قیام مدرسہ کاموں کو انجام دیتا رہا۔

آج نظماء کو لوگ جو چاہے کہیں لیکن حقیقت وہ ہے جو راقم نے اوپر درج کی اس کو ایک زمانہ تک اپنی آنکھوں سے دیکھا، اللہ پاک ان مخلصین کو جزاء خیر عطا فرمائے، ان کی قبروں کو منور فرمائے، ان کے صدقہ جاریہ کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین

پہلے سال میں مدرسہ اشرف العلوم میں موجود اساتذہ کا تذکرہ

راقم جب پہلے سال میں مدرسہ اشرف العلوم حاضر ہوا تو اس وقت شعبہ عربی و فارسی کی تعلیم مختصر المعانی تک تھی اور ان درجات کی کتابوں کو پڑھانے کے لئے جو اساتذہ موجود تھے وہ یہ تھے:

(۱) حضرت مولانا فیاض احمد صاحب (۲) حضرت مولانا سراج الحق صاحب
(۳) حضرت مولانا شمس الدین صاحب (۴) حضرت مولانا وسیم احمد صاحب۔

تذکرہ مولانا فیاض احمد صاحب:

ان چاروں اساتذہ میں حضرت مولانا فیاض احمد صاحب کی حیثیت صدر المدرسین کی تھی اور اس وقت موجود تمام اساتذہ میں علمی و تدریسی اعتبار سے سب سے زیادہ لائق و فائق تھے اور انہی کی تدریسی خدمات کی وجہ سے بہت جلد اس ادارہ کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اور دار العلوم دیوبند و مظاہر علوم کے اساتذہ اپنے متعلقین کے بچوں کو عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے مدرسہ اشرف العلوم کی رائے اور ترغیب دینے لگے۔ حضرت مولانا فیاض صاحب کی درسگاہ لب حوض دفتر اہتمام کے سامنے والے برآمدہ میں تھی آنے والے مہمانان کرام علماء عظام دیر تک ان کے انداز درس سے مستفید ہوتے تھے اور بہت سے کبار علماء حضرت ناظم صاحب سے پوچھتے کہ کہاں سے آپ ان کو پا گئے؟ حضرت مولانا فیاض صاحب کے درس کا انداز منفرد تھا، ہر ایک کتاب کو وہ فنی اعتبار سے پڑھاتے تھے، کتابوں کے پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ طلباء آنے کے بعد عبارت پڑھتے، ان کے سامنے درسی کتاب نہیں ہوتی تھی، صرف طلباء کے سامنے کتابیں کھلی رہتی تھیں، عبارت مکمل ہونے کے بعد مقروءہ عبارت کے مضمون پر عام فہم اور دلنشین انداز میں ایسی فنی تقریر کرتے کہ ہر طالب علم کے ذہن میں ان کی بات اتر جاتی، اس کے بعد اس تقریر کا انطباق عبارت سے کرواتے، اسی کے ساتھ عبارت کا ترجمہ اور تشریح بھی کرتے ہوئے چلتے، مقامات حریری جیسی کتاب ہمیشہ انہوں نے از اول

تا آخر عبارت ترجمہ کے ساتھ لغوی، نحوی وصرفی تحقیق زبانی پڑھائی، کبھی بھی دوران درس کتاب سامنے نہیں رکھی اور طلباء کو ہمیشہ اس کی تاکید کرتے تھے کہ ہر کتاب کی عبارت صحیح پڑھنے کی کوشش کرو اور اس کے بعد مصنف کے کلام کو سمجھو باقی بہت زیادہ قیل وقال میں نہ پڑا کرو، اگر نفس کتاب تم سمجھ گئے تو قیل وقال جب چاہو گے جتنا چاہو گے کر سکو گے۔

لیکن اصل یہ ہے کہ ہر کتاب کی عبارت کے ساتھ مقصود مصنف کو سمجھا جائے، اس لئے خود حضرت مولانا بھی فن کے ساتھ مقصود مصنف اور عبارت کو سمجھانے پر زیادہ زور دیتے تھے اور زیادہ قیل وقال کے نہ قائل تھے نہ خود کرتے تھے، طبیعت میں بہت سادگی تھی، محنت کرنے اور طلباء سے محنت کرانے کے عادی تھے، طلباء کی تعلیم وتربیت پر اور ان کے مستقبل کو تابناک بنانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں جو فنی مہارت حضرت علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری میں دیکھی دوسرے نمبر پر وہی صفات اور انہی کمالات کا حامل حضرت مولانا فیاض احمد صاحب کو پایا، اگر یہ کہا جائے فنی اعتبار سے فنی کتابوں کو پڑھانے میں یہ صدیق ثانی تھے تو غلط نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا کے اندر ایک کمال یہ بھی تھا کہ کسی بڑے سے بڑے عالم سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے اور ان کی آمد پر لب ولہجہ میں یا انداز واسلوب بیان میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، اگر کوئی بڑا سے بڑا استاذ اور عالم ان کے درس میں شریک ہو جاتا تو کبھی سبق بند نہیں کرتے تھے بلکہ اگلی گھنٹی لگنے تک سبق تسلسل کے ساتھ پڑھاتے تھے، چونکہ صلاحیت پختہ تھی، حافظہ مضبوط تھا، مضامین کا

استحضار تھا، مطالعہ پوری عرق ریزی کے ساتھ کرتے تھے اور جو کچھ فرماتے تھے پورے وثوق واعتماد کے ساتھ کہتے تھے، اس لئے کسی کے آنے جانے کا کوئی خوف ان پر کبھی نہیں ہوا۔ البتہ ایک مرتبہ حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دوران درس تشریف لے آئے اور آپ کا درس چل رہا تھا، آپ نے تھوڑی دیر بعد درس بند کر دیا اور بعد میں فرمایا کہ مجھ کو کسی سے ڈر نہیں لگتا سوائے اس بڈھے کے چونکہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور علم کا استحضار بھی بہت ہے۔

تذکرہ اساتذۂ حفظ:

اس وقت شعبہ حفظ دو اساتذہ سے متعلق تھا:

(۱) حافظ اقبال صاحب (۲) حافظ یاسین صاحب اور دونوں اساتذہ اپنے اپنے درجہ کے طلباء کو پڑھانے میں محنتی اور مخلص تھے، حافظ اقبال صاحب تدریس کے ساتھ قریب کی ایک مسجد کے امام بھی تھے، لہٰذا پنجوقتہ نمازوں کے لئے ان کا مسجد آنا جانا ہوا کرتا تھا، لیکن اوقات تعلیم کے علاوہ بعد مغرب وعشاء اپنی درسگاہ میں بلاناغہ حاضر رہا کرتے تھے، رات کا قیام وہ اپنی مسجد میں کرتے تھے، فجر کے بعد وقت تعلیم سے پہلے مدرسہ حاضر ہو جایا کرتے تھے، راقم کو ایک سال تک ان کے کپڑے دھونے پریس کرنے اور مسجد پہونچانے کی سعادت حاصل رہی۔ باوجودیکہ بہت اصرار کے ساتھ وہ صابون کا پیسہ دینے کی کوشش کرتے لیکن راقم نے کبھی نہیں لیا اپنے خرچ کے اسی سات روپئے میں سے استاذ محترم کے کپڑوں کے دھونے کے لئے صابون، نیل، ٹینوپال

خریدتا اور سعادت سمجھ کر خوشی کے ساتھ مدرسہ کے دارقدیم کے حوض پر دھوکر سکھا کر کسی بچہ سے کوئلہ والا پریس مانگ کر اپنے ہاتھ سے پریس کر کے پابندی کے ساتھ ہر جمعہ کی شام کو عصر کے بعد مسجد پہونچا دیا کرتا تھا۔ جب کپڑے لے کر میں پہونچتا تو دھلا ہوا پریس کیا ہوا کپڑا دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور جی بھر کر کے دعاؤں سے نوازتے جس کا اثر یہ ہوا کہ اگلے سال شریف نام کے ایک دھوبی کے یہاں حضرت ناظم صاحب کا کپڑا دھلائی کے لئے دینے اور لینے کے لئے آمد ورفت راقم کی جس گلی سے تھی اس گلی میں شریف دھوبی سے پہلے داہنے ہاتھ پر ایک دھوبی کا مکان تھا جس کا نام تو اب یاد نہیں رہا اس کی دکان پختہ اور کشادہ ہال میں تھی، جہاں دھلے ہوئے اور دھلنے والے کپڑے رکھے رہتے تھے اور اسی ہال میں پریس بھی وہ کیا کرتا تھا، اس نے ایک دن راقم کو بلایا اور بلا کر کہا حافظ جی تم اپنے کپڑے کہاں دھلواتے ہو، میں نے کہا کہ میں خود دھو لیتا ہوں، اس کے جواب میں اس نے کہا حافظ جی ہم سے دھلوالیا کرو، راقم نے کہا میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ دھوبی سے دھلوا کر پہن سکوں، اس نے کہا حافظ جی میں آپ سے پیسے کہاں مانگ رہا ہوں، میں نے تو دھلوانے کے لئے کہا ہے۔ بات آئی گئی ختم ہوگئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اپنی بات کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ایک مرتبہ چند روز کے بعد پھر اس کی نظر راقم پر پڑ گئی اور اپنی پرانی بات دہرانے لگا، تیسری مرتبہ پھر اس کی نظر چند روز کے بعد پڑی پھر اصرار کے ساتھ اپنی بات کہنے لگا، چونکہ شریف دھوبی کا گھر اس کے گھر کے آگے چند قدم کے فاصلے پر بائیں طرف تھا اور اس کے یہاں آنے جانے کا

راستہ اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا، اور جب اس کی نظر پڑتی تو اصرار کے ساتھ اپنی بات کہتا، بالآخر راقم مجبور ہوکر اپنے کپڑے اس کے حوالہ کرنے لگا، ہفتہ میں دو مرتبہ کپڑا بدلتا تھا، ایک جمعہ اور دوسرے دوشنبہ اور ہفتہ میں دو جوڑا کپڑا جمعہ کو اس کو دیتا، چند روز کے بعد وہ کپڑے مجھ کو مل جایا کرتے تھے۔ اس طرح دھوبی کا دھویا ہوا اور پریس کیا ہوا کپڑا کئی سال تک پہنتا رہا جس کی وجہ سے وہ طلباء جو راقم کے حال سے واقف نہیں تھے جو اکثر اپنے ہاتھ سے دھلا ہوا کپڑا پہنتے تھے ان کا خیال میرے بارے میں یہ ہونے لگا کہ یہ بچہ کسی بڑے گھر کا لڑکا ہے، جبھی تو دھوبی سے دھلوا کر کپڑے پہنتا ہے اور ہفتہ میں دو دو مرتبہ کپڑا بدلتا ہے۔

لیکن اس نعمت غیر مترقبہ کے حصول کے بعد بھی اپنا معمول نہیں بدلا اور استاذ محترم کے کپڑے دھونے کی خدمت کو جاری رکھا اور اس طرح اللہ کی مدد شامل حال ہوتی چلی گئی کہ راقم سات روپئے میں اپنی ضروریات اس طرح پوری کرتا رہا کہ کسی کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ بچہ کسی غریب گھرانے کا ہے اور یہ سب اپنے اساتذہ اور بڑوں کی دعاؤں کی برکت تھی جو اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت اور دعاؤں کا ثمرہ تھا۔

حافظ شبیر احمد صاحب ماسٹر جمیل احمد صاحب، ماسٹر لئیق احمد صاحب، حافظ کامل صاحب یہ حضرات شعبہ پرائمری کے اساتذہ تھے۔ البتہ حافظ کامل صاحب کے ذمہ مطبخ کی بھی ذمہ داری تھی، راشن دینا کھانا پکوانا، تقسیم کرنا یہ سارے کام تدریس کے ساتھ بلا شرکت غیرے پوری بشاشت کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

پہلے سال میں جو طلباء وہاں مقیم تھے ان میں علاقائی بچے چند ہی تھے، غالب اکثریت بیرونی بچوں کی تھی جن میں صوبہ بنگال و بہار۔ بہار میں چمپارن، بھاگلپور، گیا، مونگیر، پورنیہ وغیرہ کے طلباء تھے۔ صوبہ بنگال میں مرشدآباد، دیناجپور، ۲۴ پرگنہ وغیرہ کے طلباء تھے۔ لیکن مقامی و بیرونی طلباء بہت محبت و پیار کے ساتھ رہتے تھے، کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا، اساتذہ و منتظمین کی بھی نظر بلا تفاوت سب پر یکساں تھی اور ہر ایک کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ تھا، اساتذہ طلباء کے لئے مخلص تھے اور طلباء اساتذہ کو اپنا استاذ سمجھتے ہر طرح کی خدمت واطاعت کا شوق وجذبہ طلباء میں موجزن تھا، پوری یکسوئی کے ساتھ طلباء اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے۔

لیکن راقم نے ایک بات اس وقت یہ محسوس کی کہ جہاں زیادہ تر طلباء غریب گھرانے کے تھے وہیں بعض طلباء امیر گھرانوں سے بھی تعلق رکھتے تھے، جیسے بھاگلپور کا ایک طالب علم تھا جو امیر گھرانے کا تھا اور اس زمانہ میں بھی جب راقم کو صرف سات روپئے ماہانہ ضروری اخراجات کے لئے ملتے تھے، اس بھاگلپوری طالب علم کا منی آڈر تین سو چار سو کا آیا کرتا تھا لیکن جو طلباء غریب تھے وہ محنتی تھے اور انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور امیر طلباء محروم رہ گئے۔

اس سے اسی وقت سے یہ احساس ہوا کہ غربت کی حالت میں علم میں جو پختگی حاصل ہوتی ہے وہ تمول کی حالت میں حاصل نہیں ہوتی، اس لئے طلباء کو طالب علمی کے زمانہ میں اپنے اخراجات پر کنٹرول رکھنا چاہئے، وسعت کے باوجود احتیاط سے خرچ کرنا چاہئے۔

مدرسہ اشرف العلوم میں قیام کا دوسرا سال

پہلے سال کی حاضری میں چونکہ طبیعت اس ادارہ کے طلباء واساتذہ سے منتظمین و ذمہ داروں سے مانوس ہوچکی تھی اور گھر جیسا ماحول بن گیا تھا، اس لئے دوسرے سال کے سفر میں طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں ہوا، اور پوری بشاست وانشراح کے ساتھ شوال کے مہینہ میں گنگوہ پہونچ گیا اور داخلہ کی کاروائی مکمل کرنے کے بعد سال اول والے کمرہ میں جو زینہ کے نیچے تھا اس میں مقیم ہوگیا۔ دور کی تکمیل چونکہ پہلے سال ہوچکی تھی اس لئے اس سال درجہ فارسی میں داخلہ ہوا، مدرسہ اشرف العلوم کے نصاب کے مطابق درجہ فارسی کے سال میں فارسی کی کتابوں کے ساتھ عربی اول کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں، اس کے علاوہ ایک گھنٹہ قرآن کریم کا اجراء بروایت حفص بھی نصاب کا جزء تھا۔

چنانچہ جب تعلیم شروع ہوئی تو پہلی گھنٹی میں اجراء بروایت حفص حضرت ناظم صاحب کے سپرد ہوا جو پورے سال پابندی کے ساتھ جاری رہا، باقی گھنٹوں میں فارسی کی کتابیں ہوتی رہیں، کچھ مہینوں کے بعد جب فارسی سے مناسبت ہوگئی تو میزان اور نحومیر کا آغاز ہوا اور یہ دونوں کتابیں جب مکمل ہوگئیں تو استاذ نے از اول تا آخر سورۂ فاتحہ کی طرح ایک مجلس میں سنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ راقم نے دونوں کتابیں سنائیں تب جا کر جان بچی۔

ضرب یضرب کی گردان کا واقعہ

لیکن جب میزان کا سبق چل رہا تھا اور صرف صغیر کے بعد صرف کبیر کا نمبر آیا اور میزان کے ختم کے بعد پوری میزان سنانے کی باری آئی تو میزان کا آموختہ سناتے ہوئے کچھ خامیوں کی وجہ سے مولانا وسیم احمد صاحب سنسارپوری جو مدرسہ کے نئے مدرسین میں سے تھے اور میزان انہی کے ذمہ تھی، دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پر اتنی چھڑیا ماریں کہ دونوں ہتھیلیوں میں ورم آ گیا اور کئی روز تک بیت الخلاء میں پانی کا لوٹا دوسرے ساتھی سے پہونچوانا پڑا، لیکن اس قدر مار کھانے کے باوجود استاذ محترم کی جو عظمت تھی وہ باقی رہی اور محنت میں اضافہ ہو گیا۔

سال اول ہی میں تعلیم کے ساتھ خدمت کا دامن وسیع ہو چکا تھا، سال دوم میں اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، لیکن تمام ذمہ داریوں کے ساتھ راقم نے اپنی تعلیم کو متاثر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی دل و دماغ پر یہ چیز آنے دی کہ میں حضرت ناظم صاحب کا خادم ہوں، استاذ محترم میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ بلکہ اور طلباء کی طرح اپنے کو بھی ایک طالب علم سمجھتا رہا اور خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر انجام دیتا رہا اور خارجی وقت میں اسباق کی تحفیظ و تکمیل پر پوری توجہ دیتا رہا۔

دار جدید کی مسجد کی بھرائی کا واقعہ

مدرسہ اشرف العلوم جس مختصر سی بلڈنگ میں چل رہا تھا اور طلباء کا رجوع جس

انداز سے بڑھ رہا تھا، حضرت ناظم صاحب کو اس کی فکر دامن گیر تھی کہ کوئی وسیع اراضی حاصل کر کے ادارہ کو وسیع جگہ پر منتقل کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ناظم صاحب کی تگ و دو اور سعی بلیغ اور کاوش پیہم کی برکت سے تھانہ کے متصل جس زمین پر ایک زمانہ تک گنگوہ کا بس اڈہ بھی قائم رہا، طویل وعریض کئی ایکڑ پر مشتمل زمین حاصل ہوگئی۔ حضرت ناظم صاحب نے اس جگہ پر سب سے پہلے مسجد کی بنیاد ڈالی جب مسجد کی بنیاد کا وقت آیا تو اس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے علاوہ درجنوں اکابر علماء ومشائخ کی حاضری وشرکت ہوئی اور مسجد کی تعمیر کے لئے سب سے پہلا چندہ حضرت شیخ نے حضرت ناظم صاحب کو مرحمت فرمایا۔

جب مسجد کی بنیاد کا کام کرسی تک پہونچ گیا تو اس میں مٹی کی بھرائی کی باری آئی، مٹی بھروانے کے لئے جھوٹا بگی والوں سے حضرت ناظم صاحب نے بات کی تو ان لوگوں نے کثیر رقم کا مطالبہ کیا۔

حضرت ناظم صاحب نے اس کا تذکرہ طلباء سے کیا جن میں راقم بھی موجود تھا، طلباء نے آپس میں مشورہ کر کے حضرت ناظم صاحب سے پیش کش کی اس میں راقم بھی شریک تھا کہ چند پھاوڑے اور کڑاہی کا انتظام اگر آپ کر دیں تو ہم طلباء روزانہ دوپہر میں چھٹی کے بعد یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ پھاوڑے اور کڑاہی کا انتظام کیا گیا اور طلباء نے دوپہر کے وقت میں مٹی کی بھرائی شروع کی اور چند ہفتوں میں کرسی تک مٹی بھر کر مکمل کر دیا، اس خدمت میں راقم بھی روزانہ بلاناغہ شریک رہا۔ اس طرح جب کام مکمل ہو گیا تو حضرت ناظم صاحب طلباء کے بہت مشکور ہوئے اور

اساتذہ نے بھی حوصلہ افزائی کے ساتھ مسرت کا اظہار کیا۔

اس طرح مدرسہ اشرف العلوم میں موجود مسجد کی بنیاد میں اس وقت موجود طلباء کی خدمت ارضی شامل ہے، اللہ سے امید ہے کہ اس خا کی وارضی خدمت کوضرور قبول کر کے ان طلباء کی مغفرت کا ذریعہ بنائیں گے۔

مدرسہ اشرف العلوم میں تیسرے سال کی حاضری

دوسرا سال جب مکمل ہوگیا اور شعبان میں امتحان کے بعد رمضان کی تعطیل ہوگئی تو راقم بھی دیگر طلباء کے ساتھ اپنے وطن چمپارن کے لئے روانہ ہوگیا، پورا رمضان والدین کے ساتھ گھر پر گزارا اور عید کے بعد حسب معمول تیسری مرتبہ پھر مدرسہ اشرف العلوم میں حاضری ہوئی۔ اس سال جب پہونچا تو ہدایۃ النحو کی جماعت میں داخلہ ہوا۔ داخلہ کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ راقم حسب معمول پرانی خدمتوں کے ساتھ جو حضرت ناظم صاحب کی طرف سے راقم کے حوالہ تھیں تعلیم میں منہمک ہوگیا، اس سال راقم نے بعض کتابوں کا تکرار شروع کیا جس میں رفقاء درس بہت دلچسپی سے حصہ لیتے رہے، شرکاء درس میں جو تکرار میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے، ایک نام وارث پورنوی کا یاد ہے جو پورنیہ کے رہنے والے تھے، صوفی منش انسان تھے، تکرار کے دوران اگر کوئی ساتھی کوئی غیر درسی بات شروع کرتا تو وہ اس پر فوراً بریک لگا دیتے تھے اور اگر تین مرتبہ منع کرنے کے باوجود وہ نہ رکتا

تو استغفر اللہ پڑھتے ہوئے تکرار سے اٹھ جایا کرتے تھے، اور پھر جب سارے رفقاء درسی باتوں میں مصروف ہوتے تو وہ واپس آجایا کرتے تھے، کچھ شک کے بھی مریض تھے جس کی وجہ سے وضوء میں کافی وقت ان کا لگتا تھا اور غسل بھی بار بار کیا کرتے تھے، قطرہ کے شبہ کی وجہ سے بار بار غسل کرتے اور کپڑا دھوتے۔

اس سال کا قیام مدرسہ کے احاطہ میں موجود مسجد سے متصل اتر والے کمرہ میں تھا جس کی دیوار اور زمین خام تھی، کمرہ کے سامنے ایک مسقّف فرش تھا جو ماسٹر جمیل صاحب کی درسگاہ تھی۔

بہت ساری خدمتوں کے ساتھ مدرسہ میں موجود مسجد میں جمعہ کے دن کسی ساتھی کو لے کر رومال پھیلا کر مسجد کے لئے چندہ کرنا راقم کے ذمہ تھا، جس کو بحسن وخوبی کئی سال تک انجام دیتا رہا، جمعہ کی نماز کے بعد رومال میں موجود پیسہ دفتر اہتمام میں لے جا کر حضرت ناظم صاحب کے سامنے شمار کرکے ان کے حوالہ کردیتا۔

دو سال پہلے جس مسجد کا کام دار جدید کے احاطہ میں شروع ہوا تھا اس کی تعمیر بھی کافی حد تک مکمل ہوگئی اور اس مسجد کے دکھن طرف سات آٹھ کمرے بھی تعمیر ہوگئے۔ چنانچہ آنے والے سال میں تعلیم کا آغاز بھی وہاں ہوگیا اور معتد بہ مقدار میں طلباء کی رہائش بھی شروع ہوگئی، لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے جن کمروں میں طلباء کی رہائش تھی انہیں کمروں کو درسگاہ بنادیا گیا۔

حضرت ناظم صاحب پورے خلوص اور تندہی کے ساتھ تعمیری کاموں میں مصروف رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں مدرسہ اشرف العلوم کی جدید عمارت

قابل درس واقامت بن گئی اور مسجد میں پنج وقتہ نماز شروع ہوگئی اور راقم کا تین سال تو مدرسہ کی پرانی عمارت میں گزرا، لیکن چوتھے سال میں چند ہفتوں کے بعد دار قدیم سے دار جدید ہجرت کرنی پڑی۔

قبل ازیں کہ ہجرت کا سبب عرض کروں راقم یہ بتا تا چلے کہ دوسرے سال جب مدرسہ میں حاضری ہوئی اس وقت برادر اکبر کی آزاد مدرسہ ڈھاکہ میں بحیثیت مدرس تقرری ہو چکی تھی جس کے لئے واسطہ مولانا محمد عالم صاحب قاسمی بنے اور راقم کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری والد صاحب سے کہہ کر خود لے لی۔ چنانچہ دوسرے سال راقم کے اخراجات میں دو روپیہ کا اضافہ ہوا اور پورے سال دس روپیہ ماہانہ کے حساب سے خرچ ملتا رہا، تیسرے سال میں اس میں دو روپئے کا اور اضافہ ہوا اور بارہ روپئے کے حساب سے ماہانہ خرچ ملنے لگا۔ اس طرح پورا سال ذاتی اخراجات کے لئے بارہ روپیہ ملتے رہے۔ راقم اپنی ضروریات بمشکل تمام طبعی تقاضوں کو دبا کر بغیر کسی گلہ اور شکوہ کے اسی سے پوری کرتا رہا۔ ٹھیلوں پر موسم کے اعتبار سے بہت سی چیزیں ایسی نظر آتی تھیں جس کی طرف دل لپکتا تھا لیکن جیب خالی ہونے کی وجہ سے صبر کا دامن تھامنا پڑتا تھا۔

الحمد للہ اس انداز تربیت سے یہ مزاج بن گیا کہ پاؤں اتنا ہی پھیلاؤ جتنی بڑی چادر ہو، لہٰذا قرض لینے کی عادت کبھی نہیں بنائی، آج بھی اتنا ہی کام کرتا ہوں جتنی جیب میں گنجائش ہوتی ہے اور قرض سے حتی الامکان گریز کرتا ہوں، اسی کے ساتھ چیزوں کی لالچ وطمع اور ہوس دل سے نکل گئی، آج بھی مزاج یہی ہے کہ کسی کی اچھی

گاڑی اچھا مکان، اچھا کپڑا، اچھا کھانا دیکھ کر کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ یہ چیز میرے پاس بھی ہوتی۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حسد کی بیماری سے بھی راقم بچپن ہی سے محفوظ ہو گیا، چونکہ جب کسی کی کوئی نعمت دیکھ کر اپنے پاس ہونے کی خواہش اور طلب ہی ختم ہو گئی تو حسد کا دروازہ بند ہو گیا۔

لیکن اس کی برکت یہ ہوئی کہ بعد میں اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا اور انعامات کی ایسی بارش ہوئی کہ ہر لائن کی نعمتوں کی وجہ سے محسود بن گیا، جبکہ ان نعمتوں کی آمد میں فضل خداوندی کے ساتھ اپنے بزرگوں کی دعائیں، اساتذہ کی خدمت، والدین بالخصوص والدہ مرحومہ مغفورہ کی دلی دعائیں شامل حال رہیں۔

مدرسہ اشرف العلوم میں چوتھے سال کی حاضری

راقم جب چوتھے سال پہونچا تو کافیہ کی جماعت میں داخلہ ہوا اور حسب معمول قیام مدرسہ اشرف العلوم کے دار قدیم میں رہا، حالانکہ اس سال اکثر طلباء دار جدید منتقل ہو چکے تھے اور عربی فارسی کے دو اہم استاذ حضرت مولانا فیاض احمد صاحب اور حضرت مولانا سراج الحق صاحب کا قیام بھی دار جدید کی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ عربی، فارسی کی تعلیم بھی دار جدید میں شروع ہو گئی تھی، لیکن راقم دار قدیم ہی میں مقیم تھا۔ چند مہینوں کے بعد ایک مرتبہ حضرت مولانا فیاض صاحب کی نظر راقم پر

پڑ گئی، انہوں نے بلا کر انتہائی سخت لب ولہجہ میں ڈانٹا اور فرمایا کہ زندگی بھر خدمت ہی کرتے رہو گے یا پڑھو گے بھی، جاؤ ابھی فوراً بوریا بستر اٹھا کر دار قدیم سے دار جدید میں آجاؤ اور یہیں رہو اور محنت سے پڑھو۔

راقم حضرت مولانا کے حکم کو ٹال نہیں سکا، اپنے سامان کے ساتھ دار جدید منتقل ہو گیا جب اس کی اطلاع حضرت ناظم صاحب کو ہوئی تو انہوں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ راقم دار جدید کس کے کہنے پر منتقل ہوا ہے اور کیوں منتقل ہوا ہے۔ صراحۃً پوچھنے کے باوجود حضرت ناظم صاحب کو راقم نے کچھ نہیں بتایا بلکہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ اب میں دار جدید ہی میں رہوں گا۔

چنانچہ دار جدید میں آنے کے بعد اگرچہ مفوضہ خدمت جو ماضی میں راقم کرتا رہا اس کو انجام دیتا رہا، لیکن پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی، بالتدریج خدمت کے کاموں میں تخفیف کرتا چلا گیا، اگرچہ حضرت ناظم صاحب کی خواہش یہ تھی کہ میں دار قدیم ہی میں ابھی ایک دو سال رہوں، چونکہ دفتر اہتمام دار قدیم ہی میں تھا اور حضرت ناظم صاحب کی صبح وشام کی نشست بھی دار قدیم ہی میں تھی، لیکن ان کی طبیعت اور مرضی کے خلاف اپنا قیام دار جدید میں طے کر لیا اور حضرت مولانا فیاض صاحب کے حکم کو مسترد کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دار جدید کے کمرہ نمبر (۱) میں مختلف علاقوں کے طلباء تھے اسی میں قیام طے پایا، کمرہ (۲) میں مرشد آباد، چوبیس پرگنہ وغیرہ کے طلباء تھے اور مولانا وسیم احمد صاحب سنسار پوری کی وہی درسگاہ بھی تھی۔ کمرہ نمبر (۳) میں گیا، اور مونگیر کے طلباء تھے اور وہ مولانا شمس الدین صاحب کی درسگاہ بھی تھی۔ کمرہ نمبر (۴)

میں بھی مونگیر وغیرہ مختلف اضلاع کے طلباء تھے اور حضرت مولانا سراج الحق صاحب کی درسگاہ بھی تھی۔ کمرہ نمبر (۵) میں چمپارن کے طلباء تھے اور صبح کی آخری گھنٹی میں حضرت ناظم صاحب کی درسگاہ بھی تھی۔ کمرہ نمبر (٦) زینہ کے نیچے تھا، کمرہ بھی بہت چھوٹا تھا، وہ حضرت مولانا فیاض احمد صاحب کی قیام گاہ تھی۔ کمرہ نمبر (۷) میں چمپارن کے طلباء تھے اور حضرت مولانا سراج الحق صاحب کا قیام بھی اسی کمرہ میں تھا۔ کمرہ نمبر (۸) اور کمرے کے مقابلے میں قدرے چھوٹا کمرہ تھا، اس میں گجرات کے طلباء مقیم تھے اور کمرہ نمبر (۹) سب سے بڑا کمرہ تھا اور اس وقت دار جدید میں موجود یہ آخری کمرہ تھا، اس میں صرف پورنیہ کے طلباء مقیم تھے۔ حضرت مولانا فیاض صاحب کی درسگاہ کمرہ نمبر (۵) کا باہری حصہ برآمدہ تھا جس میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا، تپائی لگی ہوئی تھی، طلباء اپنی اپنی گھنٹیوں میں وہیں پہونچ کر درس لیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا دیوار کے سہارے اتر رُخ بیٹھا کرتے تھے اور طلباء کی تپائیاں سامنے کے ساتھ پورب پچھّم ہوا کرتی تھی، جب آپ سامنے دیکھتے تو مسجد کا کھلا ہوا صحن اور مدرسہ کا پورا گراؤنڈ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا اور جب داھنی طرف دیکھتے تو پورب طرف کمرہ (۹) کے ساتھ باؤنڈری تک نگاہ ہوتی تھی اور جب بائیں طرف دیکھتے تو کمرہ نمبر (۱) اور اس سے متصل روڈ پر جانے والے چھوٹے دروازہ تک نگاہ ہوتی تھی۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر جب درس کے لئے بیٹھ جاتے تو چھٹی کے بعد ہی اٹھا کرتے تھے بیچ میں چائے وغیرہ کی کوئی عادت نہیں تھی۔ البتہ پان کا معمول تھا، وہ کوئی طالب علم کمرہ سے لگا کر لا کر دے دیا کرتا تھا،

آپ کے اس عمل کی وجہ سے دوسرے اساتذہ بھی گھنٹیوں کے بیچ میں بہت اضطراری حالت ہی میں نکل پاتے تھے اگر کوئی استاذ استنجے کے لئے جاتا بھی تو بعجلت ممکنہ مختصر وقت میں اپنی حاجت سے فارغ ہوکر درسگاہ میں واپس آجاتا۔

اساتذہ وطلباء کی تعلیم وتربیت پر اتنی سخت نگاہ تھی اور اس قدر سخت داروگیر فرماتے تھے کہ ان کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب تعلیمی امور سے مکمل مطمئن و بےفکر ہوکر صرف انتظامی امور میں لگے رہتے تھے، تعلیم وتربیت کا پورا نظام اور اس کا کنٹرول حضرت مولانا نے اتنا مضبوط ومستحکم بنا دیا تھا کہ ایک منٹ بھی طالب علم ہو یا استاذ ضائع کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتا تھا۔

الغرض چوتھا سال پوری یکسوئی کے ساتھ اور دوسرے کاموں کی تخفیف کے ساتھ دارجدید میں قیام کے دوران گزرا اور الحمدللہ پوری محنت اور جانفشانی کے ساتھ زیادہ وقت تکرار ومطالعہ میں لگنے لگا۔

مدرسہ اشرف العلوم میں پانچواں سال

اشرف العلوم کے قیام کا تیسرا سال مکمل کرکے راقم جب وطن گیا تو پہونچنے کے چند دنوں کے بعد برادر اکبر گھر پر آئے اور انہوں نے پورے اخذ وبطش اور داروگیر کے ساتھ امتحان لیا اور اپنے انداز سے زجر وتوبیخ بھی کی، اس کے بعد راقم نے دل ہی دل میں یہ طے کرلیا کہ اب آئندہ سال شعبان میں گھر نہیں آؤں گا، جب

شرح جامی پڑھ لوں گا تبھی آؤں گا۔

چونکہ آزاد مدرسہ میں برادر اکبر ہدایۃ النحو اور کافیہ تک تعلیم دیتے تھے تو دماغ میں یہ بات آئی کہ یہاں تک چونکہ وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں اس لئے امتحان لے رہے ہیں اور جب شرح جامی پڑھ کر آؤں گا تو اس درجہ کی کتابیں چونکہ انہوں نے پڑھائی نہیں ہیں اس لئے میرا امتحان نہیں لے پائیں گے۔

چنانچہ اسی سوچ کے تحت کافیہ کا سال جب پورا ہوا اور شعبان میں چھٹی ہوئی تو راقم رمضان میں مدرسہ ہی پر مقیم رہ گیا اور جب شرح جامی کا سال پورا کر کے گھر پہونچا تو واقعۃً برادر اکبر نے امتحان نہیں لیا اور نہ ہی اس کے بعد بحیثیت ممتحن سامنے بیٹھے۔ بہرحال جب حضرت ناظم صاحب کے اہل خانہ کو بالخصوص آپا کو یہ معلوم ہوا کہ راقم اس سال گھر نہیں جائے گا تو گھر والے بہت خوش ہوئے اور رمضان میں میرے لیے تراویح سنانے کا انتظام آپا نے اپنے گھر ہی میں کر دیا۔ چنانچہ پردہ کے ساتھ پورے رمضان حضرت ناظم صاحب کے گھر پر تراویح سنانے کا موقعہ ملا اور اس کے ساتھ حضرت ناظم صاحب کے گھر اور مدرسہ کی خدمت بھی انجام دیتا رہا۔ جب عید کے بعد مدرسہ کھلا داخلہ شروع ہوا تو راقم کا داخلہ شرح جامی کے سال میں ہوا۔ داخلہ کے بعد جب تعلیم شروع ہوئی تو شرح جامی حضرت مولانا فیاض صاحب کے یہاں گئی جو راقم کی ان کے یہاں پہلی کتاب تھی اور ان کی درسگاہ میں بیٹھنے اور درسی استفادہ کا پہلا سال تھا۔ جب اسباق شروع ہوئے تو حضرت مولانا نے شرح جامی کا درس شروع فرمایا اور ٹھیک علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری کے انداز ولب ولہجہ میں فنی اعتبار سے شرح جامی کا درس دیا۔ درس کا

انداز بہت ہی پُر مغز اور پر کشش اور دلنشیں ہوا کرتا تھا۔ راقم نے سبق کی کاپی بھی لکھنا شروع کیا اور اس کو بڑی محنت سے عصر سے مغرب تک جب عموماً طلباء سیر وتفریح کے لئے نکلا کرتے تھے، کسی گوشہ میں بیٹھ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اس کو دماغ میں اتارتا اور یاد کرتا۔ چونکہ اس وقت تکرار کا مزاج یہ تھا کہ انھیں مکررین کا تکرار مقبول ہوتا تھا اور طلباء شرکت کرتے تھے جو استاذ کے پڑھائے ہوئے انداز ولب ولہجہ میں تکرار کراتا تھا۔

اگرچہ راقم کی جماعت میں اکثر کتابوں کی عبارت خوانی اور تکرار کے لئے راقم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا، تاہم اس وقت کے مزاج کے مطابق بالخصوص شرح جامی کے تکرار کے لئے راقم کو زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ شرح جامی کے ساتھیوں میں محمد حسین مظفر پوری، خلیل مونگیری، غفران گنگوہی جیسے چند نام یاد رہ گئے ہیں۔

تذکرہ حکیم غفران

غفران یہ حکیم لیاقت صاحب کے لڑکے تھے، جن کا مکان اس مسجد کے قریب تھا جہاں حضرت ناظم صاحب پنج وقتہ نماز ادا کیا کرتے تھے، حکیم صاحب کا یہ اکلوتا لڑکا تھا بہت شوق سے اس کو عالم بنا رہے تھے، لیکن خوشحالی اور پیسوں کی زیادتی کی وجہ سے پڑھنے سے دلچسپی بہت کم تھی، لیکن ساتھیوں سے لگاؤ بہت اچھا رکھتا تھا اور حکیم صاحب کی عدم موجودگی میں دواؤں کی فروختگی سے حاصل شدہ پیسوں کا زیادہ حصہ طلباء اور اپنے ساتھیوں پر خرچ کیا کرتا تھا۔

دارالطلباء قدیم کی وہ عمارت جس میں مطبخ قائم تھا اس کے سامنے کامل نام کا ایک دکاندار تھا جو پلنگ توڑ نام کی مٹھائی بناتا تھا، غفران اکثر پلنگ توڑ خرید کر ساتھیوں کو کھلایا کرتا تھا۔ طبعاً بہت خوش مزاج تھا، ساتھیوں سے اکثر ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔

نورالانوار کے سال میں نورالانوار ایک نئے استاذ کے پاس گئی جن کی تقرری اسی سال ہوئی تھی، جن کا نام مولانا رئیس الدین بجنوری تھا، ان کا تکیہ کلام ''گویا کہ'' تھا۔ دوران درس وہ ''گویا کہ'' لفظ کا استعمال ضرورت سے زیادہ کثرت سے کیا کرتے تھے۔ ایک دن نورالانوار کے سبق میں استاذ محترم نے لفظ ''گویا کہ'' کا استعمال ایک منٹ میں ستر مرتبہ کیا، غفران نے نورالانوار کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ آج استاذ محترم نے سبق کے دوران ایک منٹ میں ستر مرتبہ لفظ ''گویا کہ'' استعمال کیا۔ کسی طالب علم نے وہ حاشیہ مولانا رئیس الدین صاحب بجنوری کو دیکھا دیا، مولانا نے بلا کر بہت ڈانٹا۔

راقم سے بہت مانوس اور بے تکلف تھا، سہارنپور چلنے کی اور سنیما دیکھنے کی سیکڑوں مرتبہ اس نے پیش کش کی لیکن ہر مرتبہ راقم اس سے معذرت کرتا رہا اور اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کر سکا۔ چونکہ راقم طالب علمی کے زمانہ میں صوفی منش مانا جاتا تھا، اس لئے ممکن ہے کہ کچھ ساتھیوں نے اس کو بہکا کر اس کام کے لئے اکسایا ہو، لیکن راقم ہر مرتبہ اس سے یہ کہتا کہ جتنا پیسہ تم سہارنپور آنے جانے اور سنیما دیکھانے میں خرچ کروگے اتنا پیسہ مجھ کو یہیں دیدو میں اپنی دوسری ضرورت اس سے پوری کرلوں گا تم کو اس کا ثواب بھی ملے گا اور ہم دونوں گناہ سے بھی بچ جائیں گے، لیکن وہ اپنے اسی پیشکش پر بضد تھا لیکن کبھی وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔

راقم جس چیز کی وجہ سے محفوظ رہا وہ صلحاء جیسا ظاہری لباس تھا۔ راقم نے غفران سے ہر مرتبہ کہا کہ میں ٹوپی اتار نہیں سکتا، کرتا پائجامہ بدل نہیں سکتا اور اس لباس میں، میں سینما ہال جا نہیں سکتا، بعد میں جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعاء سامنے آئی:

اللهم اجعل سريرتی خيراً من علانيتي واجعل علانيتي صالحاً.

اور علامہ سید احمد طحطاوی کی وہ عبارت دیکھی جو طحطاوی علی المراقی میں ہے:

الظاهر عنوان الباطن اور الظاهر يؤثر على الباطن.

تب یقین ہو گیا کہ ظاہر کا یقیناً اثر باطن پر پڑتا ہے۔ اسی لئے ظاہر کو صلحاء کی وضع کے مطابق رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے انسان بہت سے گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

زمانہ طالب علمی سے آج تک راقم نے سینما ہال کا دروازہ نہیں دیکھا اور نہ ہی غنا و مزامیر سے کبھی کوئی دلچسپی رہی، البتہ ایک مرتبہ:

گنگوہ کا ایک دلدوز واقعہ

ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ آج تک راقم خود بھی نہیں سمجھ پایا۔ شرح جامی یا مختصر المعانی کا سال تھا، گرمی کا موسم تھا، کئی روز سے سرکس مدرسہ کے غربی جانب اور روڈ کے اس پار ایک خالی زمین میں لگا ہوا تھا، جو رات میں اکثر تماشا بینوں کے لئے

کھولا جاتا اور اونچائی پر لگائے گئے مائک پر مختلف انواع کے گانے بھی بجتے تھے، انہی ایام میں ایک دن راقم وضوء کر کے عشاء کی نماز میں جیسے شامل ہوا چند منٹ کے بعد ایک نظم مائک پر شروع ہوئی، اس میں مزامیر کے بجائے ہر شعر کے اخیر میں صرف گھنٹی جیسی آواز تھی، اس نظم کا پہلا شعر تھا ۔

بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا

جس ظالم نے تڑپایا اسی پہ مجھ کو پیار آیا

پڑھنے کا انداز اتنا دلدوز تھا کہ اس کا اثر راقم کے قلب پر فوراً پڑ گیا۔ مائک کی آواز اتنی تیز اور قریب تھی کہ کان بند کرنے کے باوجود صاف سنائی دے رہا تھا، اس نظم کے پہلے شعر کو سنتے ہی دل پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ فوراً گریہ شروع ہو گیا اور پوری نماز گریہ میں گزری، نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب طبیعت بحال ہوئی تو نماز کا اعادہ کیا اور گرمی کی وجہ سے فرض کے بعد کی سنت دارالاقامہ کی چھت پر ادا کیا، اس کے بعد ساتھیوں سے اس نظم کے پڑھنے والے کا نام پوچھنا شروع کیا تو ایک ساتھی نے اس کا نام محمد رفیع بتایا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا نام سنا، آگے مزید نہ کوئی تفصیل میں نے پوچھی نہ اس نے بتلایا۔

دوسرا واقعہ

کچھ دنوں کے بعد راقم اس نظم کو بھول گیا، تقریباً ایک سال گزر گئے ایک دن کمرہ نمبر (۵) میں جب مقیم تھا تو دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر قیلولہ کی تیاری

کرر ہا تھا کہ اچانک روڈ کے اس پار ایک ریڈیو بنانے والے کی دکان پر ریڈیو چالو ہوا جس پر یہی نظم پھر شروع ہوئی اور پڑھنے والا بھی وہی پرانا شخص تھا نتیجۃً پرانا زخم پھر تازہ ہو گیا اور پرانی کیفیت عود کر آئی اور کئی روز تک دل ودماغ پر اس کا اثر رہا۔

تیسرا واقعہ

اسی سال یا اس کے اگلے سال گنگوہ سے چند کیلو میٹر کے فاصلہ پر گیہوں کی وصول کے لئے ایک ساتھی کے ساتھ شام کے وقت پیدل جا رہا تھا، راستہ میں ایک بھینس کا چرواہا کئی بھینسوں کو گھر واپس لے جا رہا تھا اس کے ہاتھ میں ایک ریڈیو تھا جس سے کچھ بجنے کی آواز آرہی تھی، جب اس کے قریب پہونچا تو وہی پرانی نظم اور وہی پرانا پڑھنے والا پھر کیا تھا دل کی وہی پرانی کیفیت بن گئی نوبت باینجا رسید کہ حال دل کچھ ایسا دگرگوں ہوا کہ کسی وجہ سے چرواہے کی بھینس بھاگنے لگی، چرواہا اس کی نگہبانی کے لئے اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ راقم بھی اپنی محویت میں چرواہے کے پیچھے کافی دور تک دوڑتا رہا اور اس نظم کو سنتا رہا، اس بار بھی کئی روز تک دل پر اس کا اثر رہا، پھر اس کے بعد سے آج تک کہیں اس کلام کو سننے کی نوبت نہیں آئی۔

قوالی کی سماعت کا واقعہ

گنگوہ میں رجب کے مہینہ میں حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہی کے

مزار پر کئی روز پر مشتمل پُر ہجوم عرس لگتا ہے جس میں ملک کے مختلف صوبوں سے ہر نوع وجنس کے افراد شرکت کرتے ہیں اور بلا تفریق مذہب وملت بڑا مقدس میلہ تصور کیا جاتا ہے۔ تالاب کے کنارے ہر نوع کے کھیل کود کے ساتھ مختلف انواع کی دکانوں سے مزار کا پورا خطہ سج ڈھج جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ قوالوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی جمع ہوتی ہے جو حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مزار کے ارد گرد جمع رہتی ہے اور روزانہ وقت مقررہ پر کئی گھنٹے کی قوالی بھی ہوتی ہے جس میں صوفی منش خرقہ پوشوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے۔ قال کے ساتھ حال اور وجد وتواجد کا منظر بھی خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس کے ساتھ ایک دن عرس کے ایام ہی میں سجادہ نشیں حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہی کی گدڑی اور ٹوپی جو آج تک محفوظ ہے زیب تن کر کے ہاتھی پر بیٹھ کر دورویا قطار میں موجود حاضرین کو زیارت کرواتے ہیں جس کی زیارت کے لئے دور وقریب سے آنے والے مرد وعورت کا بڑا مجمع موجود ہوتا ہے، بہت شوق ومحبت اور عقیدت کے ساتھ لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں، یہ منظر سجادہ نشیں کے مکان سے شروع ہوتا ہے اور حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مزار پر ختم ہوجاتا ہے۔

ان سارے پروگرام میں جہاں بہت سے لوگ عقیدت ومحبت کے ساتھ آتے ہیں وہیں بہت سے لوگ تماشائی بن کر بھی حاضر ہوتے ہیں۔ مدرسہ اشرف العلوم میں قیام کے دوران پہلے ہی سال سے کئی سال تک راقم کی ڈیوٹی حضرت ناظم صاحب نے عرس میں شرکت کرنے والوں کی نگرانی کے لئے لگائی۔ چنانچہ روزانہ

رات میں نگرانی کے لئے راقم پورے عرس گاہ کا چکر لگا تا اور چکر لگاتے ہوئے قوالی کی محفل میں بھی پہو نچتا۔

پہلی ہی مرتبہ محفل سماع اور قال وحال اور وجد وتواجد کا قلب پر ایسا اثر ہوا کہ اسی وقت سے قوالی سے مناسبت پیدا ہوگئی اور سماع سے قلب ودماغ ایسا محظوظ ہوا کہ سماع کے ساتھ ایک طویل عرصہ کے بعد پرانے فارسی کے کلام جو عموماً پہلے زمانہ میں قوالی میں پڑھے جاتے تھے، راقم نے خود پڑھنا شروع کر دیا اور اسی دلچسپی کے ساتھ ایک طویل زمانہ تک پڑھتا رہا جس کے کچھ اشعار آئندہ کے سطور میں کسی مناسب موقعہ سے سپرد قرطاس کئے جائیں گے۔

بہر حال پانچواں سال بھی بہت عافیت کے ساتھ پورا ہوگیا۔ شعبان میں جب چھٹی ہوئی تو راقم گھر کے لئے روانہ ہوا، گھر پہو نچنے کے بعد والدین کی آغوش محبت میں رہنے لگا، جب رمضان قریب آیا تو بڑوں نے تراویح میں قرآن پاک سنانا مادھو پور مدھو مالت ضلع چمپارن میں طے کیا جہاں پورا رمضان راقم نے گزارا، ایک ختم کرنے کے بعد دوسرا ختم حضرت مولانا محمد عالم صاحب قاسمی کے اصرار وخواہش پر کیا۔ اس طرح رمضان المبارک کے ایام مکمل ہوگئے اور عید کے بعد مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ آنے کی تیاری شروع ہوگئی۔

مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں چھٹا سال

حسب سابق عید کے چند روز کے بعد مدرسہ اشرف العلوم کے لئے روانہ ہوا

اور وہاں پہونچ کر مختصر المعانی کی جماعت میں داخلہ لیا، داخلہ کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد جب باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا تو اس سال کی کتابوں میں مختصر المعانی حضرت مولانا فیاض احمد صاحب کے سپرد ہوئی، حضرت مولانا نے مختصر المعانی پوری عظمت اور ذوق وشوق کے ساتھ ہم سب کو پڑھایا، پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ راقم عبارت پڑھتا، حضرت مولانا مقروءہ عبارت پر مشتمل مضمون کا نچوڑ دلنشیں انداز میں طلباء کے سامنے پیش فرماتے، اس کے بعد کتاب سے اس مضمون کا انطباق کراتے اور مشکل الفاظ کی تشریح عام فہم زبان میں کرتے جاتے۔

عموماً طلباء کو حضرت مولانا کے یہاں کتابوں کے جانے کا انتظار رہتا تھا اور جب کبھی کسی کتاب کا نام حضرت مولانا کی گھنٹیوں کے خانہ میں طلباء پاتے تو مسرت وخوشی سے جھوم جایا کرتے تھے، چونکہ حضرت مولانا کے پڑھانے کا اسلوب وانداز اتنا نرالا تھا کہ ہر طالب علم اپنی کتاب ان سے پڑھنے کا مشتاق رہتا تھا، ان دنوں تین امتحانات ہوا کرتے تھے (۱) سہ ماہی (۲) ششماہی (۳) سالانہ۔

سہ ماہی اور ششماہی امتحان اکثر موجود اساتذہ ہی لیا کرتے تھے اور یہ دونوں امتحانات تقریری وتحریری دونوں ہوتے تھے، اساتذہ پرچہ بنا کرلاتے، طلباء سوال لکھتے اس کے بعد مدرسہ کی طرف سے دیئے گئے کاغذ پر جواب لکھتے اور سالانہ امتحان میں اکثر دار العلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر علوم کے اساتذہ تقریری امتحان کے لیے آتے تھے۔ سہ ماہی امتحان تک مختصر المعانی کے ستر صفحات ہوئے اور سہ ماہی سے ششماہی تک ڈھائی سو صفحات ہوئے اور سالانہ امتحان تک تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحے کی

کتاب بحسن وخوبی مکمل ہوگئی۔ اکثر کتابوں کا تکرار راقم ہی کے ذمہ تھا، ششماہی امتحان کے موقعہ سے امتحان سے ایک دن قبل ساری کتابوں کا تکرار مکمل کرادیا، ایام امتحان میں طلباء ازخود مطالعہ کیا کرتے تھے۔

مختصر المعانی کے ڈھائی سو صفحے کا تکرار راقم مکمل کراچکا تھا اور رات میں پورے ڈھائی سو صفحے کا مطالعہ بھی کیا، اس کے باوجود کل ہوکر جب مختصر المعانی کے امتحان کے لئے جانا تھا اور مختصر کے اہم مضامین کو ذہن میں لاکر دھرانا چاہا تو پوری کتاب ذہن سے غائب ہوگئی۔

راقم نے اس کی شکایت حضرت مولانا فیاض صاحب سے کی تو آپ نے یہ کہہ کر ڈانٹ کر بھگا دیا کہ ابھی تم سمندر میں تیر رہے ہو جب سوال کا پرچہ ہاتھ میں آئے گا تو ذہن سمٹ کر ایک جگہ ہوجائے گا اور اس سے متعلق تمام مضامین خود ذہن میں آجائیں گے۔ چنانچہ راقم جب امتحان گاہ میں پہونچا اور ممتحن نے سوالنامہ لکھوانا شروع کیا تو پہلا لفظ زبان سے نکلتے ہی پورا مضمون حتی کہ اس کا حاشیہ اور بین السطور اور اس کی پوری تشریح اور تقریر ذہن میں سمٹ کر جمع ہوگئی، اب حال یہ ہوا کہ بادل ناخواستہ پورا سوالنامہ لکھا اور اس سے فارغ ہوتے ہی جوابات لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ (۱۸) اٹھارہ صفحات پر مشتمل فل اسکیپ والے کاغذ پر جواب مکمل کرنے کے بعد جب کاغذ لینے کے لئے حضرت مولانا کے پاس پہونچا تو حضرت مولانا نے ڈانٹ کر بھگا دیا اور فرمایا کہ بس کرو کتنا لکھوگے اور آگے فرمایا کہ جتنا لکھ چکے ہو کون ہے جو تم کو فیل کردے گا۔ چنانچہ ممتحن نے کاپی جانچنے کے بعد ۵۲ باون نمبر سے سرفراز فرمایا جبکہ

آخری نمبر پچاس تھا اور جواب کی کاپی پر یہ نوٹ لکھا کہ اس جواب کی کاپی کو مدرسہ کے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے۔

الغرض ساری کتابوں میں ہر امتحان میں خواہ تقریری ہو یا تحریری راقم امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرتا گیا، تا آنکہ سالانہ امتحان کا وقت آیا، راقم نے ساری کتابوں کا تکرار بھی کرایا اور ذاتی طور پر وقت نکال کر تیاری بھی کی، سالانہ امتحان میں معمول کے مطابق باہر کے ممتحن بلائے گئے، مختصر المعانی کا امتحان حضرت مولانا وحید الزماں صاحب استاذ ادب دارالعلوم دیوبند کے یہاں گیا، سارے طلباء کی فہرست میں سب سے اوپر چونکہ راقم ہی کا نام ہوا کرتا تھا، اس لئے جب امتحان شروع ہوا تو سب سے پہلے امتحان کے لئے روبرو راقم کی حاضری ہوئی، چونکہ پہلی مرتبہ حضرت مولانا کو امتحان دینے کا اتفاق ہوا، ان کے مزاج و انداز سے راقم مکمل طور پر نا آشنا تھا اور دارالعلوم دیوبند کا ایک رعب بھی دل و دماغ پر غالب تھا، تاہم کتاب کھولکر راقم بیٹھ گیا، حضرت مولانا نے ایک جگہ سے عبارت پڑھنے کو فرمایا اور چھ صفحہ کی عبارت پڑھوائی اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں پوچھی، عبارت سن کر فرمایا جاؤ۔ میں کتاب لے کر واپس آ گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ سارے طلباء میں سب سے زیادہ نمبر راقم ہی کا ہے اور امتیازی نمبر سے نوازا گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کا مزاج یہ ہے کہ طلباء کی عبارت خوانی ہی سے وہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ طالب علم کتنے پانی میں ہے۔ اس طرح مختصر المعانی کا سال بھی بحسن وخوبی مکمل ہو گیا اور اس درجہ کی تمام کابوں کے امتحانات سے فارغ ہو گیا۔

صوفی رشید احمد صاحب سے آشنائی

صوفی رشید احمد صاحب گنگوہ کے رہنے والے تھے، محلّہ قاضی کے متصل دھوبی والی گلی میں ان کا مکان تھا، ان کی اہلیہ دین دار نیک سیرت عابدہ زاہدہ تھیں صوفی صاحب خود لمبی چوڑی زمین کے مالک تھے، جو سہارنپور روڈ پر گنگوہ تھانہ کے پچھّم طرف تھی، مختلف انواع کی چیزیں اپنی زمین میں اگایا کرتے تھے، خود بھی نیک طبیعت صالح وضع دار بزرگوں سے عقیدت، محبت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت شیخ جب بھی گنگوہ تشریف لاتے تو مزارات کی حاضری کے بعد آپ کے مکان پر بھی تشریف لے جاتے تھے، خود بھی حضرت شیخ کی خدمت میں ہدایا اور تحائف کے ساتھ حاضری دیا کرتے تھے، کئی بار خادم کے ذریعہ بھی حضرت شیخ کی خدمت میں ہدیہ بھیجوایا، صوفی صاحب خود لاولد تھے، اپنے بھائی کی بچی کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، جب وہ بڑی ہوگئی تو اس کی شادی بیاہ کی پوری کفالت صوفی صاحب ہی نے کی اور تا حیات اپنے ہی مکان میں اس کو اور ان کے بچوں کو رکھا اور آج بھی ہیں۔ داماد سہارنپور کا تھا، شادی کے بعد صوفی صاحب ہی کے مکان پر وہ مستقل رہتا تھا، ماشاءاللہ اللہ نے ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نوازا، وہ بچے بھی صوفی صاحب ہی کے مکان پر رہتے تھے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے راقم سے ان کی آشنائی ہوئی، اس کے بعد اپنے نواسوں اور نواسی کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے مصر ہوئے ۔ بالآخر حضرت ناظم صاحب سے بھی انہوں نے

اجازت حاصل کرلی اوران کے حکم سے روزانہ عصر کے بعدان کے گھر جانے لگا اور تقریباً دوسال تک جاتا رہا۔اس طرح بچوں نے نورانی قاعدہ سے لے کرقرآن کریم ناظرہ تک مکمل کرلیا،مسلسل آنے جانے کی وجہ سےصوفی صاحب سے بھی کافی انس ہوگیا،صوفی صاحب عامل بھی تھےلیکن اخیرعمر میں انہوں نے کام موقوف کردیا تھا۔ راقم سے کئی مرتبہ اصرار کیا کہ میں اپناعمل تم کوسکھادیتاہوں تم اس کو لے لو،اس لئے کہ میری کوئی اولادنہیں ہے جو وارث بن سکے۔راقم ذہنی طور پراس کام کے لئے تیارنہیں ہوسکا، چونکہ شروع ہی سے پڑھنے پڑھانے کا مزاج تھا اوراس لائن کوتعلیم کے لئے حارج سمجھتا تھا،اس لئے راقم نے قبول نہیں کیا،اس کی وجہ سےصوفی صاحب بہت مایوس ہوئے،ان کی مایوسی پرراقم کوترس بھی آیا،لیکن اپنےطبعی میلان ورجحان کی وجہ سے ادھرنہیں جاسکا۔ان کے داماد جن کا نام عزیز تھاان کی ایک بس گنگوہ سے سہارنپور روزآیاجایا کرتی تھی،صوفی صاحب نے کنڈکٹر اورڈرائیور سے ملاقات کراکرتعارف کرادیا اور یہ کہہ دیا تھا کہ یہ جب بھی گنگوہ سے سہارنپورآئیں جائیں ان سے کرایہ مت لینا،لیکن چونکہ گھومنے پھرنے کا مزاج نہیں تھا اس لئے سال میں چندہی مرتبہ سہارنپورآنے جانے کا اتفاق ہوا وہ بھی صرف حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات وزیارت کے لئے یاصوفی صاحب کا کوئی ہدیہ حضرت شیخ تک پہونچانے کے لئے۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ طلباءعصر کے بعدگھومتے ہوئےصوفی صاحب کے باغ میں پہونچ گئے،صوفی صاحب نے ان کو بلاکراپنے پاس بٹھایاان کا تعارف پوچھا بزرگوں کے کچھ ملفوظات اورقیمتی باتیں ان طلباءکوسنائیں اوراس کے بعدراقم کی

ثنا خوانی شروع کردی اور دیر تک تذکرہ کرتے رہے، وہاں سے واپسی پر طلباء جب راقم سے ملتے تو کہتے کہ تم نے صوفی صاحب کو کیا پلا دیا ہے، وہ تمہارے بارے میں بڑے بھاری بھاری الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ راقم نے کبھی جب ان طلباء سے پوچھا، آخر وہ کیا کہہ رہے تھے تو کہنے لگے کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہارے مدرسہ میں ایک بہت بڑا ولی رہتا ہے جو بہت اونچی نسبت کا مالک ہے اس کے اندر بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو اس مدرسہ میں کسی میں نہیں ہیں، آگے چل کر وہ بہت اونچی نسبت کا حامل ہوگا اور اللہ پاک اس سے بہت بڑا بڑا کام لیں گے اور بھی بہت سے اونچے اونچے الفاظ والقاب استعمال کرتے تھے اور راقم سن کر ہنستا تھا، چونکہ طالب علمی کا زمانہ تھا اپنے مستقبل کی کوئی خبر نہیں تھی، لیکن اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ "اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله" کے مصداق تھے، اس وقت ان کی بات ہوا ہوائی سمجھ میں آتی تھی لیکن ان کی بہت سی کہی ہوئی باتوں کو آج اللہ نے سچ کر دیکھا یا وہ آج اگرچہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی ملاقاتیں اور یادیں آج بھی زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے، درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔

سہارنپور کے ایک موچی کا واقعہ

گنگوہ کے قیام کے دوران مدرسہ اشرف العلوم کے ایک استاذ قاری اسلام

صاحب سہارنپور جارہے تھے، راقم بھی ان کے ہمراہ ہوگیا، سہارنپور پہونچ کر کسی محلّہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے گئے جو جوتا بنانے کا کام کرتے تھے، صورت شکل سے نیک نظر آرہے تھے، سر پر سنتی بال تھے، چہرہ پر سنتی داڑھی تھی، لباس بھی دینداوں کا پہنے ہوئے تھے، کچھ دیر قاری صاحب ان کے پاس ٹھہرے اور مجھ کو وہیں پر بیٹھا کر اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے چلے گئے، ان کے غائبانہ میں موچی نے مجھ سے گفتگو شروع کی، نام، گاؤں پوچھا، تعلیم پوچھی تھوڑی دیر گفت وشنید کے بعد اس نے ایک پیشکش کی۔ اس نے کہا میں بہت پرانا عامل ہوں میرے موٴکل کا کام خبریں لاکر دینا ہے، کہیں سے بھی آپ کو کوئی خبر منگوانی ہو وہاں کی صحیح صحیح خبر لاکر آپ کو بتا دے گا، میں لاولد ہوں، میرا کوئی وارث نہیں ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ تم وارث بن جاؤ اور مجھ سے وہ عمل سیکھ لو، آئندہ تمہارے وہ کام آئے گا۔

چنانچہ اس نے پورا وظیفہ بتایا، اور کرنے کا طریقہ بتایا اور ترک جلالی و جمالی کا حکم دیا اور اس کا مطلب سمجھایا۔ راقم وہ عمل لے کر گنگوہ واپس آگیا، لیکن اس کو شرع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، بالآخر چند مہینہ کے بعد پھر سہارنپور جانا ہوا اور ان سے ملاقات کا بھی اتفاق ہوا، ملاقات کے بعد انہوں نے گفتگو کے دوران بتلایا کہ حافظ صاحب آپ نے وہ عمل نہیں شروع کیا، راقم نے عرض کیا کہ نہیں، اس پر انہوں نے کہا کہ جی میں نے فلاں دن فلاں تاریخ کو آپ کو دیکھنے کے لئے اپنے موٴکل کو بھیجا تھا، اس نے واپس آکر بتلایا کہ آپ نے عمل ابھی شروع نہیں کیا ہے اور اس دن آپ کے کچھ مہمان دیوبند سے آئے ہوئے تھے، جن کے لئے آپ کھانا پکارہے تھے، انہوں

نے یہ جو بات بتائی وہ بالکل درست تھی اوراس سے بھی یقین ہو چلا کہ ان کا مؤکل سچا ہےاور صحیح خبریں لاکر پہونچاتا ہے،لیکن اس کے باوجود علمی و تعلیمی غلبہ رجحان نے اس میدان میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی اور یہی خیال غالب رہا کہ یہ چیزیں تعلیم و تعلم کے لئے حارج و مانع ہیں۔ چنانچہ اس طرح صوفی رشید صاحب گنگوہی اور سہارنپور کے موچی صاحب کی نیابت قبول کرنے سے راقم قاصر رہا۔

تذکرہ قاری اسلام صاحب

قاری محمد اسلام صاحب مدرسہ اشرف العلوم کے تجوید کے استاذ تھے، بھاری بھرکم لحیم وشحیم لمبے قد کے تھے آواز اچھی تھی، مشق اچھی کراتے تھے، چونکہ راقم حضرت ناظم صاحب کا خادم خاص اور مقرب تھا، اس لئے بعض اساتذہ راقم سے خواہ مخواہ بھی خار کھائے بیٹھے رہتے تھے کسی استاذ نے میرے خلاف قاری اسلام صاحب کو اتنا بھر دیا کہ انہوں نے عشاء کے بعد مطبخ والی بلڈنگ کے بالائی حصہ پر بلا کر راقم کی قاعدہ سے دھلائی کرڈالی راقم روتا چیختا چلاتا ہوا اپنے کمرہ میں جا کر بیٹھ گیا جو صدر گیٹ کے بغل میں زینہ کے نیچے تھا،لیکن حضرت ناظم صاحب نے رونے کی آواز سن لی اور ایک طالب علم کو بھیج کر راقم کو بلوایا۔ راقم کا ارادہ بتانے کا نہیں تھا،لیکن اس حال میں بتانا ہی پڑ گیا، اس کے بعد حضرت ناظم صاحب نے قاری اسلام صاحب کو بلایا اور قاعدہ سے ان کی خبر لی، اس کے بعد جب حضرت ناظم صاحب کے اہل خانہ کو معلوم ہوا تو

انہوں نے بھی خبر لی جو واقعہ راقم کے ساتھ پیش آیا اس انداز کے واقعات کچھ دیگر طلباء کے ساتھ بھی پیش آئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد مدرسہ اشرف العلوم سے وہ رخصت ہو گئے۔

مدرسہ اشرف العلوم کے ایک طالب علم کا واقعہ

ماسبق میں عملیات کی لائن کی بات آئی اسی کے ضمن میں مدرسہ اشرف العلوم کے ایک طالب علم کا واقعہ یاد آ گیا، خیال ہوا کہ اسے بھی سپرد قرطاس کرتا چلوں۔

غالبًا وہ طالب علم ضلع دمکا کا تھا، ایک مرتبہ چند ساتھی بیٹھے ہوئے تھے، عملیات اجنہ اور موکل کی بات کر رہتے تھے، اس مجلس میں وہ طالب علم بھی تھا جو عامل تھا، جناتوں سے اس کا تعلق تھا، وہ کہنے لگا کہ ایک مرتبہ جناتوں نے میری دعوت کی، مجھ کو لے کر ایک جنگل میں گئے ایک چھوٹے سے سوراخ پر روک کر کہا کہ اس کے اندر چلو میں نے کہا اتنا چھوٹا سا سوراخ اس بل میں میں کیسے جا سکتا ہوں، اس نے کہا پاؤں رکھو راستہ خود بن جائے گا۔ چنانچہ میں نے پاؤں رکھا، پاؤں رکھتے ہی کشادہ راستہ بن گیا وہ مجھ کو نیچے لے کر گیا، نیچے پہونچ کر ایک خوبصورت ہال ملا جس میں ہر طرح کی لائٹ اور روشنی تھی اور روشنی سے وہ جگمگا رہا تھا، لیکن اس ہال میں شیر ہی شیر تھے، آگے بڑھا، دوسرا ہال ملا وہ ہال خطرناک سانپوں سے بھرا ہوا تھا، اسی طرح کئی ہال سے گزرنا ہوا جس میں موذی اور مہلک جانور ملے جس نے میرا حال بے حال کر دیا، لیکن

میرے رفیق سفر نے کہا ڈرو نہیں آگے چلتے رہو، آگے پہونچ کر ایک خوبصورت ڈائننگ ہال ملا، جہاں میز کرسی لگی ہوئی تھی اور اس پر مختلف انواع واقسام کے لذیذ کھانے رکھے ہوئے تھے، میں نے وہاں بیٹھ کر پیٹ بھر کے کھانا کھایا، کھانے سے جب فارغ ہو گیا تو میرے جنات دوست نے اوپر لا کر پہونچا دیا اس کے بعد میں مدرسہ چلا آیا۔ یہ واقعہ سننے کے بعد سارے ساتھ لرز گئے اور مجلس برخاست ہو گئی۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کا واقعہ

انہی سب باتوں کی وجہ سے راقم تعویذ گنڈوں کے کام سے بہت زیادہ متوحش اور دور تھا تا آنکہ جب دارالعلوم دیوبند پہونچا اور دارالافتاء میں داخلہ کے بعد حضرت مفتی صاحب کے محرر اور خادم کی حیثیت سے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا تو حضرت مفتی صاحب نے اپنی ذاتی بیاض جس میں مختلف انواع کی تعویذات درج تھیں اس کو نقل کرنے کا حکم دیا، لیکن راقم نے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کیا، کئی مرتبہ حکم دینے کے بعد اس کی طرف توجہ نہیں کی، یہاں تک کہ ایک دن حضرت مفتی صاحب نے بلا کر فرمایا کہ حبیب اللہ جب یہاں سے فارغ ہو کر کام کے میدان میں جاؤ گے تو امت کی مختلف ضرورتوں کو تمہیں پورا کرنا ہوگا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے گا تو مسئلہ بتانا ہوگا، کوئی نماز پڑھانے کے لئے کہے گا تو نماز پڑھانی ہوگی، کوئی نکاح پڑھانے کے لئے کہے گا تو نکاح پڑھانا ہوگا، کوئی تقریر کے لئے کہے گا تو تقریر کرنی پڑے گی۔ اسی

طرح کبھی تمہارے پاس کوئی ایسا شخص بھی آئے گا جو پریشان حال ہوگا وہ تم سے دعاء تعویذ کی درخواست کرے گا تو اگر دعاء تعویذ تم نہیں سیکھو گے تو اس کی مدد کیسے کروگے، اگر تمہاری ذات سے کسی پریشان حال کی پریشانی دور ہوجائے تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے، تمہیں تو ثواب ہی ملے گا۔ حضرت مفتی صاحب نے یہ بات اس انداز سے کہی کہ یہ بات دل کو لگ گئی اور بادل ناخواستہ میں نے حضرت مفتی صاحب کی تعویذ کی کاپی کو نقل کرنا شروع کردیا، لیکن بہت مجبوری میں صرف خواص کے لئے اس کام کو محدود رکھا، عمومی طور پر اس کو پیشہ نہیں بنایا، چونکہ یہ معلوم ہے کہ یہ ایسا کام ہے کہ اس میں نفع سے زیادہ نقصان ہے اور خیر سے زیادہ شر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے اکثر اکابر نے تعویذ لکھنے کا کام کیا ہے۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کا ایک دوسرا واقعہ

خود حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی بھی تعویذ لکھتے تھے اور تعویذ دیتے تھے اور تعویذ کی لائن سے بہت مشہور تھے، بعض اہم کاموں کے لئے بعض تعویذات آپ کی بہت مشہور تھیں، لیکن حضرت مفتی صاحب سے راقم نے خود ایک مرتبہ براہ راست سوال کیا کہ حضرت کیا آپ عامل بھی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، پھر راقم نے عرض کیا کہ آپ تعویذ تو دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا ہاں، تعویذ دیتا ہوں اور اللہ جب چاہتا ہے اس سے لوگ شفاء یاب بھی ہوتے ہیں، لیکن میں عامل نہیں ہوں اور نہ ہی

تعویذ دینے کے لئے عامل ہونا ضروری ہے۔

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کا تذکرہ

اسی طرح حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی تعویذ لینے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی، ہر مذہب کے لوگ آپ کی تعویذ استعمال کرتے تھے اور بہت عقیدت سے آپ کی تعویذ رائج تھی جس منظر کو ایک طویل عرصہ تک راقم نے خود بھی دیکھا ہے، لیکن حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی بھی عامل نہیں تھے، حضرت سے بھی میں نے خود سوال کیا تھا، حضرت نے فرمایا کہ میں عامل نہیں ہوں، ضرورت مند لوگ آتے رہتے ہیں، ان کی ضرورت کے حل کے لئے اللہ جو دل میں ڈالتا ہے میں لکھ کر دے دیتا ہوں شفا دینا اللہ کا کام ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی تعویذ کا واقعہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی تعویذ لینے کے لئے لوگ کثرت سے آتے تھے، اس لئے حضرت نے عصر کے بعد تعویذ لینے اور دینے کا وقت متعین کر دیا تھا اور اس کے لئے حضرت مولانا یامین صاحب مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کو متعین کر دیا تھا، مولانا اہتمام کے ساتھ عصر کی نماز کے بعد

سے مغرب تک کچے گھر کے چبوترے پر تشریف فرما ہوتے تھے اور جب کوئی تعویذ کے لئے آتا تو حضرت شیخ مولانا یامین صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک دیہاتی چودھری حضرت شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت جی میرے لونڈے کو کوئی لونڈا نہیں ہورہا ہے، اس کی کوئی تعویذ دیدو۔ حضرت شیخ نے فرمایا چودھری جی اگر اس کی کوئی تعویذ میرے پاس ہوتی تو میں اپنے لونڈے طلحہ کو نہیں دے دیا ہوتا۔ حضرت کے یہ فرمانے پر تمام حاضرین ہنس پڑے۔

مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ کا ساتواں سال

ساتویں سال میں راقم کی جب مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں حاضری ہوئی تو اس سال موقوف علیہ یعنی مشکوۃ شریف کی جماعت میں داخلہ ہوا، مشکوۃ شریف کے ساتھ جلالین بیضاوی، ہدایہ آخرین وغیرہ کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا۔

چونکہ اس وقت تک مدرسہ اشرف العلوم میں دورہ حدیث کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا، اس لئے تعلیمی اعتبار سے یہ وہاں کا آخری سال تھا، پورا سال عافیت کے ساتھ پورا ہوا حسب معمول اس سال بھی موقوف علیہ کی ساری کتابوں کی عبارت خوانی اور تکرار کی ذمہ داری بھی راقم کی رہی، مشکوۃ شریف، ہدایہ اور بیضاوی شریف کے پڑھنے کی سعادت حضرت مولانا فیاض صاحب کے یہاں حاصل ہوئی۔

جیسا کہ ماقبل میں راقم عرض کر چکا ہے کہ حضرت مولانا کو زیادہ لگاؤ فنی

کتابوں سے تھا، لیکن اس سے ہٹ کر دوسری کتابیں بھی طلباء ان سے پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔

چنانچہ اس سال کی جو کتابیں ان کے پاس گئیں ان کتابوں کو بھی حضرت مولانا نے کما حقہ پڑھایا، حدیث وتفسیر میں بھی غیر ضروری اور لمبی بات کرنے کے عادی نہیں تھے، بہت اہم اور ضروری باتوں پر ہی اکتفاء کیا کرتے تھے، لیکن موضوع گفتگو کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔

اس سال کے ساتھیوں میں مسعود پورنوی آج بھی بہت یاد آتے ہیں، جو تکرار ختم ہونے کے بعد رات کے بارہ بجے چائے اور پان لے کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ راقم کے پاس آتے اور امتحان کی تیاری کے لئے بہت خوش آمدانہ انداز میں تکرار کے لئے اصرار کرتے، ان کے ساتھیوں میں وارث پورنوی صالح پورنوی بھی ہوا کرتے تھے، لیکن فراغت کے بعد نہ ان سے کوئی رابطہ رہا اور نہ ملاقات ہوئی۔

ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۴۴۰ھ میں جب اررریہ کے ایک جلسہ میں جانا ہوا اور وہاں کے ایک مدرسہ میں موجود حضرات علماء سے میں نے مسعود پورنوی کا نام لیا اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو اس مجلس میں موجود مولانا صادق اکرام نے یہ بتلایا کہ وہ میرے سگے ماموں تھے، ان کا چند سال قبل انتقال ہو چکا ہے یہ اندوہناک خبر سنکر بہت افسوس وقلق ہوا، اس کے بعد ان کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کی راقم نے درخواست پیش کی۔ چنانچہ کل ہو کر ان کے گاؤں اور گھر جانا ہوا اور ان کی قبر پر پہونچ کر بچشم تر فاتحہ خوانی کی اور واپس آ گیا۔

موقوف علیہ کا سال بہت عافیت کے ساتھ پورا ہوا اور تینوں امتحانات سے فارغ ہوکر شعبان میں گھر کے لئے روانہ ہوا گھر جاتے ہوئے جب سہارنپور پہونچا تو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، وہاں پر موجود حضرات میں حاجی ابراہیم پہلوان بھی تھے جو فیصل آباد پاکستان کے رہنے والے تھے اور حضرت رائے پوری کے لوگوں میں سے تھے، لیکن حضرت رائے پوری کے انتقال کے بعد حضرت شیخ سے منسلک ہو گئے تھے اور حضرت شیخ سے بے پناہ عقیدت ومحبت اور لگاؤ رکھتے تھے وہ مجھ کو رکشہ پر بیٹھا کر بازار لے گئے اور بازار سے کچھ ہدیہ تحائف خرید کر میرے سپرد کیا اور برادر اوسط کا نام لے کر وہ ہدایا ان کو دینے کو کہا اور اس کے ساتھ اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ اس کو رمضان میں شیخ کے یہاں بھیج دینا۔

چنانچہ گھر پہونچنے کے بعد پورا پیغام راقم نے ان سے نقل کیا اور ان کے دیئے ہوئے ہدایا وتحائف ان کے سپرد کئے وہ ان دنوں گھر ہی پر موجود تھے، کوئی علمی مشغلہ ان کا نہیں تھا، فارغ گھر پر بیٹھے ہوئے تھے، کبھی کبھار والد صاحب مرحوم کے ساتھ زراعت کے کاموں میں تعاون کر دیا کرتے تھے، چند روز تک راقم نے انتظار کیا لیکن جب کوئی پیش رفت نہیں نظر آئی اور ان کے سہارنپور سفر کے سلسلہ میں کوئی حرکت نہیں دیکھنے کو ملی تو راقم نے والدہ سے اصرار کرنا شروع کیا کہ ان کے دوستوں نے بالخصوص حاجی ابراہیم پہلوان نے اصرار کر کے بلایا ہے، لہٰذا ان کو بھیج دیا جائے۔ والدہ مرحومہ نے راقم کے اصرار کے بعد کہا کہ بیٹا جانے میں کرایہ بھاڑا لگے گا، گھر میں پیسے نہیں ہیں تو کیسے جائے گا، پیسے کا انتظام کہاں سے

ہوگا۔ والد صاحب سے اس سلسلہ میں بات کرنے کی راقم کی ہمت نہیں ہوئی، والدہ مرحومہ میرے بار بار کہنے اور اصرار پر مجبور ہوکر ہارون رشید بھائی کے گھر گئیں جن کا مکان راقم کے مکان کے سامنے تھا اور ان سے بطور قرض کچھ پیسے لے کر آئیں۔ اس طرح ان کے کرائے بھاڑے کا انتظام ہوا اور رمضان سے قبل وہ سہارنپور کے لئے روانہ ہوگئے۔

جامع مسجد ڈھاکہ میں تراویح

مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک سال جامع مسجد ڈھاکہ ضلع مشرقی چمپارن بہار میں تراویح کے لئے راقم کو طے کیا گیا۔ چنانچہ پورا مہینہ جامع مسجد میں قیام رہا، اور سحری وکھانے کا نظم ڈاکٹر اکرام صاحب کے مکان پر تھا، جن کے یہاں وقت پر پہونچ کر راقم سحری وکھانے سے فارغ ہوتا تھا، ڈاکٹر اکرام صاحب فیملی کے ساتھ چین پور روڈ پر مقیم تھے اور وہیں ان کا مطب بھی تھا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب جو چندن بارہ کے رہنے والے تھے انتہائی صالح اور نیک اور علاقہ کے مقبول شخصیات میں سے تھے، مدنی خاندان سے بہت قریبی تعلق تھا، ڈاکٹر اکرام صاحب انہی کے صالح برخوردار تھے۔ راقم نے اہتمام کے ساتھ دوعشرہ میں قرآن کریم مکمل کیا، آخری عشرہ میں برادر اکبر اپنے سفر سے واپس آگئے جو جامع مسجد کے پنج وقتہ امام بھی تھے انہوں نے آخری عشرہ میں ایک قرآن پاک مکمل کیا

اور طاق راتوں میں خصوصیت کے ساتھ شبینہ کے انداز میں لمبی تراویح ہوتی تھی جس میں قرب و جوار کے لوگ بھی بہت اہتمام کے ساتھ مختلف سواریوں کے ذریعہ آیا کرتے تھے، اور پوری مسجد بھر جایا کرتی تھی، اس وقت کے خصوصی کرم فرماؤں میں جناب ادریس صاحب کمپاؤنڈر پیرا اوران کےلڑکے انصار صاحب اور مولانا منیر احمد صاحب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، جو بہت محبت سے ملتے جلتے رہتے تھے، اور گفتگو کے ذریعہ اپنی اپنائیت کا ثبوت دیتے تھے۔

راقم کی شادی کا واقعہ

جس زمانہ میں راقم مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں زیر تعلیم تھا رمضان کی تعطیل گزارنے کے لئے والدین کے پاس گھر آیا کرتا تھا۔ ایک سال رمضان میں گھر ہی پر موجود تھا تو برادر اکبر کا ایک خط والد صاحب مرحوم کے پاس پہونچا کہ کل الوداعی جمعہ ہے، حبیب اللہ کو لے کر ڈھاکہ آجائیں، جمعہ کی نماز یہیں ادا کرنی ہے، والد صاحب مرحوم نے راقم کو بتلایا کہ کل جمعہ کی نماز ڈھاکہ پڑھنا ہے۔ چنانچہ کل ہو کر والد صاحب کے ہمراہ جمعہ سے قبل جھٹکا ہی سے ڈھاکہ پہونچ گیا، جمعہ کی نماز کے بعد اعلان ہوا کہ سنت سے فارغ ہونے کے بعد سب حضرات تشریف رکھیں ایک نکاح ہے۔ اس وقت تک راقم کو نہیں معلوم کہ کس کا نکاح ہے، جب نکاح کی مجلس منعقد ہوئی اور مجھ کو آگے بلایا گیا تو معلوم ہوا کہ راقم ہی کا نکاح ہے، لیکن کہاں ہے؟

کس کی بچی سے ہے؟ اس کی کوئی خبر نہیں، بڑوں کے حکم پر حضرت والد صاحب کی موجودگی میں ایجاب وقبول کا مرحلہ مکمل ہوگیا، تب معلوم ہوا کہ وہ بچی جس سے نکاح ہوا ہے وہ مادھو پور مدھو مالت کی رہنے والی ہے۔ ان کے والد کا نام حاجی نظام الدین ہے اوران کے سگے ماموں مولانا محمد عالم صاحب قاسمی ہیں، جو برادر اکبر کے مربی اور قریبی دوست تھے اورانہی دونوں کے مشورہ سے یہ رشتہ پایہ تکمیل کو پہونچا اور پوری رازداری کے ساتھ اپنے فیصلہ کوان دونوں حضرات نے نافذ کردیا۔

آج کے اعتبار سے وہ زمانہ گویا کہ خیرالقرون کا تھا، ماں باپ اور بڑوں کے فیصلے کے خلاف لب کشائی خوردوں کے لئے گویا کہ حرام تھی، بڑوں کے اپنے فیصلے ہوتے تھے جسے خوردوں کو ہر حال میں زندگی بھر جھیلنا پڑتا تھا اور چوں و چرا اور علمی مساوات کی برقراری ومزاجی آہنگی جیسی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دورۂ حدیث کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور حاضری

رمضان المبارک کی تعطیل کلاں گزارنے کے بعد راقم کو دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کے لئے سفر کرنا تھا، اکبر و اوسط برادران چونکہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ التحصیل تھے اور ذہنی وفکری طور پر وہاں سے بہت قریب تھے، اور علاقہ کے طلباء کی تشکیل کرکے وہاں بھیجنے کا معمول تھا اور راقم حضرت والد صاحب کی موجودگی میں اپنا کوئی ذاتی فیصلہ لینے اوراس کو نافذ کرنے سے قاصر تھا، لہٰذا برادران

کے حکم و فیصلہ کے مطابق گھر سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے لئے روانہ ہوگیا، دار الطلباء قدیم کے کمرے میں سامان رکھ کر چند روز قیام بھی کیا اور درخواست جمع کرا کر داخلہ کی کاروائی کی تکمیل کا منتظر رہا۔

داخلہ کا معمول یہ تھا کہ طلباء دار الطلباء قدیم کے احاطہ میں جمع رہتے تھے اور حضرات اساتذہ بالائی منزل کی درسگاہوں میں موجود ہوتے تھے، دفتر کا کوئی ایک چپراسی بالائی منزل سے نام پکارتا، جن طلباء کا نام آتا وہ اوپر پہونچ کر اساتذہ کے پاس تقریری امتحان سے فارغ ہوکر داخلہ کی کاروائی مکمل کراتے تھے، اس سال اس اعلان کی ذمہ داری دفتر نظامت کے ایک کارکن مولانا عبدالرزاق آسامی کی تھی جن سے برادران کے علاوہ ذاتی طور پر راقم سے بھی آشنائی تھی۔ راقم نے اپنے نام کا تین روز تک انتظار کیا اور ان سے یہ کہنے کے باوجود کہ مجھے گنگوہ جانا ہے، اگر جمعرات تک میرے داخلہ کی کاروائی مکمل ہوجائے تو بہتر ہے تاکہ میں داخلہ کے کام سے فارغ ہوکر گنگوہ جاسکوں، لیکن اس گزارش کے باوجود چار دن تک انتظار کرتا رہا، لیکن نام نہیں آیا، جمعرات کے دن جب وہ بالائی منزل پر نام کے اعلان کے لئے آئے تو راقم نے ان کو اشارہ بھی کیا لیکن وہ سارے تعلقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے راقم پر بہت زیادہ برہم ہوگئے اور بہت کچھ سخت وسست سنایا اس کے بعد راقم یہ سمجھ گیا کہ آج داخلہ کا کام نہیں ہوپائے گا اور کل جمعہ کی چھٹی ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ میں گنگوہ کی ملاقات نمٹا کر جمعہ کی شام تک آجاؤں۔

چنانچہ میں جمعرات کی شام کو گنگوہ کے لئے روانہ ہوگیا، وہاں پہونچ کر

اساتذہ کرام بالخصوص اپنے محسن ومربی مشفق وکرم فرماں ناظم مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب گنگوہی سے ملاقات کی، ملاقات کے دوران حضرت ناظم صاحب سے برادران کے فیصلے اور مدرسہ مظاہر علوم کی حاضری وقیام اور داخلہ کے لئے چار روز تک انتظار اور مولانا عبدالرزاق آسامی کی بدتمیزی ان ساری باتوں کا راقم نے تذکرہ کیا، یہ سننے کے بعد حضرت ناظم صاحب نے حکماً یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند میں پڑھنا ہے۔ مظاہر علوم میں نہیں، اور یہ فیصلہ سناتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ تم کو جو پڑھنا پڑھانا تھا وہ پڑھ چکے اب تو صرف سند اور نسبت حاصل کرنی ہے، لہٰذا مظاہر علوم کے بجائے دارالعلوم دیوبند جاؤ، اس لئے کہ مظاہر علوم کے مقابلہ میں دار العلوم دیوبند کی نسبت بہت اونچی ہے، حضرت ناظم صاحب کی قربت اور تعلق اور کرم فرمائی مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ کے قیام کے دوران اتنی تھی کہ راقم ان کے فیصلہ کا انکار نہیں کر سکا۔

البتہ اس فیصلہ کے بعد راقم اپنے محسن اور استاذ حضرت مولانا فیاض احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری روداد کے ساتھ حضرت ناظم صاحب کے فیصلہ سے ان کو آگاہ کیا۔ انہوں نے بھی حضرت ناظم صاحب کے فیصلہ کی تصدیق وتصویب فرمائی اور انہوں نے بھی دورہ حدیث وفضیلت کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند جانے کا حکم دیا، اس کے جواب میں راقم نے ہمت کر کے عرض کیا کہ حضرت میرا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں ہو جائے گا؟ وہاں تو امتحان داخلہ میں بہت سختی ہوتی ہے اور داخلہ لینے والوں کی بہت بڑی تعداد وہاں موجود ہوتی ہے، تو اس کے جواب

میں حضرت مولانا نے بہت ہی قوت کے ساتھ ڈانٹ کر فرمایا کہ جاؤ کون ہے دار العلوم دیوبند میں جو تم کو فیل کردے گا، اگر فیل ہوگئے تو مجھ کو بتانا میں آکر تمہارا داخلہ کراؤں گا۔

اس خود اعتمادی سے لبریز حضرت مولانا کے جملہ نے راقم میں بھی اعتماد کی لو پیدا کردی، لیکن اس سے زیادہ راقم کے سلسلہ میں حضرت الاستاذ کے اس قدر اعتماد وبھروسہ پر بھی حیرت ہوئی۔

دونوں حضرات کے اس فیصلہ پر نظر ثانی کی تو گنجائش نہیں تھی، لیکن اس فکر میں ضرور رہا کہ حضرت ناظم صاحب قاسمی ہونے کے باوجود مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور اس کے منتظمین واساتذہ سے قریبی روابط اور تعلق رکھتے ہیں اور ماضی میں بھی اپنے مدرسہ کے طلباء کو دورۂ حدیث کے لئے مظاہر علوم سہارنپور بھیجتے رہے پھر راقم کے سلسلہ میں اچانک اتنا سخت فیصلہ کیوں صادر فرمایا۔

محمد حسین پورنوی کا واقعہ

تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس سال بددلی کی وجہ یہ پیش آئی کہ محمد حسین نامی ایک طالب علم جو پورنیہ کا رہنے والا تھا جس نے میزان سے لے کر مشکوۃ تک کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں حاصل کی تھی اور غربت کا عالم یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک دن جب مدرسہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی بجائے سیر وتفریح کے مدرسہ ہی میں گارے اور مٹی کا

کام کیا کرتا تھا اور ایک دن کی جو مزدوری اس کو ملتی تھی اسی سے اپنے پورے ہفتہ کا خرچ پورا کرتا تھا، اس کی غربت کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب کی کافی شفقت اس کو حاصل تھی باوجودیکہ ذہنی اعتبار سے بہت غبی تھا، لیکن حضرت ناظم صاحب نے بہت حوصلہ دے کر اس کو مشکوۃ تک پہونچا دیا اور دورۂ حدیث کے لئے اس کو اپنے ساتھ لے کر مدرسہ مظاہر علوم تشریف لے گئے اور کئی اساتذہ سے مل کر اس کی روداد بتلائی اور اس کی سفارش کی کہ اس کو امتحان داخلہ میں پاس کر دیں تاکہ یہ غریب طالب علم سند یافتہ ہو جائے، ممکن ہے کہ اللہ اس سے دین کا کام لے لے، لیکن اس سفارش کے باوجود حضرت مولانا یونس صاحب جونپوری کے یہاں اس کا امتحان داخلہ گیا اور انہوں نے اس کو فیل کر دیا۔

جب محمد حسین پورنوی نے واپس آکر اپنے فیل ہونے کی خبر حضرت ناظم صاحب کو بتلائی تو خبر سن کر حضرت ناظم صاحب بے حد رنجیدہ ہوئے اور افسوس و قلق کا اظہار کیا اور اسی کے بعد مظاہر علوم اور اہل مظاہر سے سخت برہم ہو گئے۔ اسی برہمی کے درمیان راقم پہونچ گیا۔ اس طرح حضرت ناظم صاحب نے راقم کے سلسلہ میں فیصلہ تبدیل کر دیا اور راقم مظاہری بنتے بنتے قاسمی بن گیا۔

اس فیصلہ کے بعد راقم مظاہر علوم سہارنپور حاضر ہوا اور بغیر کسی کو کچھ بتائے اور کسی سے ملے سامان لے کر خاموشی کے ساتھ دار العلوم دیوبند پہونچ گیا، وہاں پہونچ کر کمرہ نمبر (۴) دار جدید جس میں پہلے سے چمپارن کے آشنا طلباء رہتے تھے اس میں سامان رکھ دیا۔

دارالعلوم دیوبند کی حاضری اور داخلہ کی کاروائی

مولانا سراج صاحب ساکن محمد پور ضلع مشرقی چمپارن اور حافظ فصیح الدین صاحب ساکن مادھوپور ضلع مشرقی چمپارن بھی اسی کمرہ میں مقیم تھے جن سے راقم کو پہلے سے ہی سناشائی تھی، ان حضرات کے توسط سے دفتر تعلیمات سے داخلہ فارم حاصل کیا اور خانہ پری کے بعد جمع کروادیا اور کل ہو کر دارالحدیث تحتانی جہاں تقریری امتحانات ہوتے تھے اور امتحان لینے والے حضرات اساتذہ تشریف فرما ہوتے تھے اور نئے داخلے کے خواہشمند طلباء کی بھیڑ وہاں جمع ہوتی تھی اور جن کا نام پکارا جاتا تھا وہ امتحان سے فارغ ہو کر واپس آجاتے تھے۔اسی بھیڑ میں یہ راقم بھی روزانہ اپنے نام کے انتظار میں بیٹھنے لگا۔

انتظار کو تقریباً دو ہفتے گزر گئے لیکن نام نہیں آیا، ادھر مظاہر علوم سہارنپور کے داخلے بھی بند ہو گئے، اب یہ فکر سوار ہوئی کہ اگر یہاں بھی نام نہیں آیا اور داخلہ نہیں ہوا تو میں کہاں جاؤں گا اور اپنے بڑوں کو کیا منہ دکھاؤں گا، اس فکر اور سوچ کا دل و دماغ پر اس قدر تسلط ہوا کہ راقم پر گریہ طاری ہو گیا اور بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا، اتنے میں مولانا سراج صاحب محمد پور والے آگئے، انہوں نے راقم کو روتا ہوا دیکھ کر وجہ پوچھی اور جی بھر کر انہوں نے تسلی دی اور داخلہ کا اعتماد پیدا کر دیا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کل ہو کر جب امتحان گاہ میں حاضر ہوا تو تھوڑی ہی دیر کے بعد چپراسی چند فارم لے کر آیا اور اس نے چند ناموں کا اعلان کیا جس کی آواز صور اسرافیل سے کم نہیں تھی، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ایک آنکھ کا اعور بھی تھا، راقم کا جب اس

نے نام پکارا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے، بدن پر لرزہ طاری ہو گیا، تھوڑی دیر کے لئے ہلکی سی غشی آئی لیکن نگاہ چپراسی کے تعاقب میں لگی رہی اور راقم بغور یہ دیکھتا رہا کہ میرے نام کا فارم یہ کس کے ڈسک پر لے جا کر رکھ رہا ہے۔

جب راقم نے دیکھا کہ میرا فارم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کے ڈسک پر رکھا ہے تو اس کے بعد سارا خوف و ہراس جاتا رہا اور بہت پُر اعتمادی کے ساتھ راقم ان کے پاس حاضر ہوا، چونکہ اس سے پہلے مدرسہ اشرف العلوم میں ان کو امتحان دے چکا تھا اس لئے امتحان لینے کا انداز ان کا معلوم تھا۔

پہونچنے کے بعد ڈسک پر رکھی ہوئی کتابوں میں سے ہدایہ آخرین کھلوایا اور دو صفحے کی عبارت پڑھائی اس کے بعد بیضاوی کھلوایا۔ مالک یوم الدین سے متعلق جو عبارت ہے وہ پڑھوائی اور صرف ایک سوال کیا کہ جب مشہور قرأۃ ملک یوم الدین ہے تو مالک یوم الدین کیوں پڑھا جاتا ہے۔ راقم کی نگاہ فوراً حاشیہ پر گئی، حاشیہ میں سوال و جواب لکھا ہوا تھا، بہت اطمینان کے ساتھ جواب بتلا دیا، اس کے بعد حضرت مولانا نے کتاب بند کروا دیا اور فرمایا کہ جاؤ۔ چنانچہ راقم ساتھیوں میں واپس آ گیا اور دو ہفتے کا غم دور ہو گیا اور داخلہ کی امید بڑھ گئی۔

چند روز کے بعد نتیجہ آویزاں ہوا تو اعلان دیکھ کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ راقم امتحان میں صرف پاس ہی نہیں ہوا بلکہ اوسط اتنا اچھا تھا کہ مطبخ سے کھانا بھی جاری ہو گیا، کتابیں بھی مل گئیں، وظیفہ بھی جاری ہو گیا اور کمرہ نمبر (۸۱) دار جدید میں سیٹ بھی مل گئی۔ اس طرح الحمدللہ قاسمی بننے کی راہ ہموار ہو گئی۔

دورۂ حدیث شریف کے حضرات اساتذہ

اب انتظار اسباق کے شروع ہونے کا تھا، چنانچہ چند دنوں کے بعد تقسیم اسباق کا اعلان آویزاں ہوا، اعلان کے مطابق بخاری شریف جلد اول حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب کے پاس گئی اور جلد ثانی کا پہلا حصہ حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کے یہاں اور دوسرا حصہ حضرت مولانا سالم صاحب کے یہاں اور مسلم شریف حضرت مولانا عبدالاحد صاحب کے یہاں اور ترمذی شریف جلد اول حضرت مولانا محمد حسین صاحب کے یہاں اور جلد ثانی حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کے یہاں اور شمائل ترمذی حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کے یہاں اور ابوداؤد شریف حضرت مولانا سالم صاحب کے یہاں اور نسائی شریف حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب کے یہاں گئی۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور نائب مہتمم حضرت مولانا معراج الحق صاحب تھے اور صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الحسن صاحب تھے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب تھے جن کو بخاری شریف جلد اول پہلے سال ملی تھی اور ناظم تعلیمات حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری تھے۔

صبح کی پہلی گھنٹی میں مسلم شریف کا درس ہوتا تھا جو حضرت مولانا عبدالاحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھی، ان کے یہاں تمام طلباء پابندی سے حاضر ہوا

کرتے تھے، چونکہ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ مستجاب الدعوات حضرات میں سے ہیں اس لئے طلباء کو اس کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں غیر حاضر رہنے والے طلباء کے لئے بد دعاء نہ کردیں۔ اس لئے ہر طالب علم پابندی سے حاضر درس ہوا کرتا تھا۔ حضرت مولانا کے سبق کے ختم کے بعد روزانہ دعاء کی پرچی پہونچا کرتی تھی اور روزانہ اہتمام سے آپ دعاء کرایا کرتے تھے۔

دوسری گھنٹی میں ترمذی شریف جلد اول کا درس ہوتا تھا، حضرت مولانا محمد حسین صاحب جو علامہ بہاری کے نام سے مشہور تھے وہ بہت پُر مغز ترمذی کا درس دیتے تھے، لیکن ان کے درس میں بہت کم طلباء شریک رہا کرتے تھے، چونکہ وہ گھنٹی طلباء کے ناشتے کی ہوا کرتی تھی، تیسری گھنٹی ترمذی جلد ثانی کی تھی جس کا درس حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری دیا کرتے تھے اور چونکہ خود حضرت مولانا ناظم تعلیمات بھی تھے اور جس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے اس کی صورت یاد رہتی تھی اور حاضری بھی ترجمان کے بجائے خود لیا کرتے تھے اور اکثر حاضری لیتے ہوئے طلباء کو کھڑا بھی کردیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی گھنٹی میں طلباء کم غیر حاضر ہوتے تھے۔ چوتھی گھنٹی میں بخاری شریف جلد اول ہوا کرتی تھی جس کا درس حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب دیا کرتے تھے، ان کے درس کا ایک خاص انداز تھا، ان کے بولنے کی ایک الگ اسٹائل تھی جس میں تسلسل بہت ہوتا تھا۔ بخاری شریف کی عظمت کے تحت طلباء کی غیر حاضری بہت کم ہوتی تھی۔ ظہر کے بعد متصلاً حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نسائی شریف کا درس دیتے تھے اور آخری گھنٹی میں ابوداؤد شریف کا درس ہوتا تھا۔ بخاری

شریف جلد ثانی کے پہلے حصہ کا درس عشاء کے بعد ہوا کرتا تھا، چونکہ حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کے درس کا انداز بلیغانہ ہونے کے ساتھ خطیبانہ ہوتا تھا، اس لئے طلباء بہت شوق سے اس میں شرکت کرتے تھے اور بخاری شریف جلد ثانی کے حصہ ثانی کا درس مغرب کے بعد ہوا کرتا تھا اور شمائل ترمذی جو حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کے یہاں تھی اس کا درس عصر کے بعد مسجد چھتہ میں ہوتا تھا۔

اس سال دورۂ حدیث کے اساتذہ کے لئے ایک خاص بات یہ رہی کہ سبھی حضرات سواء حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری کے سفر حج کے لئے تشریف لے گئے۔

دورۂ حدیث کے سال میں عموماً صف اول اور پہلی نشست کے لئے اکثر طلباء میں تنافس ہوتا ہے، لیکن الحمد للہ راقم کو صف اول اور صف ثانی میں اکثر نشست ملتی رہی اور دورۂ حدیث کی اکثر کتابوں کی عبارت خوانی کی بھی سعادت حاصل رہی۔ بالخصوص اخیر سال میں جب صرف روایت پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ اس وقت دس دس بیس بیس صفحہ عبارت خوانی کی الحمد للہ توفیق ہوئی۔ چونکہ طالب علمی کے زمانہ سے راقم پان کھانے کا عادی تھا، اس لئے عبارت خوانی کے دوران بھی منہ کے ایک گوشہ میں پان کی گلوری پڑی رہتی تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کے یہاں پرچہ بھیجا کہ حضرت قاری صاحب بخاری شریف کی عبارت پان کھا کر پڑھ رہے ہیں، جب یہ پرچہ حضرت مولانا کے پاس پہونچا تو پڑھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ

جب بخاری پڑھانے والے کے منہ میں پان ہے اور وہ پان کھا کر بخاری پڑھا رہے ہیں تو قاری صاحب کی عبارت پڑھنے میں کیا گناہ ہے۔ الحمدللہ پورا سال عافیت کے ساتھ گزرا اسی دوران ششماہی امتحان بھی آیا جس میں الحمد للہ اچھے نمبرات سے کامیابی ملی۔

ششماہی امتحان سے فارغ ہونے کے چند ہفتے کے بعد حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کا ایک خادم راقم کو بلانے کے لئے کمرہ (۸۱) میں آیا اور کہا کہ حبیب اللہ چمپارنی کون ہے؟ راقم نے عرض کیا میں ہوں۔ قاصد نے کہا کہ تم کو حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری نے بلایا ہے۔ فلاں وقت آ کر کے ملاقات کر لینا۔

یہ سن کر راقم کو پسینہ آ گیا اور ساتھیوں نے مزید خوفزدہ کر دیا، چونکہ حضرت مولانا ناظم تعلیمات بھی تھے۔ اس لئے وہ خوف دوبالا ہو گیا۔ بہر حال راقم ڈرتا ڈرتا عافیت کی دعاء خوانی کرتا ہوا کاشانہ کے بالائی منزل پر پہونچا، جہاں ایک بڑے کمرے میں حضرت مولانا اپنے چند رفقاء کے ساتھ جلوہ افروز تھے اور حقہ نوشی فرما رہے تھے۔ راقم کو دیکھتے ہی بہت پیار سے بلایا، محبت سے بیٹھایا، قلم کاغذ منگوایا میرے سپرد فرمایا اور فرمانے لگے کہ بیٹا تمہاری کاپی ششماہی امتحان کی میں نے دیکھی، تمہاری تحریر خوشخط اور اچھی تھی، مجھ کو ایک دو مضمون لکھوانا تھا اس لئے تم کو بلوایا ہے، میں بولتا ہوں، تم لکھو، تب جا کر جان میں جان آئی اور طلبی کا خوف و ہراس ختم ہوا اور حقہ کی کش لیتے ہوئے حضرت مولانا نے مضمون کا املاء کرانا شروع کیا، اس کے بعد کئی مرتبہ املاء کے لئے طلبی ہوئی اور راقم حاضر خدمت ہوا جس کی وجہ سے حضرت

مولانا صورت آشنا ہو گئے اور دوران درس کبھی کبھار کسی مزاحیہ جملہ کے ساتھ مخاطب کرنے لگے، چونکہ راقم طالب علمی ہی کے زمانہ سے گول ٹوپی پہنتا تھا، اس لئے بخاری شریف کے درس میں دوران درس مخاطب کر کے راقم سے فرمایا:

یا صاحب القلنسوة المدورة

کہ اے گول ٹوپی والے اور اس کے بعد مزاحیہ ایک شعر پڑھا ۔

اٹھاؤ نہ خنجر دکھے گی کلائی

گلہ کاٹ لو گلبدن دھیرے دھیرے

حضرت شاہ صاحب چونکہ ظریف الطبع تھے بہت دیر تک علمی سنجیدگی کو برقرار رکھنا اور ایک ہی ہیئت پر تسلسل کے ساتھ خطیبانہ انداز میں بہت لمبی گفتگو کرنا مشکل ہوتا تھا، اس لئے کچھ وقفہ کے بعد طلباء میں نشاط پیدا کرنے کے لئے ظریفانہ جملے یا ظرافت پر مبنی کوئی شعر سنا دیا کرتے تھے جس سے درس میں پھر نشاط پیدا ہو جاتا تھا اور ذہن تعطل کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی خدمت میں حاضری

اوقات درس کے علاوہ جو وقت فارغ ہوتا تھا بالخصوص عصر کے بعد تو راقم بجائے سیر وتفریح کے بڑوں کی ہدایت اور حکم کے مطابق حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور حسب موقع مہمانوں کی خدمت وغیرہ میں بھی

مولانا ابراہیم صاحب افریقی کا ساتھ دیا کرتا تھا، نیز حضرت مفتی صاحب کی مجلسوں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ عشاء کی اذان سے پہلے کمرہ نمبر (۸۱) سے نکلا تو جب صدر گیٹ پر پہونچا تو عشاء کی اذان شروع ہوئی، اکثر عشاء کی نماز مسجد چھتہ میں ادا کیا کرتا تھا جب نماز سے فارغ ہوکر باہر نکلا تو صدر گیٹ اور مسجد چھتہ کے درمیان ایک صاحب ملے وہ ازخود کہنے لگے کہ ملا جی تم یہاں گھوم رہے ہو اور کمرہ نمبر ۸۱-۸۲-۸۳ کے لونڈوں کی ٹھکائی ہورہی ہے، یہ سن کر وہیں سے میں الٹے پاؤں مسجد چھتہ واپس آگیا اور رات بھر بلکہ کئی روز تک کمرہ نہیں گیا۔ چمپارنی طلباء نے راقم کی عدم موجوگی کو بہت شدت سے محسوس کیا اور بہت قوت کے ساتھ مغلظ گالیوں کا تحفہ اور چوڑی بھیجنا شروع کیا، لیکن جب تک معاملہ مکمل حل نہیں ہوگیا راقم مسجد چھتہ ہی میں مقیم رہا۔ درسگاہ اور مسجد چھتہ تک اپنے کو محدود کرلیا اور یہ طے کرلیا کہ مجھ کو اساتذہ و منتظمین کو گالیاں دینے اور برا بھلا کہنے کے لئے کمرہ میں نہیں جانا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ عصر کے بعد کھیل کے میدان میں کھیلتے ہوئے چمپارن اور میرٹھ کے دو طالب علموں میں کچھ کہا سنی ہوگئی، اس کے بعد چمپارنیوں نے مل کر کسی میرٹھی طالب علم کی ٹھکائی کردی، اس کی خبر جب میرٹھ کے طلباء کو ہوئی تو وہ سب اکٹھے ہوکر اذان کے بعد کمرہ نمبر ۸۱-۸۲-۸۳ میں پہونچے، چونکہ یہ چمپارنیوں کی رہائش گاہ تھی اور وہاں پہونچ کر میرٹھی طلباء نے ان چمپارنیوں سے مار پیٹ کا بدلہ وصول کیا جس کا ہنگامہ کئی روز تک چلتا رہا۔

لیکن اذان سے پہلے نماز کی تیاری کی برکت کی وجہ سے راقم اس زدوکوب سے محفوظ رہا اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے یہاں آمد و رفت کی برکت سے مسجد چھتہ کی خلوت نشینی حاصل ہوگئی اور اساتذہ و منتظمین کے خلاف بدزبانی سے اللہ نے محفوظ رکھا۔ یہ واقعہ ۹/ مارچ ۱۹۷۹ء جمعہ کے دن پیش آیا۔

دیوبند کے ٹھیکیدار عبدالحمید صاحب کا تذکرہ

ٹھیکیدار عبدالحمید صاحب دیوبند کے رہنے والے تھے اور دارالعلوم دیوبند کی تعمیرات کی دیکھ ریکھ بھی کیا کرتے تھے، جب یہ راقم مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں زیر تعلیم تھا تو اس وقت انھوں نے بھی اپنے ایک بچہ کو مدرسہ اشرف العلوم میں تعلیم کے لئے داخل کرایا تھا۔ حضرت ناظم صاحب کی قربت کی وجہ سے ٹھیکیدار عبدالحمید صاحب سے راقم کی بھی قربت دھیرے دھیرے بڑھنے لگی، تا آنکہ انہوں نے اپنے بچہ کی نگرانی بھی راقم کے سپرد کردی جب دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لئے پہونچا اور داخلہ میں تاخیر کی وجہ سے راقم پر افسردگی اور مایوسی طاری ہونے لگی جس کو ٹھیکیدار عبدالحمید صاحب نے بھی محسوس کیا تو انھوں نے بھی راقم کو بہت تسلی دیا اور صبر و تحمل کے ساتھ مزید انتظار کرنے کی تلقین کی اور اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت مولانا خورشید صاحب سے ملاقات کروائی اور حضرت مولانا نے بھی تسلی آمیز کلمات کے ذریعہ ہمت و حوصلہ دیا، جب تک دارالعلوم دیوبند میں راقم رہا ان سے گاہ بگاہ ملاقات ہوتی رہی۔ ایک دو مرتبہ اپنے گھر پر بھی وہ راقم کو لے کر گئے اور بہت خوش مزاج

اور ہر دلعزیز انسان تھے، دارالعلوم دیوبند کے تعمیری کاموں میں بہت ذوق وشوق سے لگے رہتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور بہترین صلہ ان کو عطا فرمائے۔

مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں اسٹرائک

راقم جب تک کہ مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں رہا اس وقت تک وہاں کا ماحول بہت پرسکون تھا طلباء اساتذہ میں پوری ہم آہنگی اساتذہ اور منتظمین میں پوری یگانگت دیکھنے کو ملتی رہی، اور تعلیمی اعتبار سے ادارہ روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ جب راقم دارالعلوم دیوبند پہونچا اور دورۂ حدیث میں داخل ہوا تو ۲۶/ربیع الثانی مطابق ۲۵/ مارچ بروز اتوار ۱۹۷۹ء کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں اسٹرائیک ہوگئی ہے اور طلباء واساتذہ وہاں سے جارہے ہیں۔ اس کے اسباب وعلل کی تفصیلات تو نہیں مل سکی لیکن ۳۰/ربیع الثانی مطابق ۲۹/مارچ بروز جمعرات ۱۹۷۹ء کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت مولانا فیاض احمد صاحب اور حضرت مولانا سراج الحق صاحب طلباء کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ چھوڑ کر سہارنپور کے لئے روانہ ہوگئے۔ یکم جمادی الاولی مطابق ۳۰/ مارچ یوم جمعہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء حضرت مولانا فیاض احمد صاحب اور حضرت مولانا سراج الحق صاحب دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور وہاں حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی اور دوسرے اساتذہ وطلباء سے ملاقات کی، اس کے بعد سہارنپور واپس چلے گئے۔ ۴/ جمادی الاولیٰ مطابق ۲/اپریل

یوم دوشنبہ ۱۹۷۹ء کو معلوم ہوا کہ آج شام طلباء کے ساتھ یہ دونوں حضرات پانچ بج کر پینتیس منٹ والی ٹرین سے پھولپور الہ آباد کے لئے روانہ ہوگئے۔

پھول پور کے کچھ طلباء مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں زیر تعلیم تھے، ان میں ایک عبد اللہ پھولپوری نام کے بھی طالب علم تھے جو حضرت مولانا فیاض احمد صاحب سے بہت مانوس اور قریب تھے۔ مدرسہ اشرف العلوم چھوڑ کر نکلنے والوں میں وہ بھی شامل تھے، انہی کی خواہش و اصرار اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے یہ حضرات پھولپور پہونچے۔ پھولپور میں پہلے سے ایک چھوٹا سا مکتب چل رہا تھا اور پھولپور کی قدیمی عیدگاہ سے متصل مشرقی حصہ میں دو ہال اور دو کمروں پر مشتمل ایک مختصر سی عمارت تھی، اسی میں یہ علمی قافلہ اور علم وفن کے آفتاب و ماہتاب اور اس کے درخشندہ ستارے فروکش ہوئے اور پورے مجاہدہ اور تنگدستی کے ماحول میں بشمولیت عیدگاہ مہمانان رسول نے بسر وچشم اس جگہ کو اپنے قیام اور علمی ضیا پاشی کے لئے قبول کیا۔ اگر چہ چند سالوں کے بعد علاقائی بعض مخیّرین کے تعاون سے عیدگاہ کے اتر جانب ایک وسیع جگہ خرید کر مدرسہ قائم ہوگیا اور بقدر ضرورت کمروں کی تعمیر کے ساتھ دوسری اہم ضرورتوں کی بھی تکمیل اللہ نے کردی۔

بہر حال یہ حادثہ راقم کے لئے بہت دکھ بھرا تھا، چونکہ اچانک وہ گلستان علم وفن اجڑ گیا اور اس کی ساری بہاریں ختم ہوگئیں۔ ادھر مدرسہ اشرف العلوم کے ناظم حضرت قاری شریف احمد صاحب گنگوہی کا بلاوا راقم کے نام شروع ہوا، یوں بھی تعزیت کے لئے راقم کو حاضری دینی ہی تھی۔ چنانچہ ۱۴/ جمادی الاولی مطابق

۱۲/اپریل یوم جمعرات ۱۹۷۹ء کی شام کو راقم گنگوہ پہونچا اور جمعہ اور سنیچر وہاں قیام کر کے حضرت ناظم صاحب کی زبانی تفصیلات سے آگہی حاصل کرنے کے بعد ۱۷/ جمادی الاولی مطابق ۱۵/اپریل یوم اتوار ۱۹۷۹ء کی شام کو گنگوہ سے دیوبند واپسی ہوئی۔

گنگوہ قیام کے دوران حضرت ناظم صاحب نے مدرسہ اشرف العلوم سے نکلے ہوئے ایک استاذ سے متعلق ایک اہم بات تحریری شکل میں دینے کا حکم دیا، لیکن راقم نے فی الفور تحریر دینے سے معذرت کر دی اور یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ دیوبند سے لکھ کر بھیج دوں گا۔ دیوبند آنے کے بعد میں نے اس زاویہ پر بہت غور کیا، لیکن کسی بھی اعتبار سے ضمیر نے وہ تحریر لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ادھر بار بار تحریر کا مطالبہ ہوتا رہا اور راقم اس کو ٹالتا رہا۔ بالآخر اللہ نے میری حفاظت فرمائی اور اس غلط تحریر سے راقم بچ گیا۔

جس کا اثر حضرت ناظم صاحب کے دل پر بہت ہوا اور وہیں سے راقم ان کی نظر سے گر گیا ورنہ شاید فراغت کے بعد تدریس کے لئے مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ ہی میں رہنا پڑتا۔

دہلی کا سفر

۳/صفر مطابق ۳/جنوری بروز بدھ ۱۹۷۹ء کو راقم پہلی مرتبہ بذریعہ ٹرین دہلی پہونچا اور چند روز دہلی میں قیام رہا، اس قیام کے دوران پہلی مرتبہ مرکز نظام الدین

قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ، جامع مسجد، مدرسہ حسین بخش اور دیگر تاریخی مقامات دہلی دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۲/صفر مطابق ۱۲/جنوری ۱۹۷۹ء کو دار العلوم دیوبند واپسی ہوئی۔ دوبارہ ۱۸/ جمادی الاولی مطابق ۱۶/اپریل یوم سنیچر ۱۹۷۹ء بھائی کلیم اللہ کے ہمراہ دہلی جانا ہوا۔ بھائی کلیم اللہ جو چوتھے نمبر کے حقیقی اور سگے بھائی ہیں جن کی تعلیم والد صاحب مرحوم نے یہ کہہ کر موقوف کردی کہ سب پڑھنے ہی میں لگ جائیں گے تو میرا ساتھ کون دے گا۔ اور پوری زندگی انہوں نے زراعت کے کام میں والد صاحب مرحوم کا بھرپور ساتھ دیا اور برادران ثلاثہ کی طرف سے گھریلو کام کاج میں وہ وقایہ اور کفایہ بنے رہے اور انہی برادران ثلاثہ کی وجہ سے ان کی تعلیمی راہ مسدود ہوگئی، وہ زندگی میں پہلی مرتبہ تبلیغی جماعت میں نکلے۔ ۱۷/ جمادی الاولی مطابق ۱۵/اپریل بروز اتوار ۱۹۷۹ء کو پہلی مرتبہ دیوبند پہونچے، گنگوہ سے واپسی پر رات میں ان سے ملاقات ہوئی اور رات کا قیام دیوبند میں کیا اور کل ہوکر ان کو لے کر دہلی نظام الدین مرکز پہونچا چند روز مرکز میں قیام کے بعد ۲۲/ جمادی الاولی مطابق ۲۰/اپریل یوم جمعہ ۱۹۷۹ء کو میوات کے لئے ان کی جماعت کو روانہ کرکے ۲۲/اپریل ۱۹۷۹ء کو راقم دیوبند واپس آ گیا۔

اخراجات کی تلافی کی راہ

راقم کے ماہانہ اخراجات کی ابتداء سات روپئے سے ہوئی اور انتہاء پچیس روپئے پر ہوگئی، جب دورۂ حدیث کی تعلیم کے لئے راقم دار العلوم دیوبند پہونچا اور وہاں

ذاتی اخراجات کی تکمیل مشکل ہوئی تو برادر اکبر جنہوں نے راقم کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی ان کو خط لکھا کہ پچیس روپئے ماہانہ میں واجبی اخراجات کی تکمیل مشکل ہو رہی ہے۔ اس لئے پانچ روپیہ بڑھا کر تیس کر دیا جائے، اس کے جواب میں برادر اکبر نے لکھا کہ میں بھیجنے کو سو روپیہ ماہانہ بھی بھیج سکتا ہوں، لیکن پوری زندگی کے اخراجات کی تکمیل تمہاری ذاتی کمائی پر منحصر ہوگی۔ جب تمہاری عیالداری میں بیوی بال بچے بھی ہوں گے تو اگر ابھی سے کفایت شعاری اور کنٹرول کے ساتھ خرچ کرنے کا مزاج نہیں بناؤ گے تو آگے چل کر تم کو دشواری و پریشانی ہوگی، اس لئے جو بھیجا جا رہا ہے، یعنی پچیس روپئے ماہانہ اسی پر قناعت کرو اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرو۔

اس ناصحانہ خط پر غصہ بھی بہت آیا لیکن آگے کچھ کہنے کی ہمت و جرأت نہیں ہوئی۔ البتہ اس جواب سے راقم نے حضرت والد صاحب مرحوم کو آگاہ کر دیا، والد صاحب نے بھی سکوت اختیار فرمایا کوئی جواب نہیں دیا۔

ادھر راقم نے دیکھا کہ ہمارے کچھ روم پارٹنر ایک کتب خانہ سے ہندی کی ووٹر لسٹ لا کر اس کو اردو میں لکھ کر جمع کرا کر کچھ معاوضہ حاصل کر رہے ہیں۔ راقم نے بھی دیکھا دیکھی اپنی مجبوری کے ازالہ کے لئے اور اخراجات واجبہ کی تکمیل کے لئے اسی راہ کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ ووٹر لسٹ کو اردو میں لکھنے کا کام راقم نے بھی شروع کر دیا اور اس سے حاصل شدہ پیسوں سے اپنی ضروریات کی تکمیل شروع کر دی۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک چلتا رہا اور اس طرح عافیت کے ساتھ سال پورا ہو گیا اور دوبارہ اخراجات کے لئے درخواست پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کا انتقال

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں بسلسلہ تعلیم قیام کے دوران بالخصوص دارالطلباء قدیم میں رہتے ہوئے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور استفادہ کا موقع حاصل ہوا تھا، مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں قیام کے دوران بھی جب کبھی سہارنپور آنا جانا ہوتا اور دیگر اکابر کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سے ضرور ملاقات کرتا تھا اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر علمی وروحانی فیض حاصل کرتا۔

جس سال راقم دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں تھا۔ ۱۵ر رجب مطابق ۱۱ر جون ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء یوم دوشنبہ کی صبح ۶ر بجے دارالعلوم دیوبند کی مسجد کے مائک سے اعلان ہوا کہ رات حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر سن کر بہت افسوس اور قلق ہوا، صبح کی ٹرین سے اکثر طلباء و اساتذہ نماز جنازہ کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ راقم بھی بذریعہ ٹرین سہارنپور پہونچا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ایک بج کر دس منٹ پر حضرت ناظم صاحب کی روح پرواز کرگئی۔ دن میں گیارہ بج کر بیس منٹ پر دار جدید کے وسیع وکشادہ میدان میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ جنازہ کی نماز غالباً حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی نے پڑھائی اور تقریباً ۱۲۰۰۰ ہزار لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی

اورنم آنکھوں کے ذریعہ شاہ ولایت قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

ختم مسلسلات میں شرکت

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں ہر سال بہت اہتمام کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب جمعہ کے دن مسلسلات کا ختم کرایا کرتے تھے جس میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے طلباء و اساتذہ اور قرب و جوار کے مدارس کے طلباء و اساتذہ بالخصوص دار العلوم دیوبند کے طلباء بھی کثرت سے شرکت کیا کرتے تھے۔ معمول کے مطابق آبِ زم زم اور مدینہ طیبہ کی کھجور بھی تقسیم ہوتی تھی، عبارت خوانی میں زیادہ حصہ حضرت مولانا یونس صاحب جونپوری، حضرت مولانا سلمان صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا شاہد صاحب سہارنپوری کا ہوا کرتا تھا۔ گاہ بگاہ تھوڑی بہت عبارت دوسرے حضرات بھی پڑھا کرتے تھے۔

یوں تو اس پروگرام میں راقم کئی مرتبہ شریک ہو چکا تھا، لیکن جس سال دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں تھا معلوم ہوا کہ ۱۷ر شعبان مطابق ۱۳ر جولائی یوم جمعہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مسلسلات کا ختم فرمائیں گے۔

چنانچہ راقم بھی دار العلوم سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور پہونچا اور ختم مسلسلات کے پروگرام میں شرکت کی اور سند حاصل کر کے رات میں دیوبند واپس آ گیا، چونکہ یہ ایام امتحان سالانہ کے تھے اور کل ہو کر مسلم شریف کا پرچہ تھا، اس لئے

واپسی کے بعد امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی

جس سال یہ راقم دورۂ حدیث کی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں تھا۔ ۶؍جمادی الثانیہ مطابق ۴؍اپریل ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء بروز بدھ یہ اطلاع دارالعلوم دیوبند میں گشت کرنے لگی کہ آج رات دو بجے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو اور ہندوستان میں اندرا گاندھی ان دونوں کا ماہر سیاست دانوں میں شمار ہوتا تھا، یہ دونوں عالی ظرف، بلند حوصلہ، پُر ہمت و پُرعزم سیاست داں تھے۔ پاکستان میں قادیانیوں پر کفر کا فتویٰ اور خارج اسلام ہونے کا عمل ذوالفقار علی بھٹو کے دور اقتدار میں اور انہی کی کاوشوں سے وجود میں آیا تھا اور مسلم قائدین میں وہ بہت باہمت اور زیرک اور باہوش سیاست داں تھے، لیکن یہود و نصاریٰ کی آنکھوں کے لئے ان کی دانشمندی کانٹا بن گئی۔ بالآخر ایک دن وہ آیا کہ مختلف مراحل سے گزار کر ان کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا اور ان کی دانشمندی سے مسلم قیادت کو محروم کر دیا گیا۔

حضرت قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا خطاب

۱۲؍محرم الحرام مطابق ۳؍دسمبر ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۷۹ء یوم دوشنبہ کو عشاء کی

نماز کے بعد دار الحدیث فوقانی میں حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کا خطاب ہوا جس میں تمام طلباء اور اساتذہ نے شرکت کی، اس خطاب میں حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب الہ آبادی خلیفہ ومجاز حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی کا ایک خواب بیان کیا کہ جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کو خواب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاکٹر صاحب کو پانچ روپیہ عطا فرمایا اور فرمایا کہ اس میں سے ایک روپیہ مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی کو اور ایک روپیہ مولانا علی میاں ندوی کو اور ایک روپیہ مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی کو، اور ایک روپیہ قاری محمد طیب صاحب کو اور ایک روپیہ دار العلوم دیوبند میں ہونے والے جشن صد سالہ میں دے دینا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ تم لے جا کر ان سب کو پہونچا دو۔

چنانچہ وہ ایک روپیہ لے کر جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچ کر وہ امانت پیش کی۔ اسی خواب کو بتلانے اور طلباء و اساتذہ تک اس کی اطلاع پہونچانے کے لئے دار الحدیث فوقانی میں تقریب منعقد کی گئی۔

چنانچہ اس خواب کو سننے کے بعد تمام موجود طلباء نے پوری فراخدلی کے ساتھ ہونے والے جشن صد سالہ کے لئے اپنا اپنا تعاون پیش کیا، اس کے بعد مجلس اختتام پذیر ہوگئی۔

جلسۂ ختم بخاری شریف

۲۰؍شعبان مطابق ۱۶؍جولائی یوم دوشنبہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء کو بخاری شریف کا سالانہ امتحان ہوا اور اسی دن ظہر کے بعد دارالحدیث تحتانی میں حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب نے بخاری شریف کا اختتام فرمایا۔ جس میں دارالعلوم دیوبند کے طلباء کے علاوہ علاقائی عوام وخواص کے بڑے مجمع نے شرکت کی۔ آخری حدیث پر حضرت مولانا نے تقریر فرمائی اس کے بعد دعاء کرائی جس میں پورا مجمع رو پڑا۔ انتہائی پُراثر دعاء پر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

اس طرح راقم کا سال مکمل ہوگیا اور دارالعلوم دیوبند کی نسبت حاصل ہوگئی۔ سالانہ امتحان سے فراغت کے بعد چندروز کے لئے وطن جانا ہوا۔

رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

اس کے بعد رمضان المبارک میں واپسی ہوگئی اور پورا رمضان حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خانقاہ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے دار جدید کی مسجد میں گزارا۔ دوران قیام تراویح اور دیگر معمولات میں پابندی سے شرکت رہی۔

اسی رمضان میں راقم حضرت شیخ الحدیث صاحب کے دست مبارک پر بعد

نماز ظہر معتکف میں پہونچکر بیعت ہوا حضرت شیخ لیٹے ہوئے تھے اور میرے ہاتھ کو اپنے دست مبارک میں لیا اور سینہ پر رکھلیا اور بیعت کے کلمات کہلوائے اور معمولات کی تلقین فرمائی۔

ایک کثیر مجمع اعتکاف میں تھا، عوام سے زیادہ خواص تھے، حضرت شیخ کے تمام خلفاء تقریباً اعتکاف میں تھے اوپر نیچے مسجد بھری ہوئی تھی اور جن مہمانوں کو اعتکاف کے لئے جگہ نہیں ملی ان کا قیام دار جدید کے کمروں میں تھا۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، سعودیہ، مکہ، مدینہ، ساؤتھ افریقہ، لندن کے بھی مہمان تھے۔

لندن کے مولانا یوسف متالا اوران کے بھائی بھی موجود تھے۔ حضرت مولانا یوسف متالا نے دار العلوم بری کی تدریسی خدمت کے لئے راقم سے خواہش کا بھی اظہار فرمایا، لیکن راقم تیار نہیں ہوا اوران سے معذرت کرلی۔ اندر کے ناظم اعتکاف حضرت مولانا منور حسین صاحب تھے اور باہر کے ناظم مہمانوں کے کھانے پکانے کے ذمہ دار مولانا نصیر صاحب تھے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی اور حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی بھی چندروز کے لئے رمضان المبارک میں تشریف لائے۔

ظہر سے قبل دس بجے سے گیارہ بجے تک حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کا پُرمغز و پُر اثر بیان ہوتا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد ختم خواجگان اوراس کے بعد دعاء بھائی طلحہ کراتے تھے، اس کے بعد اجتماعی ذکر کی مجلس ہوتی تھی۔

عصر کے بعد کتابی تعلیم ہوتی، افطاری سے قبل تعلیم ختم ہوجاتی اور تمام مہمان

دسترخوان پر پہونچ جاتے جس کے انتظام کے لئے ایک مضبوط ٹیم تھی جس میں حضرت مولانا منور حسین صاحب کے عزیز مولانا انوار صاحب، حال ناظم دار العلوم بہادر گنج، کشن گنج بھی تھے بلکہ ان کا رول قائدانہ ہوتا تھا۔

افطاری کے بعد مغرب کی نماز ہوتی، نماز کے بعد اوابین اور دیگر معمولات میں لوگ مصروف ہو جاتے، عشاء سے قبل کھانا ہو جایا کرتا تھا، جس میں گوشت روٹی اور سہارنپوری پلاؤ کا اہتمام ہوتا تھا۔

تراویح کی نماز حضرت مولانا سلمان صاحب پڑھاتے تھے جو قرآن پاک بہت صاف اور بہت تیز پڑھتے تھے۔

عموماً روزانہ تراویح میں تین پارہ پڑھانے کا معمول تھا، تراویح اور وتر سے فارغ ہونے کے بعد یٰسین شریف کا ختم ہوتا تھا، اس کے بعد چہل حدیث درود وسلام کی پڑھی جاتی تھی، اس کے بعد تھوڑی دیر کوئی کتاب ہوتی تھی جو حضرت مولانا معین الدین صاحب گونڈوی پڑھا کرتے تھے، اس کے بعد دعاء ہوتی اور دعاء کے بعد خرافات کی مجلس ہوا کرتی تھی، یہ جملہ بھی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا دیا ہوا تھا، یعنی چائے پکوڑی، سموسہ و دیگر چیزوں کے کھانے پینے کی مجلس ہوتی تھی، اس سے فارغ ہو کر کچھ حضرات آرام کرتے تھے اور کچھ نوافل وتلاوت وغیرہ میں سحری تک مشغول ہو جاتے تھے۔

سحری سے قبل لوگ بیدار ہوتے اور حنفی مسلک کے مطابق اجتماعی وانفرادی تہجد کی نماز میں مشغول ہو جاتے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اجتماعی سحری کا نظم ہوتا جس میں سبھی حضرات شرکت فرماتے، سحری سے فارغ ہونے کے بعد فجر کی نماز ہوتی،

فجر کی نماز کے بعد بلیک آؤٹ ہو جاتا اور سبھی حضرات آرام فرماتے، دوپہر ۹-۱۰ بجے سے بیدار ہونا شروع ہوتے اور حسب معمول انفرادی واجتماعی اعمال میں لگ جاتے۔

ان معمولات کے ساتھ پورا مہینہ مکمل ہوا۔ عید کا چاند نکلا، بیشتر حضرات جو قریب کے تھے عید کے لئے وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور جو حضرات دور کے تھے انہوں نے وہیں عید کی نماز ادا کی۔

مدرسہ مظاہر علوم دار جدید کی مسجد میں جہاں اعتکاف ہوا تھا وہیں عید کی نماز ادا کی گئی۔ راقم نے بھی عید الفطر کی نماز وہیں ادا کی اور اس طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی معیت میں پورا رمضان گزرا۔

راقم کے لئے افتاء کا فیصلہ

اسی رمضان میں جب کہ راقم اپنے معمولات میں لگا ہوا تھا اور اپنے ذہنی رجحان کے مطابق عید کے بعد درس وتدریس میں لگنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ اسی اثناء میرے بعض بڑوں نے رمضان ہی میں مجھ کو یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو عید کے بعد دار العلوم دیوبند میں افتاء پڑھنا ہے اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی خدمت میں سال بھر رہنا ہے۔ راقم ذہنی طور پر افتاء کے لئے تیار نہیں تھا، چونکہ افتاء کی ذمہ داریوں سے اور اس کی اہمیت وتقدس سے بخوبی واقف تھا، لیکن بڑوں کے مسلسل اصرار اور فیصلے کی وجہ سے بادل ناخواستہ تیار ہونا پڑا۔

چنانچہ ان بڑوں نے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خانقاہ میں موجود حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری سے راقم کی ملاقات کرائی اور ان حضرات نے ان سے میرے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا، ان کے مشورے سے خانقاہ میں موجود ایک بزرگ حضرت مولانا شاہ عبد الحلیم صاحب جونپوری سے ملاقات کروائی اور ان سے بھی میرے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

چنانچہ انہوں نے ایک مکتوب حضرت قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام لکھ کر عنایت فرمایا اور یہ حکم دیا کہ یہ خط حضرت مہتمم صاحب تک پہونچادیں۔

چنانچہ رمضان مکمل ہونے کے بعد راقم دیوبند گیا اور حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب جونپوری کا مکتوب گرامی حضرت قاری طیب صاحب کے سپرد کیا، اس کے بعد وطن مالوف کے لئے راقم روانہ ہوگیا۔

چند ہفتوں کے بعد پھر دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی اور حسب ضابطہ داخلہ فارم بھر کر دفتر تعلیمات کے سپرد کردیا اور اس کے بعد دعاء میں مصروف ہوگیا کہ اللہ کرے کہ میرا داخلہ نہ ہوتا کہ ان بڑوں کو جواب دینے کے لئے مجھے موقعہ مل جائے اور میں اپنی خواہش کے مطابق درس وتدریس میں مصروف ہوجاؤں۔

راقم کو اس وقت بہت خوشی ہوئی اور اپنی دعاء کی قبولیت کی امید بڑھ گئی جب راقم نے اپنے ہم وطن کئی ساتھیوں کے داخلہ فارم کے ساتھ منسلک درجنوں اکابرین وقت کی انکے افتاء کے لئے داخلہ کی سفارش دیکھا۔

لیکن جب افتاء کے طلباء کے انتخاب کی نشست دارالعلوم دیوبند کے دفتر

اہتمام میں منعقد ہوئی اور اس کے اختتام کے بعد ناظم دار الافتاء حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی کے مکان پر پہونچ کر ملاقات کی تو راقم کو دیکھتے ہی فوراً مسکرائے اور فرمایا کہ مبارک ہو انتخاب میں تمہارا نام آگیا ہے۔

میں نے فوراً زور سے "**إنا لله و إنا لله راجعون**" پڑھا، پھر حضرت سے میں نے پوچھا کہ ایسا کیسے ہوگیا، جب کہ میرے بہت سے ہم وطن اور رفقاء درس کی درخواست کے ساتھ بڑی بڑی سفارشات تھیں، اس کے جواب میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے فرمایا کہ جب انتخابی نشست شروع ہوئی تو حضرت قاری طیب صاحب نے فرمایا کہ آج انتخاب کا معیار یہ رکھا جائے کہ جس ضلع کی جتنی درخواستیں موجود ہیں ان طلباء کے دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان کے نمبرات دیکھے جائیں اور جس کا نمبر سب سے زیادہ ہو اس کا انتخاب کرلیا جائے۔

چنانچہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو تمہارے ہم وطنوں میں سب سے زیادہ نمبر تمہارا نکلا۔ اس طرح تمہارا نام انتخاب میں آگیا اور سفارش والی درخواستیں مسترد ہوگئیں۔ اس طرح دار الافتاء کی شمولیت کی راہ ہموار ہوگئی اور ہمارے بڑوں کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔

اس وقت دار الافتاء میں تیس طلباء تھے دس دس کی جماعت بنا کر تین مفتیان کرام کے درمیان سب کی تقسیم عمل میں آئی۔ ایک جماعت حضرت مفتی نظام الدین صاحب کے سپرد ہوئی اور دوسری جماعت حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب کے سپرد ہوئی اور تیسری جماعت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے سپرد ہوئی۔

چونکہ اس وقت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی دونوں آنکھوں کی بینائی نہیں تھی جس کی وجہ سے انکے فتاوی نویسی کے لئے راقم کا انتخاب عمل میں آیا۔

دارالافتاء مسجد قدیم کے حوض کے بالائی حصہ پر تین کمروں پر مشتمل تھا، ایک کمرہ میں حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی اوران کے بائیں طرف حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب کی نشست تھی، بیچ والے کمرہ میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب اوران کے بائیں طرف مفتی کفیل الرحمٰن نشاط اوران کے داہنے طرف اور سامنے دار الافتاء کے تین محرر قاری اخلاق احمد صاحب دیوبندی، مولانا خورشید صاحب دیوبندی اور حافظ صدیق صاحب بیٹھتے تھے اوراتر طرف کا آخری کمرہ دارالافتاء سے متعلق کتابوں کا کتب خانہ تھا جس سے حسب ضرورت حضرات مفتیان کرام وطلباء استفادہ کرتے تھے۔

رسم المفتی اور الاشباہ والنظائر کا درس حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے سپرد ہوا، مسجد چھتہ کا وہ کمرہ جوخلوت گاہ قاسمی کے نام سے مشہور ہے وہی کمرہ حضرت مفتی صاحب کی قیام گاہ تھی اوراسی میں رسم المفتی اورالاشباہ کا درس ہوا کرتا تھا اور درمختار کا درس حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب کے سپرد ہوا، اس کا درس وہ اسی کمرہ میں دیا کرتے تھے جس کمرہ میں فتاوی نویسی فرمایا کرتے تھے اور سراجی کا درس حضرت مفتی نظام الدین صاحب کے سپرد ہوا جس کا درس اس کمرہ میں ہوا کرتا تھا جس کمرہ میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب کی نشست تھی۔

راقم کا انتخاب چونکہ اس جماعت میں ہوا جو حضرت مفتی محمود حسن صاحب

گنگوہی کے سپرد ہوئی، مزید برآں حضرت کے فتاوی نویسی کے لئے چونکہ راقم ہی کو متعین کیا گیا اس لئے پورے سال حضرت مفتی صاحب کے فتاوی کے املاء کے ساتھ درسگاہ اور قیام گاہ پر ساتھ رہنے اور خدمت کرنے اور فتاوی نویسی کا خوب موقع ملا، پورے سال میں دسیوں ہزار سے زیادہ فتاوی نویسی کی سعادت نصیب ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتاوی نویسی کے نوک و پلک اور مسائل کے استنباط واستخراج اور تطبیق وانطباق کے ساتھ حوادث الفتاوی کی تطبیق اور مسائل کی تفہیم وتشریح اور انداز تعبیر اور تطویل واختصار کا خوب تجربہ حاصل ہو گیا جس سے ہمارے دوسرے رفقاء محروم رہے۔

افتاء کے سال کے چند واقعات

(۱) دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء میں ڈاک سے سوالات کثرت سے آتے تھے، اس کے علاوہ زبانی مسائل معلوم کرنے والے بھی آتے جاتے رہتے تھے، دار الافتاء کی ڈاک تینوں مفتیان کرام کے درمیان تقسیم کرنے کی ذمہ داری قاری اخلاق صاحب کی تھی، ادھر کام کی کثرت فتاوی کی زیادتی، جواب لکھنے کا بوجھ اور جلد از جلد جواب کی ترسیل کی فکر اسی کے ساتھ اکثر وبیشتر حضرت مولانا ارشاد صاحب مبلغ دار العلوم دیوبند دار الافتاء میں تشریف لا کر بیٹھ جاتے اور مناظرہ کے واقعات سنانا شروع کر دیتے جس میں اچھا خاصا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔

حضرت مولانا ارشاد صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کا واقعہ

ایک روز حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے راقم نے عرض کیا کہ حضرت اس کا کوئی علاج نہیں ہے، حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ کل جب آ کر بیٹھیں اور مناظرہ کا واقعہ سنانا شروع کریں اور اس پر جب صراحۃ النص، عبارۃ النص، دلالت النص، اقتضاء النص کا استعمال کریں جس کو وہ کثرت سے استعمال کرتے تھے تو تم سوال کر لینا کہ حضرت صراحۃ النص، عبارۃ النص، دلالت النص، اور اقتضاء النص کس کو کہتے ہیں۔

چنانچہ کل ہو کر جب مولانا ارشاد صاحب تشریف لائے تو اتفاق سے دوران گفتگو ان دلالتوں کا انہوں نے تذکرہ کیا اس پر راقم نے ان سے وہی سوال کر دیا جو حضرت مفتی صاحب نے بتایا اور سکھایا تھا۔ اس پر حضرت مولانا ارشاد صاحب بہت برہم ہوئے اور ناراض ہو کر فرمانے لگے کہ افتاء میں آ گئے ہو اور ابھی تمہیں ان دلالتوں کی بھی خبر نہیں ہے، کیا پڑھتے ہو، جاؤ نور الانوار میں لکھا ہوا ہے دیکھ لینا، آگے انہوں نے اپنا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے جیسے فضلاء جب فارغ ہو کر میدان میں کام کرنے کے لئے جاتے ہیں اور جب سوال کیا جاتا ہے تو جواب نہیں دے پاتے۔ اکسٹھ باسٹھ کرتے ہیں، جب حضرت مولانا ارشاد صاحب برہم ہو کر راقم پر برس رہے تھے تو حضرت مفتی صاحب مزہ لے کر مسکرا رہے تھے۔

بالآخر اور دنوں کے مقابلہ میں ناراض ہو کر دار الافتاء سے جلد ہی رخصت

ہو گئے اور راقم نے اپنا کام شروع کر دیا، چھٹی کے بعد مسجد چھتہ جب جانے لگے تو روڈ پر چلتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے راقم سے فرمایا کہ حبیب اللہ مزہ نہیں آیا، مزہ تو جب آتا جب دارالافتاء کے کتب خانہ سے نورالانوار لاکر ہاتھ میں دیدیتے اور کہتے کہ حضرت آپ ہی بتا دیجئے کہ نورالانوار میں کہاں ہے وہ کبھی بھی نہ بتا پاتے۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ مزاج تھا کہ اس انداز کے چھبتے ہوئے سوالات دوسروں سے کروا کر خود لطف اندوز ہوتے تھے۔

تذکرہ قاری اخلاق صاحب

(۲) اسی طرح دارالافتاء کے محرر قاری اخلاق صاحب بھی اکثر حضرت مفتی صاحب کی نشست پر آکر کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے لطائف وظرائف سنانا شروع کر دیتے تھے، جس میں گھنٹہ پون گھنٹہ کا وقت روزانہ ہی تقریباً ضائع ہو جایا کرتا تھا۔ راقم نے حضرت مفتی صاحب سے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حضرت قاری اخلاق صاحب کو آنے سے منع کر دیں تاکہ وقت ضائع نہ ہو، لیکن صراحتاً حضرت منع نہیں کر سکے اور یہ سلسلہ سال بھر چلتا رہا۔

تذکرہ مفتی احمد علی سعید صاحب

(۳) حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب کی نشست چونکہ اسی کمرہ میں تھی

جس میں حضرت مفتی صاحب کی نشست تھی، اس لئے طرفین سے اکثر و بیشتر مزاح کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

حضرت مفتی احمد علی سعید حضرت مولانا مبارک علی صاحب جو دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم بھی رہے، ان کے برخوردار تھے اور دار العلوم کے دارالافتاء کے مفتی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب نے سنایا کہ جب انہوں نے دوسری شادی کی، اس وقت حضرت مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری باحیات تھے اور نماز کے لئے دارالافتاء کے نیچے مسجد کے حوض پر وضوء فرمارہے تھے، اسی درمیان کسی صاحب نے جاکر ان کو یہ اطلاع دی کہ حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے، تو حضرت مفتی مہدی حسن صاحب نے وضوء فرماتے ہوئے یہ جواب دیا۔ ع

مٹی پلید ہوگئی مفتی سعید کی

جب ریاض العلوم گورینی راقم کی حاضری ہوئی، سرائے میر جو ضلع اعظم گڑھ کا ایک معروف قصبہ ہے، وہاں کے امیر جماعت جناب احمد حسن خاں صاحب جن سے راقم کی بہت بے تکلفی تھی، ایک مرتبہ بنارس کے تبلیغی اجتماع میں جانا ہوا، قافلہ جس گاڑی میں تھا اس میں اکثر علماء تھے، راقم نے دوران سفر احمد حسن خاں صاحب سے یہ پورا واقعہ سنایا اور یہ مصرع سنا کر ان سے کہا کہ آپ کو شعر وسخن کا بڑا اچھا ذوق ہے، لہٰذا اس مصرعہ کو مکمل کر دیجئے انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ ع

لے کر خبر جو آئے محرم میں عید کی

اس برجستگی پر سارے علماء بہت محظوظ ہوئے اور سب نے مل کران کو بہت داددیااور پوراشعر یہ بن گیا ۔

لے کر خبر جو آئے محرم میں عید کی
مٹی پلید ہوگئی مفتی سعید کی

کچھ عرصہ کے بعد جب دار العلوم دیوبند جانا ہوا تو حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے راقم نے پورا واقعہ سنایا اس کے ساتھ احمد حسن خان صاحب کا دوسرامصرعہ بھی سنایا، حضرت مفتی صاحب بھی یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

(۴)ایک مرتبہ دارالافتاء میں حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو بتلایا کہ حضرت رات میں نے تیس فتوے لکھے، اس پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے کمال کر دیا اور کافی دیر تک دونوں حضرات آپس میں مزاح فرماتے رہےاور مزاحیہ جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

حضرت مفتی احمد علی سعید کا واقعہ

(۵)ایک مرتبہ کی بات ہے کہ حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب دارالافتاء میں تشریف لائے ، حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی پہلے سے تشریف فرماں تھے، آنے کے بعد حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب نے فرمایا کہ حضرت آج تو آپ سے

مٹھائی کھانی ہے، حضرت مفتی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ''حلوہ خوردن موئے باید'' کہ مٹھائی کھانے کا وقت نکل گیا ہے، اب وقت نہیں رہا، کچھ دیر تک طرفین میں مزاح کا سلسلہ جاری رہا، اخیر میں حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب مصر ہو گئے تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس زکوۃ کے پیسے ہیں اگر حلوہ کھانا ہو تو بولو۔ حضرت مفتی احمد علی سعید نے کہا کہ آپ نکالیں، حضرت مفتی صاحب نے زکوۃ کے پیسے سے سو روپیہ نکالا، حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب نے دارالافتاء کے ایک طالب علم کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں سو روپئے دیئے اور فرمایا کہ یہ تم کو ہدیہ ہے، اس نے قبول کر کے جیب میں رکھ لیا اس کے بعد اس سے فرمایا کہ اگر ہمیں اپنی طرف سے مٹھائی کھلا سکتے ہو تو کھلا دو۔ چنانچہ وہ دکان پر گیا اور اپنی طرف سے ایک کلو مٹھائی خرید کر لایا پھر سب نے بیٹھ کر مٹھائی کھائی، اس طرح بالآخر حضرت مفتی احمد علی سعید صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے مٹھائی وصول کر ہی لیا۔

ایک سائل کا واقعہ

(۶) مسجد چھتہ میں ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور انہوں نے آکر کچھ سوال کیا، حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس وقت میرا ہاتھ خالی ہے، جب سائل واپس ہو گیا تو راقم نے تخلیہ میں حضرت سے کہا کہ حضرت آپ نے سائل کو خالی واپس کر دیا، حالانکہ دینے کے لئے آپ کی جیب میں تو پیسے تھے،

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ اس کو سوال کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے، وہ اکثر آتا رہتا ہے اور اسی طرح سوال کرتا رہتا ہے، میرے نزدیک وہ زکوۃ کا مستحق نہیں تھا، اس لئے میں نے کہہ دیا کہ میرے ہاتھ خالی ہیں اور میں نے غلط بھی نہیں کہا، اس لئے کہ میرے جیب میں پیسے تھے، ہاتھ میں نہیں، اس وقت میرے دونوں ہاتھ خالی تھے، اب سمجھنے کو وہ جو چاہے سمجھے میں نے توریہ سے اپنی جان بچالی۔

رکشہ والے کا واقعہ

(۷) حضرت مفتی صاحب کا معمول یہ تھا کہ ہر جمعرات کو سہارنپور تشریف لے جایا کرتے تھے اور جمعہ کی شام کو دیوبند واپسی ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سہارنپور بس سے اترنے کے بعد رکشہ پر بیٹھ گئے، اس سے کرایہ طے نہیں کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے مکان پر پہونچ کر معمول کے مطابق معہود کرایہ جب اس کو دیا تو رکشہ والے نے لینے سے انکار کر دیا اور اس نے زیادہ کا مطالبہ شروع کیا، اس پر حضرت مفتی صاحب نے رکشہ والے کے سامنے راقم کو بہت ڈانٹا اور فرمایا کہ رکشہ پر بیٹھنے سے پہلے کرایہ طے کر لینا چاہئے تھا، جب تم نے کرایہ طے نہیں کیا تو اب جتنا یہ مانگ رہا ہے اتنا دو۔ چنانچہ اس کے مطالبہ کے مطابق پیسے دے کر اپنی جان چھڑائی اور ہمیشہ کے لئے مسئلہ ذہن میں پیوست ہو گیا کہ کرایہ طے کر کے سواری پر بیٹھنا چاہئے۔

تذکرہ سفر امروہہ

(۸) ایک مرتبہ بحیثیت خادم حضرت مفتی صاحب کے ساتھ امروہہ جانا ہوا، قاری عثمان صاحب منصور پوری کی دعوت پر یہ سفر ہوا تھا، امروہہ کی جامع مسجد میں ایک مدرسہ چلتا ہے اسی میں قیام ہوا اور قاری عثمان صاحب منصور پوری چونکہ اصل داعی تھے، اس لئے ان کے گھر پر بھی جانا ہوا، اس وقت مفتی سلمان منصور پوری مفتی عفان منصور پوری بہت چھوٹے تھے، خورد سال ہونے کے باوجود دونوں کا مطالعہ اچھا تھا، اکابر کی تاریخ سے واقفیت اچھی تھی، حضرت مفتی صاحب سے سوالات بھی ان بچوں نے بہت کئے، حضرت نے بہت بشاشت کے ساتھ اطمینان بخش جواب دونوں کو دیا، حضرت قاری عثمان صاحب منصور پوری کی پُر تکلف دعوت سے بھی محظوظ ہوئے، امروہہ میں ایک دوسرا مدرسہ چلہ میں تھا، وہاں بھی حضرت مفتی صاحب تشریف لے گئے اور طلباء اساتذہ میں وعظ فرمایا، اس وقت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی جو اعظم گڑھ کے تھے وہاں شیخ الحدیث تھے جو بعد میں ریاض العلوم گورینی آ گئے تھے اور کئی سال ریاض العلوم میں رہے، یہ سفر ٹرین سے ہوا اور ٹرین ہی سے واپسی ہوئی۔

مظفر نگر کے ایک جلسہ کا واقعہ

(۹) مظفر نگر کے تبلیغی احباب کے اصرار پر حضرت مفتی صاحب کا سفر ایک

مرتبہ مظفرنگر ہوا جس میں بحیثیت خادم راقم بھی ساتھ تھا، وہاں کی مرکز والی مسجد میں حضرت کا مغرب کے بعد بیان تھا، ظہر کے بعد امبیسڑ کار مظفرنگر سے حضرت مفتی صاحب کو لینے کے لئے دیوبند پہونچی، حضرت اور راقم دونوں روانہ ہوکر مظفرنگر پہونچے، مظفرنگر میں مستقبل قریب میں تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا، اسی کی مناسبت سے مظفرنگر والوں نے حضرت کو بلایا تھا اور جو مجمع بیان سننے کے لئے آیا تھا اس میں اکثر علماء تھے، مغرب کے بعد حضرت مفتی صاحب کرسی پر بیٹھے اور تھوڑی دیر بیان کرنے کے بعد اتر گئے اور راقم کو حکم دیا کہ اب تم بیان کرو۔ چنانچہ راقم نے تھوڑی دیر بیان کیا جو خروج فی سبیل اللہ کی اہمیت ضرورت پر مشتمل تھا، اس بیان میں البتہ راقم نے یہ کہہ دیا کہ جب یہ حضرات علماء جماعت میں نکلیں گے جو کہیں کے شیخ الحدیث ہیں، کوئی صدرالمدرسین ہیں کوئی ناظم تعلیمات ہیں، کوئی کہیں کے مہتمم ہیں، کوئی کہیں علیاء کے مدرس ہیں جن کی خدمت میں درجنوں طلباء ہر وقت کھڑے رہتے ہیں اور اپنی سعادت سمجھ کر ہر خدمت انجام دیتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلّی اور بڑکپن کا پیدا ہونا لازمی چیز ہے اور علو اور غلو کے شکار ہوجاتے ہیں، یہ حضرات جب جماعتوں میں نکلیں گے ان کا بستر ان کے کندھے پر ہوگا اپنا ہر کام خود کرنا ہوگا بلکہ دوسروں کے لئے خادم بننا پڑے گا تو اس سے ان کے علو اور غلو کا ازالہ ہوگا، علمی کبر ٹوٹے گا تواضع پیدا ہوگی جو باطنی رفعت کا ذریعہ بنے گی۔

بیان ختم ہونے کے بعد جب مسجد کے بالائی منزل والے کمرے میں جانا ہوا جہاں حضرت مفتی صاحب تشریف فرماں تھے تو میرے پیچھے کئی علماء اس کمرے میں

آئے اور بہت غصہ میں حضرت مفتی صاحب سے سوال کیا کہ حضرت آپ کے بعد مولانا نے جو بیان کیا ہے کیا ان کو یہ بیان کرنا چاہئے تھا؟ حضرت مفتی صاحب ان کے چہروں کواور سوال کے انداز کوسن کر بھانپ گئے اور فرمایا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لايقص إلا أمير أو مأمور أو مختال"

کہ وعظ کہنے کا حق امیر کو ہے یا مامور کواور تیسرا نمبر متکبر کا ہے، یہ مامور تھے،اس لئے ان کو وعظ کہنے کا حق تھا،اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اگر وہ باتیں آپ لوگوں میں نہیں ہیں تو برا ماننے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ باتیں آپ لوگوں میں موجود ہیں تو کہنے والا چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اپنی اصلاح کی فکر ہونی چاہئے، یہ کہہ کر حضرت مفتی صاحب اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور وہاں سے چل پڑے اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے اور گاڑی دیوبند کے لئے وہاں سے روانہ ہوگئی۔

راستہ میں حضرت مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ حبیب اللہ جاؤ جان بچ گئی،اگر میں نہ ہوتا تو یہ مولوی لوگ تم کو نوچ ڈالتے۔

تذکرہ سفر جلال آباد

(۱۰)ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کی رفاقت میں جلال آباد بھی جانا ہوا، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے دیر تک ملاقات رہی اور مختلف موضوع پر کافی

دیر تک دونوں اکابر تبادلہ خیال کرتے رہے اور بہت بشاشت کے ساتھ دونوں حضرات کی ملاقات رہی۔اس ملاقات میں حضرت مفتی صاحب نے راقم کے سلسلہ میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے کچھ کہنا چاہا،ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ درمیان میں کوئی دوسری بات نکل آئی اور اس میں دونوں حضرات مصروف ہوگئے۔ راقم سے متعلق بات رہ گئی،اس کے بعد راقم کی ہمت نہیں ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب سے پوچھ سکے کہ وہ کونسی بات تھی جو حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب سے کہنا چاہ رہے تھے۔

تذکرہ سفر گنگوہ

(۱۱)اسی طرح ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کی رفاقت میں بحیثیت خادم گنگوہ بھی جانا ہوا جہاں اعزا اور اقارب سے حضرت مفتی صاحب نے ملاقات کی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے پوتے حکیم عبدالرشید عرف نھو میاں اور حاجی کامل صاحب سے بھی ملاقات کی۔ حاجی کامل صاحب نے تصوف کے کچھ مسائل پر حضرت سے بات کی اس کے بعد حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مزارات پر حاضری دی، اس کے بعد مدرسہ اشرف العلوم میں تشریف لائے، کچھ دیر وہاں قیام فرمایا۔

دیوبند کے ایک صاحب کا واقعہ

(۱۲) ایک مرتبہ دیوبند میں ایک صاحب نے حضرت مفتی صاحب کی دعوت کی۔ راقم بھی بحیثیت خادم ساتھ میں پہونچا، گھر کے دالان میں چار پائی پر حضرت مفتی صاحب بیٹھ گئے، ابھی کھانا لگ رہا تھا، حضرت نے ایک تولہ والی عطر کی شیشی جیب سے نکالی اور ڈھکن ہاتھ میں رکھ کر تھوڑا سا اپنے بدن پر لگایا اس کے بعد از راہ تواضع میزبان کی طرف شیشی بڑھا دی، میزبان نے پوری شیشی اپنی ہتھیلی میں انڈیل لی اور اپنے کپڑے اور بدن پر مل لیا اور خالی شیشی حضرت مفتی صاحب کو واپس کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب دیکھتے رہ گئے، جب میزبان دسترخوان کی نگرانی کے لئے گیا تو حضرت نے راقم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حبیب اللہ اس کا کیا علاج ہے، لوگ ڈھکن اس لئے ہاتھ میں رکھ لیتے ہیں کہ لوگ عطر لگا کر مجبوراً شیشی واپس کر دیں گے، لیکن انھوں نے تو پوری شیشی ہی خالی کر دی۔ اب خالی شیشی واپس لے کر کیا کریں گے۔

افتاء کے سال راقم کا قیام

(۱۳) افتاء کے سال میں دار الاقامہ کی طرف سے راقم کو دار العلوم کی مسجد کے تہہ خانہ والا کمرہ قیام کے لئے ملا، لیکن وہاں صرف سامان ہی تھا، باقی چوبیس گھنٹہ کا وقت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر فتوی نویسی

مہمانوں کے لئے کھانے وناشتے وبستر کے انتظام میں گزرتا تھا، کام کی اس قدر زیادتی تھی کہ صبح سے شام تک کام سے فرصت نہیں ملتی تھی، مہمانوں کو کھلاتے پلاتے اوران کے سونے کا انتظام کرتے اور برتن وغیرہ دھوتے دھوتے بارہ بج جایا کرتے تھے، اس کے ساتھ عشاء کے بعد حضرت کی مجلس بھی ہوتی تھی جس میں مہمانوں کے علاوہ طلباء بھی اکثر شریک ہوا کرتے تھے، وہ مجلس اکثر لمبی ہوجاتی تو راقم بلند آواز سے یہ کہہ دیتا کہ حضرات، اب آپ حضرات حضرت سے سلام ومصافحہ کرلیں، حضرت کو آرام کرنا ہے، اس پر بلاتکلف حضرت مفتی صاحب اپنی بات وہیں پر روک کر ختم کردیتے اور یہ کہتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیتے کہ ہاں بھائی آؤ اب مصافحہ کرلو، اس لئے کہ حضرت کو آرام کرنا ہے اور یہ جملہ کہتے ہوئے راقم کی طرف اشارہ کرتے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ صبح سے شام تک کام کرتے کرتے راقم اس قدر تھک جایا کرتا تھا کہ بہت دیر تک مجلس کو جاری رکھنے کا بدن متحمل نہیں رہتا تھا، چونکہ اس کے بعد آئے ہوئے مہمانوں کا بستر لگانا، ان کو لٹانا اس کے بعد برتن دھونا اور دوسرے بہت سے ضروری کام کو انجام دینا، یہ سب راقم ہی کے ذمہ تھا، جن کاموں میں راقم کا کوئی دوسرا معاون نہیں تھا، اس کے بعد صبح سویرے اٹھنا بھی ہوتا تھا، مہمانوں کا بستر اکٹھا کرنا اور رکھنا ہوتا تھا، فجر سے پہلے اور دوسرے مشاغل بھی تھے، اور فجر کی نماز کے بعد ذکر کی مجلس اور ناشتہ کا انتظام یہ سارے کام بھی راقم ہی کے سپرد تھے۔ حضرت مولانا ابراہیم صاحب افریقی وہ صرف اپنے اہم اور ضروری کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے، بحیثیت خادم خاص ان کے اپنے اہم مشاغل تھے، البتہ کھانے اور ناشتے میں اور

مہمانوں کے اکرام میں ضرور شریک رہا کرتے تھے، جب راقم دسترخوان لگا دیتا اور حضرت کا ہاتھ دھلا دیتا اور سارے مہمان دسترخوان پر بیٹھ جاتے، مولانا ابراہیم صاحب افریقی کے انتظار میں پانچ سے دس منٹ کھانا موقوف رہتا تھا۔ حضرت دوتین مرتبہ آواز دیتے، مولوی ابراہیم! کہاں ہو جلدی آؤ، کھانا لگ چکا ہے، تب وہ جلوہ افروز ہوتے، اس کے بعد حضرت کھانا شروع فرماتے، پھر مہمانوں کا بھی ہاتھ چلنا شروع ہوتا اور یہ معمول بلا ناغہ ان کا روزانہ کا تھا، وہ کبھی دسترخوان پر مُنْتَظِرْ نہیں بنے بلکہ ہمیشہ مُنْتَظَرْ بنتے رہے جس پر حضرت مفتی صاحب نے تنہائی میں راقم کے سامنے ناراضگی کا بھی اظہار فرمایا، پتہ نہیں مولوی ابراہیم کی یہ کونسی عادت ہے کہ جب کھانا لگ جاتا ہے تو غائب ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت میں جو تحمل مزاجی تھی وہ کسی چیز کو برداشت کرنے کی بے مثال قوت تھی اس کی وجہ سے آپ نے ہمیشہ اس چیز کو برداشت کیا۔

پاندان کا واقعہ

(۱۴) راقم چونکہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے پان کا عادی تھا اس لئے دوکان سے پان کی پڑیا بنوا کر جیب میں رکھتا تھا اور دیر تک جب فتوی لکھنا ہوتا تو جیب سے نکال کر منہ میں ڈال لیا کرتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے محسوس کرلیا تھا کہ یہ پان کھانے کا عادی ہے، اس

لئے کئی مرتبہ راقم سے فرمایا کہ حبیب اللہ یہاں آنے والے مہمان ہر طرح کے ہوتے ہیں، کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو صرف کھانا کھاتے ہیں اور کھانا ہم سب لوگ بھی کھاتے ہیں، اس لئے کھانے کی ان کی ضیافت ہو جاتی ہے، کچھ وہ ہوتے ہیں جو کھانے کے ساتھ چائے کے بھی عادی ہوتے ہیں اور چائے چونکہ میں بھی پیتا ہوں، مولوی ابراہیم بھی پیتے ہیں اس لئے ان کی چائے کی بھی ضیافت ہو جاتی ہے اور کچھ مہمان وہ ہوتے ہیں جو پان بھی کھاتے ہیں لیکن پان نہ میں کھاتا ہوں اور نہ مولوی ابراہیم کھاتے ہیں، اس لئے پان سے ان کی ضیافت نہیں ہو پاتی، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ تم پان دان کا انتظام کرلو، اس کے پیسے میں دیتا ہوں تاکہ آنے والے مہمانوں کی ضیافت بھی پان سے ہو جایا کرے گی اور اسی پان دان سے پان لگا کر تم بھی کھاتے رہنا، حضرت نے یہ بات کئی مرتبہ کہی لیکن راقم پان دان رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوا بلکہ دکان ہی سے پان لگوا کر ہمیشہ استعمال کرتا رہا۔

تذکرہ معراج دیوبندی

(۱۵) معراج نام کے ایک صاحب دیوبند کے رہنے والے تھے اور وہ روزانہ عشاء کے بعد حضرت کی مجلس میں آیا کرتے تھے اور دیوبند و گرد و پیش کی خبریں لاکر حضرت مفتی صاحب کو سنایا کرتے تھے اور حضرت کے کچن میں رکھی ہوئی چیزوں سے بلا اجازت خوب استفادہ کرتے تھے، چونکہ کچن کی ذمہ داری راقم کی تھی، کچھ

چیزیں مہمان کے لئے راقم سنبھال کر رکھتا اور وہ صاحب عشاء کے بعد آ کر صاف کر دیتے، صبح راقم کو دقت ہوتی اور غصہ آتا۔ مولانا ابراہیم صاحب افریقی کی نظر میں بھی ان کی یہ حرکت تھی لیکن وہ تسامح سے کام لیتے رہے، ایک دن اسی طرح کسی چیز کے غائب ہونے پر راقم کو غصہ آیا اور ان کی اچھی طرح خبر لی۔ اس کی اطلاع کسی کے ذریعہ حضرت مفتی صاحب تک پہونچ گئی، حضرت نے بہت شفقت کے ساتھ بلا کر راقم کو سمجھایا اس کے بعد راقم نے بھی تسامح سے کام لینا شروع کر دیا۔

تذکرہ قاری اسماعیل صاحب دیوبندی

(۱۶) جناب قاری اسماعیل صاحب دیوبند کے رہنے والے تھے، مدرسہ اصغریہ کے پاس ان کا مکان تھا، وہ بھی بہت صالح مزاج تھے، حضرت مفتی صاحب کے یہاں تقریباً روزانہ ملاقات کے لئے آتے تھے، حضرت سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور خدمت کا جذبہ بھی بہت اچھا تھا، چنانچہ جشن صد سالہ کے موقعہ پر حضرت مفتی صاحب نے اپنے مہمانوں کے کھانے کا انتظام قاری صاحب کے مکان پر رکھا، دوپہر اور شام کو حضرت مہمانوں کے ساتھ خود بھی تشریف لے جاتے تھے اور قاری صاحب کے مکان پر کھانا تناول فرماتے تھے، قاری صاحب کے گھر والوں نے بہت اہتمام اور شوق کے ساتھ مہمانوں کی خدمت کی۔

حضرت قاری طیب صاحب کی طرف منسوب ایک نعت کی حقیقت

نبی اکرم شفیع اعظم دکھے دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو

افتاء ہی کے سال میں حضرت مفتی صاحب کا دو ہفتے کے لئے سفر کلکتہ کا ہوا، حضرت کی عدم موجودگی میں حضرت کے قیام گاہ کا مسئول و ذمہ دار و کلید بردار راقم ہی تھا، واپسی سے قبل قیام گاہ کی صفائی کر رہا تھا، اور غیر ضروری سامان نکال کر پھینک رہا تھا، اسی غیر ضروری سامان میں کچھ کاغذ کے اوراق بھی تھے، ان اوراق میں ایک ایسا ورق بھی تھا جس پر ایک نعت لکھی ہوئی تھی، وہ نعت راقم کو بہت اچھی لگی، اس کاغذ کو پھینکنے کے بجائے راقم نے صاف کر کے جیب میں رکھ لیا، اس نعت کے اخیر میں طیب نام تھا، اس طیب سے مراد کون سے طیب تھے یہ معلوم نہیں، حضرت مفتی صاحب سے بھی پوچھنا بھول گیا، وہ کاغذ راقم کی جیب میں محفوظ رہا اور وہاں سے پھر محفظہ میں پہونچ گیا۔

راقم جب ریاض العلوم گورینی پہونچا تو ایک دن جمعرات کو بعد نماز مغرب مولانا سعادت علی صاحب الہ آبادی کے کمرے میں اتفاقیہ جا کر بیٹھ گیا، انہوں نے عبد الستار نامی ایک طالب علم کو بلایا جو بارہ بنکی کا رہنے والا تھا، اور اس سے نعت سنانے کو کہا، اس نے ایک نعت سنائی، اس کے بعد راقم کو وہ نعت یاد آئی جو راقم کو حضرت مفتی صاحب کے کمرے سے ملی تھی۔ چنانچہ اپنے کمرے گیا اور وہ کاغذ لا کر

اس طالب علم کو دیا اور اس کی تصحیح کر کے اس سے پڑھوایا، یہاں تک کہ ریاض العلوم میں اسی طالب علم کی زبانی بار بار وہ نعت پڑھی گئی اور سنی گئی، اس کے بعد شدہ شدہ وہ نعت دیوبند تک پھونچ گئی اور وہاں بہت دھوم سے حضرت قاری طیب صاحب کی طرف منسوب کر کے یہ نعت پڑھی اور سنی جانے لگی۔

جس وقت دار العلوم دیوبند پر ناروا قبضہ کی پلاننگ بن چکی تھی اور طلباء طبیہ کالج میں مقیم تھے اور حضرت قاری طیب صاحب کے خلاف پوری محاذ آرائی ہو رہی تھی، راقم دیوبند پہونچ گیا، حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کے ایک خادم اور داماد جو بہار کے رہنے والے تھے جن سے راقم کی پرانی آشنائی تھی، ان سے ملاقات ہوگئی، وہ راقم کو اپنے ہمراہ لے کر حضرت شاہ صاحب کے کاشانہ کے بالائی منزل پر لے گئے، جہاں راقم کی حاضری دورۂ حدیث کے سال میں کئی بار ہو چکی تھی، خیر خیریت اور چائے نوشی کے بعد انہوں نے ایک کیسیٹ نکالی اور ٹیپ میں لگایا اور یہ کہتے ہوئے ٹیپ چالو کیا کہ حضرت قاری طیب صاحب کا تازہ کلام سنئے جو حالات کے تناظر میں حضرت نے کہا ہے اور پورے درد کی عکاسی اس کلام سے ہوتی ہے، جب راقم نے وہ نعت سنی تو اس انتساب پر استعجاب کے ساتھ حیرانی ہوئی اور صحیح صورت حال سے میں نے ان کو واقف کرایا اور پورا واقعہ میں نے ان کو سنایا، لیکن کسی قیمت پر وہ ماننے کو تیار نہیں ہوئے، چونکہ اسی عنوان سے پورے ہندوستان میں یہ نعت مشہور ہو چکی تھی، اس کے بعد راقم زبردستی خاموش ہو گیا اور خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔

دار العلوم دیوبند کا جشن صد سالہ

جس سال راقم دار العلوم دیوبند میں دار الافتاء میں تھا اسی سال دار العلوم دیوبند کا جشن صد سالہ بھی ہوا جس کی تیاری کئی مہینے پہلے سے شروع ہوگئی، تیاری کے زمانہ میں قاسم پورہ جہاں جلسہ ہونا طے پایا تھا راقم کی چند بار حاضری ہوئی اور وہاں جلسہ کی تیاری کے منظر کو دیکھنے کا موقع ملا، لیکن جن ایام میں جلسہ ہو رہا تھا راقم کو ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ملی کہ وہ جلسہ گاہ میں جا سکے اور وہاں کی کسی نشست میں شرکت کر سکے، چونکہ حضرت مفتی صاحب کے پاس جن مہمانوں کی آمد ہونے والی تھی یا جو مہمان آئے اور مقیم ہوئے ان سب کے کھانے پینے اور دیکھ ریکھ اور نظم وانتظام کی پوری ذمہ داری تنہا راقم ہی کے سر تھی۔ مولانا ابراہیم افریقی افریقہ سے آئے ہوئے اپنے خواص میں غیر معمولی انداز سے مصروف تھے، ہندوستان کے اکابرین اور اہم شخصیات نے حضرت مفتی صاحب کے یہاں اپنا قیام تجویز کیا جس کا پورا نظم ونسق حضرت کے حکم کے مطابق راقم کے سر رہا، حالانکہ جشن صد سالہ کے کسی پروگرام میں بھی عدم شرکت پر افسوس بہت رہا، لیکن حضرت مفتی صاحب کے مہمانوں کی خدمت ایسی مجبوری تھی کہ حضرت مفتی صاحب کو اور مہمانوں کو چھوڑ کر ہٹنا تھوڑی دیر کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔

مفتی منظور صاحب کانپوری کا واقعہ

مجمع کی آمد ورفت مسجد چھتہ میں اس قدر کثرت سے تھی کہ ان کو کنٹرول کرنا

مشکل تھا، بالخصوص اس انار کے درخت کی زیارت کے لئے لوگ کثرت سے آ رہے تھے جو مسجد چھتہ کے شرقی جانب کے دکھن کونے میں اس وقت بھی موجود تھا، جس کی عمر بھی سوسال کی تھی، اس کی زیارت کے شوق میں بھی لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔

وہ انار کا درخت جو خشک ہو چکا تھا، راقم نے جشن صد سالہ کی مناسبت سے کئی مہینہ پہلے سے صبح وشام اس میں پانی دینا شروع کیا جس کی وجہ سے وہ ہرا بھرا تر وتازہ پتیوں سے لبریز ہو چکا تھا، جن پتیوں کو عقیدت مند حضرات توڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

حضرت مفتی صاحب کا قیام جس کمرہ میں تھا اس کے دروازہ پر پتھر لگا ہوا تھا، ''خلوت گاہ قاسمی'' یعنی حضرت مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کا حجرۂ مبارکہ جس کی وجہ سے عقیدت مندوں کی چند منٹوں میں بھیڑ جمع ہو جاتی تھی اور لوگ دروازہ پیٹنا شروع کر دیتے تھے تا کہ دروازہ کھلے تو لوگ زیارت کر سکیں، مجبور ہو کر بار بار کھولنا اور بند کرنا آنے والے لوگوں کو سمجھانا اور دروازہ کے باہر کرنا، یہ مشکل کام بھی کئی روز تک راقم ہی کو کرنا پڑا۔

اسی دوران اسی بھیڑ بھاڑ میں مفتی منظور صاحب کانپوری تشریف لے آئے جن سے راقم واقف نہیں تھا، ایک عام آدمی سمجھ کر راقم نے ان کو بھی یہ کہتے ہوئے دھکا دے کر باہر کر دیا کہ اللہ والوں کو ستایا نہیں کرتے، تھوڑی دیر میں کسی طرح وہ اندر آنے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت مفتی صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گئے، اس کے بعد حضرت نے راقم کو بلایا اور فرمایا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ راقم نے عرض کیا کہ نہیں، حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ مفتی منظور صاحب ہیں، یہ کانپور کے قاضی شہر

ہیں، ان کی اجازت کے بغیر کانپور گھس نہیں پاؤ گے، تب جا کر ان کا تعارف ہوا۔ لیکن راقم کا وہ جملہ انھوں نے زندگی بھر یاد رکھا اور وہ انداز بھی ان کو یاد رہا جب کبھی ملاقات ہوئی تو اس جملہ کو بلا تکلف وہ دہراتے اور حاضرین کو پورا واقعہ بتاتے۔

دستار فضیلت کی حصول یابی

جشن صد سالہ کے دوران یہ معلوم ہوا کہ جلسہ گاہ میں چند ہی اکابر حضرات کو دستار ملی ہے، باقی حضرات کے لئے اعلان ہوا ہے کہ وہ اپنی دستار فضیلت دار الحدیث تحتانی میں پہونچ کر حاصل کرلیں۔

چنانچہ اس اعلان کے بعد راقم بمشکل تمام تھوڑی دیر کے لئے مسجد چھتہ سے غیر حاضر ہوکر دار الحدیث تحتانی پہونچا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کر کے مسجد چھتہ واپس آگیا۔ اس طرح پوری زندگی کی ایک یادگار حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی، باقی پوری دنیا سے آئے ہوئے مشائخ اکابر علماء اور مہمانوں کی ملاقات کے لئے دل ترستا اور تڑپتا ہی رہ گیا، حضرت مفتی صاحب کے یہاں کی مستقل اور مسلسل ڈیوٹی کی وجہ سے کہیں نکلنا ممکن نہیں ہوا۔

تذکرہ مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کی ملاقات کے لئے مفتی ابوالقاسم صاحب

نعمانی اور حاجی عبدالقیوم صاحب بنارس سے تشریف لائے، دونوں حضرات کا کئی روز قیام رہا، اسی دوران ایک دن عشاء کی نماز کے بعد کی مجلس میں جس میں صرف چند مہمان ہی تھے مفتی ابوالقاسم صاحب نے کسی بات پر راقم کو نشانہ پر لیا اور قاعدہ سے بور کرنا شروع کیا۔ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں مفتی ابوالقاسم کا ساتھ دیتے رہے اور سب لوگ مزہ لیتے رہے، جب حضرت مفتی صاحب نے محسوس کرلیا کہ راقم بہت زیادہ بور ہوگیا ہے تو مجلس برخاست کر کے کھڑے ہوگئے اور مفتی ابوالقاسم صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے وہ قصہ سنا ہے؟ مفتی ابوالقاسم نے سوالیہ انداز میں پوچھا حضرت کونسا؟ اس پر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہردوئی کے ایک حنیف بھائی ہمارے دوستوں میں تھے، وہ بتانے لگے کہ میاں بیوی قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے اور ہینڈلوم پر کپڑا بن رہے تھے، اتنے میں بیوی کا دھاگہ ٹوٹ گیا تو وہ اس کو درست کرنے لگی، اس کے بعد اتفاق سے اسی درمیان شوہر کا بھی دھاگہ ٹوٹ گیا، وہ اس کو ٹھیک کرنے لگا، اتنے میں بیوی کو زور سے ریاح خارج ہوئی، بیوی اس وقت حمل سے تھی، شوہر نے دھاگہ ٹھیک کرتے ہوئے بیوی سے پوچھا کہ اری! یہ آواز کہاں سے آئی، بیوی نے کہا ارے سنا نہیں بوا نے سلام کیا، اتنے میں شوہر کا دھاگہ ٹھیک ہو چکا تھا، شوہر نے پورے وجد میں آکر کرگھے کی ریل کو دائیں بائیں گھمانا شروع کیا اور وجد اور مستی میں دیر تک وعلیکم السلام، وعلیکم السلام، وعلیکم السلام، وعلیکم السلام کہتا رہا۔ اس واقعہ کو سن کر جتنے لوگ وہاں موجود تھے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور مفتی ابوالقاسم صاحب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اس کے بعد راقم کو مخاطب کر کے حضرت

مفتی صاحب نے فرمایا کہ حبیب اللہ مزہ آیا؟ مفتی ابوالقاسم نے تم کو بہت دیر تک بور کیا، میں نے دومنٹ میں سب دھو دیا۔ اس انداز سے ظرافت پر مبنی واقعات حضرت مفتی صاحب مجلس میں گاہ بگاہ سناتے رہتے تھے۔

تذکرہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری سے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خانقاہ میں رمضان المبارک میں ملاقات ہوچکی تھی، حضرت مولانا چونکہ دار العلوم دیوبند کے شوریٰ کے ممبر بھی تھے، اس لئے شوری کے موقع پر پابندی سے تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ جس سال یہ راقم دار الافتاء میں تھا، محرم کے مہینہ میں ہونے والی شوریٰ میں تشریف لائے، راقم نے مہمان خانہ میں جا کر ملاقات کی، پہچان گئے اور بہت محبت سے پیش آئے، آپ کے رفیق سفر آپ کے برخوردار مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی تھے جن کے ساتھ کئی روز رہنا ہوا اور کچھ زیادہ بے تکلفی ہوگئی۔ حضرت مولانا دوبارہ رجب کے مہینہ میں شوریٰ کے موقع پر تشریف لائے، اس وقت بھی راقم نے ملاقات کی اور دیر تک حضرت مولانا کی خدمت میں رہنا ہوا، راقم نے صبح کے ناشتے کی بھی دعوت دی۔ حضرت مولانا نے بہت بشاشت کے ساتھ قبول فرمایا اور ناشتہ میں استعمال ہونے والی چیزوں کی نشاندہی کے ساتھ اس کا وقت بھی بتلایا۔

چنانچہ راقم نے عشاء کے بعد ہی ناشتہ کے جزئیات کی فراہمی کر لی اور چائے

تھرمس میں بنا کر رکھ دیا، اور ساری چیزیں مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ حضرت مولانا نے تہجد کے وقت راقم کا ناشتہ نوش فرمایا اور کل ہو کر ملاقات پر حوصلہ افزائی کے لئے تشکر کے کلمات بھی فرمائے۔

اسی ملاقات کے دوران حضرت نے دارالافتاء میں سال بھر ہونے والی تمرین کی کاپی بھی منگوائی اور بہت غور سے جا بجا دیکھا، وطن واپسی کے وقت حضرت مفتی صاحب سے مسجد چھتہ کی قیام گاہ میں دونوں حضرات کی الوداعی ملاقات بھی ہوئی اور تخلیہ میں کچھ بات بھی لیکن راقم کو نہیں معلوم کہ ان دونوں اکابر کی کیا بات ہوئی۔

راقم کے لئے حضرت مفتی صاحب کا رمضان کے لئے فیصلہ

ادھر جب سالانہ امتحان مکمل ہو گیا تو چونکہ حضرت مفتی صاحب کو رمضان میں اعتکاف کے لئے حضرت شیخؒ کی رفاقت میں فیصل آباد پاکستان جانا تھا، حضرت نے ایک دن عشاء کے بعد راقم کو بلایا اور فرمایا کہ میں تو فیصل آباد میں رمضان گزارنے جا رہا ہوں، تمہارا ارادہ کیا ہے؟

راقم نے عرض کیا کہ حضرت میری خواہش یہ ہے کہ کچھ دنوں اور آپ کی خدمت میں رہوں اور آپ کے لکھے ہوئے فتاوی کی ترتیب وتبویب کا کام کروں تا کہ اس کی اشاعت ہو سکے، اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میرے فتاوی اس لائق کہاں ہیں کہ انہیں شائع کیا جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ آئندہ سال تم

کہیں درس وتدریس میں لگ جاؤ، میں نے کہا آپ کی جیسی رائے ہو،اس لئے کہ راقم ہمیشہ جن کی سرپرستی میں بھی رہااور جہاں بھی رہااور جب بھی رہااور جس کے پاس بھی رہااور جتنی مدت کے لئے رہا پوری تفویض کے ساتھ رہااور اپنی تجویز کو کبھی بھی اپنے بڑوں پر مسلط نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمیشہ عافیت رہی اور جہاں رہا سکون کے ساتھ رہا۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میری عدم موجودگی میں اس سال کا رمضان قاری صدیق احمد صاحب باندوی کے یہاں گزار لو اور عید کے بعد کلکتہ چلے جاؤ، وہاں ایک مدرسہ ہے جہاں صدر مدرس کی ضرورت ہے اور وہاں کے لوگ مجھ سے بہت دنوں سے اس کا مطالبہ کررہے ہیں، تم وہاں کے لئے مناسب رہوگے، سات سو روپئے ماہانہ تنخواہ ہے اور وہ مدرسہ حاجی جمیل صاحب کی آفس کے بغل میں ہے، ان سے بھی تم کو مدد ملتی رہے گی اور میں بھی کلکتہ آتا جاتا رہتا ہوں، مجھ سے بھی ملاقات ہوتی رہے گی، وہاں سب اپنے ہی لوگ ہیں میں انشاء اللہ کوئی دقت نہیں ہوگی۔

لیکن کل ہوکر تہجد کے وقت راقم کو بلایا اور فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ میں تشریف لائے تھے، انہوں نے حکماً مجھ کو فرمایا تھا کہ آپ کا شاگرد جب فارغ ہوجائے تو مجھ کو دے دیں، اس لئے کہ ان کی مجھ کو ضرورت ہے، میرے مدرسے میں دارالافتاء نہیں ہے، ان کے ذریعہ دار الافتاء قائم کرنا ہے، یہ کہہ کر حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ رات مجھے یہ بات یاد نہیں تھی، اس لئے اب میری رائے یہ ہے کہ عید کے بعد تدریس وافتاء کے کام کے لئے ریاض العلوم گورینی چلے جاؤ، میں نے اس کے جواب میں بلا تأمل عرض کیا کہ

حضرت آپ کی جیسی رائے ہو۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب اسی دن فیصل آباد کے لئے روانہ ہو گئے اور حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی کے نام مجھ کو ایک خط لکھ کر دیا اور یہ فرمایا کہ وہاں پہونچ کر میرا یہ خط قاری صاحب کو دے دینا۔

راقم کی ہتھورا باندہ کے لئے روانگی

چنانچہ راقم وہ خط لے کر ہتھورا باندہ کے لئے روانہ ہوا، چونکہ راقم کا یہ پہلا سفر تھا، طریق کے نشیب وفراز سے نا آشنا تھا، اس لئے قدرے دشواریوں سے گزرتا ہوا بہر حال بعافیت جامعہ عربیہ ہتھورا پہونچ گیا، اور حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی سے ملاقات بھی ہوگئی۔ ملاقات کے بعد راقم نے حضرت مفتی صاحب کا مکتوب گرامی حضرت قاری صاحب کو پیش کیا، حضرت قاری صاحب دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور بہت ہی اہتمام کے ساتھ مکتوب گرامی کو بار بار پڑھا، چونکہ حضرت مفتی صاحب نے حضرت قاری صاحب کو پہلی مرتبہ خط لکھ کر کسی کو بھیجا جس کا معمول نہیں تھا، اس لئے حضرت قاری صاحب نے بہت عزت دی اور احترام کے ساتھ جامعہ عربیہ ہتھورا کے مہمان خانہ میں میرا قیام تجویز فرمایا اور جب تک راقم کا وہاں قیام رہا حضرت مفتی صاحب کی مکتوب گرامی کی برکت سے راقم سے بہت زیادہ محبت کا برتاؤ کرتے رہے تقریباً چار مہینہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی کی

خدمت اور صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔

رمضان المبارک کی ترتیب

جب رمضان قریب آیا تو پہلے عشرے کا اعتکاف حضرت قاری صاحب نے جامع مسجد باندہ میں چند رفقاء کے ساتھ کیا جس میں معتکفین کی تعداد بھی کم تھی اور معمولات بھی مختصر تھے، اس اعتکاف میں راقم بھی مکمل شریک رہا، البتہ وہاں کے معمولات سے ہٹ کر راقم کا معمول ظہر کے بعد ذکر جہری کا تھا، اس خانقاہ کے لئے یہ پہلی چیز تھی اس لئے ذکر سننے کے لئے ذکر کے وقت سارے حاضرین میرے گرد و پیش جمع ہو جاتے تھے۔

البتہ حضرت قاری صاحب نے تراویح میں میرا قرآن سنانا ایک مسجد میں طے کر دیا تھا، جس کی وجہ سے صرف تراویح پڑھانے کے لئے راقم اس مسجد جایا کرتا تھا اور باقی اوقات میں قیام جامع مسجد ہی میں حضرت کی رفاقت میں رہتا تھا۔

دوسرے عشرے میں حضرت قاری صاحب کا معمول مختلف مقامات کے دورے اور سفر کا تھا، لہٰذا حسب معمول حضرت قاری صاحب اپنے مجوزہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سفر پر نکل پڑے اور راقم کا قیام اس مسجد میں طے فرما دیا جس میں قرآن پاک سنا رہا تھا۔

جس دن راقم کا قرآن ختم تھا حضرت قاری صاحب بہت اہتمام کے ساتھ

بہت سارے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے اور تراویح میں شرکت فرمائی اور ختم قرآن کے بعد وعظ فرمایا اور پُر اثر دعاء فرمائی اور مجلس کے ختم کے بعد اپنے ہمراہ لے کر ہتھورا باندہ چلے گئے۔ اس طرح رمضان کا دوسرا عشرہ مکمل ہوگیا اور راقم کی تراویح اور تراویح میں قرآن سنانے کا عمل بھی اختتام کو پہونچا۔

رمضان کا آخری عشرہ

چونکہ حضرت قاری صاحب کا معمول رمضان کے آخری عشرے میں جامعہ عربیہ ہتھورا کی مسجد میں اعتکاف کا تھا جس میں قرب و جوار کے علاوہ لکھنو و کانپور کے بھی بعض احباب شرکت کرتے تھے، راقم نے بھی حضرت کی معیت میں آخری عشرے کا اعتکاف جامعہ عربیہ ہتھورا کی مسجد میں کیا۔

پہلے ہی دن حضرت قاری صاحب نے اعلان فرمایا جس میں چند ہدایات کے ساتھ یہ بات بھی کہی کہ ہمارے یہاں ذکر جہری کی مجلس نہیں ہوتی تھی، لیکن اس سال کل سے ظہر کی نماز کے بعد اجتماعی ذکر کی مجلس ہوا کرے گی، لہٰذا سبھی حضرات ذکر کی مجلس میں شرکت کریں اور جن حضرات کو ذکر کا طریقہ معلوم کرنا ہو وہ ہمارے مفتی حبیب اللہ صاحب سے معلوم کرلیں۔

دوسرا اعلان یہ بھی فرمایا کہ ہمارے مفتی صاحب کے پاس پان دان بھی رہتا ہے، مہمانوں میں جو حضرات پان کے شوقین ہوں وہ ہمارے مفتی صاحب کے

پان دان سے استفادہ کر سکتے ہیں اسطرح دیگر معمولات کے ساتھ حضرت قاری صاحب کی خانقاہ میں الحمدللہ ذکر کی مجلس کا بھی آغاز ہوگیا اور تمام معتکفین بہت شوق کے ساتھ ذکر میں شریک ہوتے رہے۔

آخری عشرے میں تراویح میں قرآن خود حضرت قاری صاحب نے سنایا اور بہت خوش اسلوبی کے ساتھ تراویح کی نماز اختتام پذیر ہوئی۔

آخری عشرے کے اعتکاف کے چند واقعات

یہ اعتکاف چونکہ ایسے وقت میں ہوا جو ایام بارش کے تھے اور اس وقت پورا رمضان بارش ہی کے موسم میں گزرا بارش کی وجہ سے کھانے پینے کے نظم میں بھی منتظمین کو کافی دقت اٹھانی پڑتی تھی اور مہمانوں کے لئے راشن وغیرہ کے انتظام میں بھی دقت ہوتی تھی، تاہم سارے کام بحسن وخوبی وقت پر انجام پذیر ہوتے رہے اور مہمانوں کو کسی قسم کی کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

ایک مرتبہ تراویح کی نماز ہورہی تھی حضرت قاری صاحب تراویح پڑھا رہے تھے، سارے نمازی محو سماع تھے کہ اتنے میں اچانک نومیل سے تراٹر بندوق چلنے کی آواز آئی، یہ آواز سن کر راقم نے بلا تکلف اللہ اکبر کہہ دیا۔ حضرت قاری صاحب نے بھی میری تکبیر سنتے ہی بلا توقف و بلا تأمل رکوع کی تکبیر کہہ کر رکوع میں چلے گئے، اور مختصر رکوع سجدہ سے فارغ ہوکر دوسری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھ کر دو رکعت نماز

مکمل کرلی، راقم صف اول میں حضرت قاری صاحب کے داہنی طرف تھا، سلام پھیرتے ہی حضرت قاری صاحب نے راقم سے فرمایا کہ مفتی صاحب کیا ہوا؟ راقم نے عرض کیا کہ حضرت نومیل سے بندوق چلنے کی آواز آرہی ہے۔ حضرت نے فرمایا حبیب کو بلاؤ، حبیب کو بلاؤ، اس کو کہو دیکھے کیا ہورہا ہے۔ بھائی حبیب کے پاس بھی بندوق تھی، وہ اپنی بندوق لے کر آئے اور ندی کے کنارے گئے، چونکہ بارش کی وجہ سے ندی میں پانی بہت تھا اور کوئی پل بھی اس پر بنا ہوا نہیں تھا، لوگ کشتی سے پار ہوتے تھے، بھائی حبیب نے ندی پر پہونچ کر تین چار راؤنڈ گولی چلائی اور للکارنے کی آواز میں زور سے بولے تھوڑی دیر کے بعد ہتھورا کے چند لوگ ندی کے پاس پہونچے، معلوم ہوا کہ معتکفین کی ضرورت کا سامان لینے کے لئے باندہ گئے تھے، واپسی پر تاخیر ہوئی نومیل پر جب اترے تو ڈاکوؤں نے گھیر لیا، جب بھائی حبیب کی گولی کی آواز ان ڈاکوؤں نے سنی تو یہ سوچ کر مجھ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے کہ ہمارے تعاقب میں کچھ لوگ آئے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی جان اور ان کا سامان بچ گیا اور بعافیت مہمانوں کا سامان لے کر ہتھورا پہونچ آئے۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ رات میں تقریباً ایک ڈیڑھ بجے جبکہ سارے مہمان آرام کررہے تھے حضرت قاری صاحب بھی آرام فرمارہے تھے، پوری مسجد میں صرف راقم جگ رہا تھا اور اپنے معمولات میں مصروف تھا، اتنے میں ہتھورا گاؤں کے ایک کونے سے گولی چلنے کی آواز آئی، آواز سن کر فوراً راقم نے حضرت قاری صاحب کو بیدار کیا اور صورتحال سے باخبر کیا، حضرت قاری صاحب نے فرمایا، حبیب کو بلاؤ،

حبیب کو بلاؤ، اس کو کہو دیکھے کیا ہو رہا ہے اور خود وضوء کر کے نماز میں مصروف ہو گئے اور نماز سے فارغ ہو کر دعاء میں لگ گئے۔ راقم نے ایک بنگالی طالب علم کو جگایا جو وہاں کا مؤذن اور پرانا طالب علم تھا اور بھائی حبیب کے گھر اور قیام گاہ سے واقف تھا، اس نے جا کر بھائی حبیب کو جگایا، بھائی حبیب نے بھی بندوق نکالی اور کئی راؤنڈ گولی چلائی اور تھوڑی دیر کے بعد آ کر حضرت قاری صاحب کو بتلایا کہ ہتھورا گاؤں میں چند ڈاکو آ گئے تھے، فلاں کے گھر کا سارا سامان لوٹ لیا اور اس کے بعد گھر کے مالک کے بدن پر مٹی کا تیل چھڑ کر اس کو جلانے جا رہے تھے کہ اتنے میں میں نے کئی راؤنڈ گولی چلا دی اس کی آواز سن کر وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے اور گھر کے مالک کی جان بچ گئی۔

بہر حال آخری عشرے کا اعتکاف حضرت قاری صدیق صاحب باندوی کی معیت میں عافیت کے ساتھ پورا ہو گیا اور عید کی نماز کے لئے حضرت ہی کی معیت میں باندہ جانا ہوا۔ باندہ شہر کی ایک مسجد میں حضرت قاری صاحب اور تمام مہمانوں نے عید کی نماز ادا کی، حضرت قاری صاحب کے حکم پر راقم نے عید کی نماز پڑھائی، اس کے بعد چند جگہوں پر جانا ہوا جن میں حاجی شریف صاحب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، جو حضرت سے بہت خصوصی تعلق رکھتے تھے اس کے بعد ہتھورا واپسی ہو گئی۔

تقریباً چار مہینہ راقم کا قیام حضرت قاری صاحب کے مدرسہ کے مہمان خانہ میں رہا، قیام کے دوران حضرت قاری صاحب ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے، قیام وطعام کا بہت اہتمام فرماتے رہے، خود بھی کھانے پینے کے متعلق دریافت کرتے تھے، اور خرچ واخراجات کے لئے بھی کچھ پیسے دیتے رہتے تھے، چونکہ راقم

پان کا عادی تھا اور پان دان بھی ساتھ تھا اور راقم کو پان کھاتے ہوئے حضرت نے اکثر دیکھا تھا، اس لئے جب باندہ شہر کسی ضرورت سے تشریف لے جاتے تو مہوبہ کا پان جو اس علاقہ کا بہت مشہور تھا، سو پچاس لے کر آتے اور کسی سے بھجوانے کے بجائے مہمان خانہ میں خود تشریف لا کر اپنے دست مبارک سے راقم کو دیتے اور یہ فرماتے مفتی صاحب! میں باندہ گیا تھا وہاں سے آپ کے لئے یہ پان کا پتہ لایا ہوں، جو اس علاقہ کا بہت مشہور پتہ ہے۔

اسی طرح جب رمضان قریب آیا تو مہمان خانہ میں خود تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے کچھ نقد پیسے مرحمت فرمائے اور فرمایا مفتی صاحب! رمضان آرہا ہے اپنے لئے دودھ کا انتظام کر لیجئے گا، اس طرح اکثر و بیشتر نقد پیسے مرحمت فرماتے رہتے تھے۔ الغرض حضرت قاری صاحب کی طرف سے جب تک راقم وہاں مقیم رہا، ہر طرح کی راحت وآرام شفقت وعنایت حاصل ہوتی رہی۔

عید کے بعد حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی سے ایک درخواست اور اس کا جواب

ادھر کئی سال سے راقم کی خواہش مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی تھی، جس کا تذکرہ راقم نے اپنے بعض بڑوں سے بھی کیا، لیکن انہوں نے اتنی طویل وعریض راہ دکھائی کہ اس کو عبور کرنا راقم کے لئے مشکل تھا، یعنی وہاں کے داخلہ کے

لئے جن کاغذات وتوصیات کی ضرورت تھی، اس کی فراہمی کا مرحلہ مشکل تر تھا۔ لیکن عید کے چند روز کے بعد راقم ہمت کر کے حضرت قاری صاحب سے اپنی خواہش کے اظہار کے ساتھ اس کی درخواست پیش کر دی کہ راقم کا ارادہ مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا ہے اور اس کے لئے حضرت مولانا علی میاں صاحب کا توصیہ ضروری ہے، لہٰذا آپ اگر کوئی سفارشی خط لکھ دیں تو راقم حضرت مولانا علی میاں صاحب سے توصیہ حاصل کر لے اور اس طرح مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کی راہ ہموار ہو جائے، چونکہ راقم کو یہ معلوم تھا کہ حضرت قاری صاحب کا بہت گہرا تعلق حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ہے، اگر حضرت قاری صاحب نے سفارشی خط لکھ دیا تو حضرت مولانا علی میاں صاحب انکار نہیں کر پائیں گے، لہٰذا راقم کی درخواست پر حضرت قاری صاحب تیار ہو گئے اور حضرت مولانا علی میاں صاحب کے نام خط لکھ کر راقم کے حوالے فرمایا اور اسی کے ساتھ رائے بریلی تکیہ تک پہونچنے کی پوری رہبری فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ رائے بریلی میں میرا داماد رہتا ہے اس سے ملاقات کر لیں وہ اپنے ساتھ تکیہ لے جا کر حضرت مولانا علی میاں صاحب سے آپ کی ملاقات کرا دے گا اور حضرت مولانا کو میرا یہ خط دے کر آپ ملاقات کر لیں۔

راقم جب ہتھورا باندہ سے حضرت کا خط لے کر نکلا تو دوران سفر ویسے ہی خیال پیدا ہو گیا کہ دیکھوں تو حضرت نے کیا لکھا ہے تو حضرت قاری صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں جو کچھ تحریر فرمایا تھا، اس میں اہم چیز یہ تھی کہ حضرت میرا اور آپ کا تعلق اللہ جانتا ہے، صرف اللہ اور آخرت کے لئے ہے اور اللہ جانتا ہے کہ دنیا

کی کوئی بھی غرض اس میں شامل نہیں ہوئی، لیکن حامل عریضہ عزیزم مفتی حبیب اللہ صاحب سے اور ان کے گھر والوں سے میرا اتنا گہرا تعلق ہے کہ مجبور ہو کر آپ کی خدمت میں یہ عریضہ لکھنا پڑا، اس کے بعد حضرت قاری صاحب نے توصیہ سے متعلق جو بات لکھنی تھی وہ لکھی۔

رائے بریلی سے پھول پور الہ آباد کا سفر

حضرت قاری صاحب کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد راقم کے دل پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ راقم نے دوران سفر ہی اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور رائے بریلی حضرت قاری صاحب کے داماد کے گھر پھونچا اور وہاں سے تکیہ جانے کے بجائے الہ آباد پھولپور کا راستہ انہی سے معلوم کر کے راقم پھولپور الہ آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ چنانچہ رائے بریلی سے الہ آباد پھونچا اور الہ آباد سے پھولپور پہونچ گیا، جہاں ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا فیاض احمد صاحب قیام پذیر تھے اور ایک بڑا ادارہ چلا رہے تھے، جن کے علم وفن سے راقم طالب علمی کے زمانہ سے متاثر تھا اور جن کی سرپرستی میں رہ کر راقم اپنا تدریسی سلسلہ جاری رکھنے کا خواہش مند تھا ان کے پاس پہونچ کر راقم نے پوری بات بیان کی اور اسی کے ساتھ شعبان میں حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کا جو فیصلہ راقم کے لئے ہوا تھا اس کی بھی اطلاع کی، سب کچھ سننے کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا کہ جونپور تو یہاں سے بہت قریب ہے، اگر جانا ہو تو بس کے ذریعہ وہاں

پہونچنا مشکل نہیں۔راقم نے یہ سوچ کر مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور دیکھنے کا فیصلہ کرلیا کہ جب اتنا قریب آگئے ہیں تو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔''شنیدہ کے بود مانند دیدہ''۔لہٰذا چل کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے تاکہ جب اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی جگہ ہوگی تو فیصلے میں آسانی رہے گی۔

پھولپور الٰہ آباد سے مدرسہ ریاض العلوم گورینی کا سفر

چنانچہ کل ہوکر بس کے ذریعہ پھولپور سے جونپور کے لئے روانہ ہوا اور جونپور سے بس تبدیل کر کے گورینی کے لئے چلا، گورینی مدرسہ کے پاس جب بس رکی اور اتر کر مدرسہ میں داخل ہوا تو عشاء کی نماز ختم ہوچکی تھی اور مسجد سے سب سے پہلے راقم کے پرانے آشنا جن سے اس سے پہلے دہلی میں کئی بار ملاقات ہوچکی تھی مولانا مبارک علی صاحب بارہ بنکوی نکلے ان سے مل کر گویا کہ سفر کی تکان دور ہوگئی، مدرسہ کے بیچ احاطہ میں موجود کچے تالاب میں وضوء کر کے عشاء کی نماز سے فارغ ہوا، اتنے میں مسجد سے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کئی رفقاء کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر باہر تشریف لائے۔راقم نے فوراً ملاقات کی، اپنا تعارف کرایا، حضرت مولانا پہچان گئے اور اپنے برخوردار مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کو بلایا اور راقم کو ان کے حوالے فرمادیا کہ ان کو کھانا کھلادو اور حضرت مولانا مشکوۃ شریف کا درس دینے تشریف لے گئے۔

مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی سے چونکہ دارالعلوم دیوبند کی شوری کے موقع

سے حضرت مولانا کی رفاقت میں دو مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی، اس لئے انہوں نے بھی پوری اپنائیت کا ثبوت دیا اور سفر کی رہی سہی تکان کی کسر بھی انھوں نے دور کر دی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم تینوں یعنی راقم اور مولانا مبارک علی صاحب اور مولانا عبد العظیم صاحب ندوی محو گفتگو رہے، اور مدرسہ کا رات ہی میں معائنہ بھی کیا، مدرسہ کے کلیات کو دیکھ کر طبیعت کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی، مگر ترجیحات میں کئی چیزوں کے ساتھ ایک چیز یہ بھی بنی کہ یہاں دونوں وقت کھانے میں چاول بھی دیا جاتا ہے، راقم کے لئے یہ چیز راحت کی محسوس ہوئی چونکہ سہارنپور کے علاقہ میں دونوں وقت مسلسل روٹی کھا کر اوبھ چکا تھا۔

مولانا منیر احمد صاحب بستوی کی ملاقات

اسی دوران مولانا منیر احمد صاحب بستوی سے ملاقات ہوگئی جو بمبئی کالینہ کی جامع مسجد میں ایک زمانہ تک امام و خطیب رہے، اس وقت وہ بھی وہاں موجود تھے، چونکہ ان سے شناسائی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے زمانہ طالب علمی سے تھی، ان کی ملاقات نے مزید انس فراہم کیا، ایک عرصہ کے بعد مل کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، مولانا نے راقم کے یہاں پہونچنے کی وجہ پوچھی، راقم نے اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب کی پوری بات ان سے نقل کی، سننے کے بعد وہ فوراً مجھ کو لے کر حضرت کے پاس

گئے اور حضرت مولانا کو حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی پوری بات سنائی، حضرت مولانا سننے کے بعد بہت خوش ہوئے اور اس کے ساتھ یہ فرمایا کہ حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے جد و ہزل میں آج تک میں فرق نہیں کر پایا، فیصل آباد پاکستان کے قیام کے دوران انہوں نے کئی مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ آپ کی امانت رکھی ہوئی ہے اس کو وصول کر کے استعمال شروع کر دیں، کہیں ضائع نہ ہو جائے، لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کا اشارہ کس بات کی طرف ہے، آج سمجھ میں آیا کہ یہ جملہ حضرت مفتی صاحب آپ ہی کے بارے میں فرما رہے تھے۔ بہر حال تھوڑی دیر کی ملاقات کے بعد راقم واپس آ گیا، چونکہ حضرت کو تھوڑی ہی دیر کے بعد سفر حج میں نکلنا تھا، اس لئے فوراً بلا تاخیر مدرسہ کے اہم ذمہ داران کی میٹنگ طلب کر لی اور تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا نے راقم کو بلا کر یہ فرمایا کہ میں تو سفر حج میں جا رہا ہوں، آپ دفتر پہونچ کر مولانا وکیل صاحب سے ملاقات کر لیں۔ راقم حضرت مولانا سے الوداعی ملاقات کر کے رخصت ہوا، دفتر پہونچ کر حضرت مولانا وکیل صاحب سے ملاقات کی، انھوں نے راقم سے کہا کہ آپ کی تقرری بحیثیت مفتی اور مدرس یہاں کر لی گئی ہے۔ دو سو پینتالیس روپئے آپ کی تنخواہ ہوگی، اور آپ کے ذمہ افتاء کے کام کے ساتھ تدریسی کتابیں بھی ہوں گی۔ پینتالیس روپئے خوراکی کٹے گی، راقم نے پوری بات مولانا وکیل صاحب کی زبانی سن لی اور پرانے آشنا و رفقاء و حاضرین سے ملاقات کر کے اگلے سفر کے لئے روانہ ہو گیا۔

ہتھورا باندہ کا سفر

چنانچہ اس کے بعد راقم مدرسہ ریاض العلوم گورینی سے ہتھورا باندہ کے لئے روانہ ہوگیا اور ہتھورا پہونچ کر پوری تفصیل راقم نے حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی سے بتائی اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ میں گورینی جا کر آیا ہوں اور گورینی کے سفر کی پوری تفصیلات راقم نے حضرت قاری صاحب کو سنائی۔ حضرت تفصیلات سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ چلئے میں بھی آپ کے ساتھ دیوبند چلتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحب دیوبند تشریف لا چکے ہیں، ملاقات بھی ہوجائے گی اور آپ کے سلسلہ میں بات بھی کرلوں گا۔

چنانچہ راقم کو لے کر حضرت قاری صاحب دیوبند تشریف لائے اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے آدھے گھنٹے تک تخلیہ میں کچھ بات کی، پھر باہر آ کر مجھ سے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب سے آپ کے بارے میں بات ہوگئی ہے اور آپ کا گورینی جونپور جانا طے ہوگیا ہے، لہٰذا آپ اطمینان کے ساتھ حضرت کے پاس رہیں، اب میں ہتھورا باندہ جارہا ہوں، چنانچہ چند گھنٹوں کے بعد حضرت قاری صاحب دیوبند سے روانہ ہوگئے۔

اس کے بعد راقم حضرت مفتی صاحب کے پاس قیام پذیر رہا، کل ہوکر حضرت مفتی صاحب نے راقم سے فرمایا کہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آگئے اور حضرت قاری صدیق احمد

صاحب باندوی نے بھی اس کی تصدیق وتائید کی ہے کہ آپ کا وہاں جانا مناسب ہے، لہٰذا اب آپ مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور جانے کی تیاری کر لیں۔

حضرت مفتی صاحب سے راقم کی معروضات

رات کے وقت جب تخلیہ کا وقت ملا اور حضرت مفتی صاحب آرام کے لئے بستر پر لیٹ گئے تو راقم نے گورینی کے سفر کی پوری تفصیل حضرت کو سنائی، اس کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ حضرت وہاں کے مدرسے کے ذمہ داروں نے یہ بتایا کہ دوسو پینتالیس روپئے تنخواہ ملے گی جس میں سے پینتالیس روپئے ماہانہ خوراکی کی کٹ جایا کرے گی اور باقی دوسو روپئے ہر ماہ ملا کریں گے۔

اس کے بعد راقم نے یہ عرض کیا کہ حضرت میں بیوی بال بچے والا ہوں، ایک بچی بھی ہے اس کے ساتھ والدین اور بھائی بہن بھی ہیں، دوسو روپئے میں کیسے گزارہ ہوگا، یہ پوری بات حضرت مفتی صاحب بستر پر لیٹے ہوئے سن رہے تھے، راقم کی معروضات سننے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئے اور راقم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جس زمانہ میں، میں کانپور میں تھا اس وقت میرے ایک دوست ملاقات کے لئے آئے اور چند روز قیام کیا، اس کے بعد ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ مفتی صاحب آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ میں نے کہا کہ مت پوچھو تمہاری سمجھ سے باہر ہے، لیکن ان کے بار بار اصرار کے بعد میں نے بتایا کہ میری تنخواہ ساٹھ روپیہ ہے، پچاس روپئے مہینہ بیوی بچوں کے

خرچ کے لئے گھر بھیج دیتا ہوں اور دس روپیہ ایک صاحب کو دیتا ہوں جن کے یہاں سے میرا ایک وقت کا کھانا آتا ہے، باقی کچھ بچتا ہے تو میں ناشتے کا انتظام کر لیتا ہوں اور کچھ بچتا ہے تو کچھ کتابیں خرید لیتا ہوں اور کچھ بچتا ہے تو کپڑا بنوا لیتا ہوں اور کچھ بچتا ہے تو کچھ غریب بچوں کی مدد کر دیتا ہوں اور کچھ بچتا ہے تو حج وغیرہ کر لیتا ہوں۔

یہ جواب سن کر وہ صاحب حیران ہو گئے اور کہنے لگے کہ آمد و خرچ میں کوئی جوڑ نہیں ہے، یہ حساب تو بہت بے جوڑ ہے، اس کے جواب میں میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کی سمجھ سے باہر ہے، آپ مت پوچھیں لیکن آپ مانے نہیں اس لئے مجبوراً بتانا پڑا کہ یہ واقعہ سنا کر حضرت مفتی صاحب راقم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ پیارے جاؤ اللہ کی رضاء سامنے رکھ کر کام کرنا، اس کے بعد شعبان میں آکر مجھ کو بتانا کہ تنخواہ کتنی تھی اور خرچ کتنا تھا، اس کے بعد راقم خاموش ہو گیا، مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے یہاں چلہ لگانے کی تجویز

چند روز کے قیام کے بعد حضرت مفتی صاحب نے راقم کو بلا کر فرمایا کہ میرے یہاں تو آنا جانا لگا رہے گا، لیکن حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مدینہ طیبہ سے فیصل آباد میں اعتکاف کر کے تشریف لائے ہوئے ہیں، سہارنپور میں مختصر قیام ہے، اس کے بعد مدینہ طیبہ پھر واپسی ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ تم جا کر

ایک چلہ یعنی چالیس دن حضرت شیخ کے یہاں قیام کرلو۔ اس کے بعد وہاں سے ریاض العلوم گورینی جونپور چلے جانا، چنانچہ بلاتردد حضرت مفتی صاحب کی رائے کے احترام میں کل ہوکر سہارنپور کے لئے روانہ ہوگیا اور روانگی کے وقت خلاف معمول حضرت مفتی صاحب نے بہت اہتمام کے ساتھ ایک خط حضرت شیخ کے نام لکھ کر دیا۔ راقم جب سہارنپور پہونچا تو کتب خانہ یحیوی کے پاس بھائی طلحہ موجود تھے، راقم نے حضرت مفتی صاحب کا دیا ہوا خط یہ کہتے ہوئے ان کے سپرد کیا کہ یہ خط حضرت مفتی صاحب نے دیا ہے، خط پا کر بھائی طلحہ ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے لے جاکر حضرت شیخ کو پیش کیا اور کہنے لگے مفتی جی تو کبھی خط لکھتے نہیں، کیا بات ہے؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟ حضرت مفتی صاحب نے راقم سے متعلق کچھ باتیں حضرت شیخ کو لکھیں تھیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے راقم کی ملاقات

جب بھائی طلحہ نے حضرت مفتی صاحب کا مکتوب حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور حضرت نے اس مکتوب کو پڑھوا کر سن لیا، اس کے بعد ایک قاصد راقم کے پاس پہونچا کہ حضرت شیخ بلا رہے ہیں، طلبی پر راقم خدمت میں حاضر ہوکر سلام ومصافحہ سے مشرف ہوا، اس کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ پیارے یہ اپنی جگہ ہے، اس سے پہلے بھی تم یہاں رہ چکے ہو، اب تو ہمارے مفتی جی نے تمہارے بارے میں بہت کچھ لکھ کر بھیجا ہے، اس لئے یہاں رہنے میں کوئی

وقت نہیں، اپنی جگہ سمجھ کر جب تک دل چاہے قیام کرو، اس کے بعد حضرت شیخ نے راقم کے معمولات دریافت فرمائے، راقم نے بلا تکلف بتلا دیا، اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث صاحب نے آخری سوال یہ فرمایا کہ کیا مفتی جی نے تم کو اجازت دے دی ہے؟ راقم نے اس کے جواب میں عرض کیا، ابھی نہیں، اس کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، یہاں صبح کے ساتھ شام کو بھی ذکر کی مجلس ہوتی ہے، اس میں آجایا کرو، اس کے بعد راقم کا قیام مہمان خانہ میں حضرت نے طے فرما دیا۔ چنانچہ اس کے بعد چالیس دن یعنی ایک چلہ حضرت مفتی صاحب کے حکم اور خواہش پر تدریسی سلسلہ کے آغاز سے پہلے شیخ کامل عارف باللہ حضرت شیخ الحدیث صاحب کی معیت میں گزارنے کی اللہ نے سعادت نصیب فرمائی۔

ان ایام میں راقم کا قیام جب حضرت شیخ الحدیث صاحب کی خدمت میں تھا ہندوستان کے بہت سے اکابرین و اساطین امت وملت کی ملاقات اور زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بالخصوص علی گڑھ کے نادر علی خاں صاحب جن کا قیام کافی لمبا تھا، جن کی عشاء کے بعد مدرسہ مظاہر علوم کے دفتر میں جو حضرت شیخ کے مہمانوں کی قیام گاہ تھی پُر بہار مجلس لگا کرتی تھی، جس سے سارے مہمان محظوظ ہوتے تھے، لیکن باوجود سفارش اور وکالت کے اس قیام میں نادر خاں صاحب تحصیل نسبت سے محروم رہے۔

راقم صبح شام کی مجلس کے علاوہ عصر کے بعد بھی عمومی مجلس میں پابندی سے شرکت کیا کرتا تھا جس میں خواص کے ساتھ عوام کی بھی آمد و رفت رہتی تھی، کچے گھر کے لمبے چبوترے پر حضرت مولانا یامین صاحب قلم کاغذ لے کر روزانہ پابندی سے

تشریف فرما ہوتے تھے، اگر کوئی شخص تعویذ کی درخواست کرتا تو حضرت شیخ الحدیث صاحب مولانا یامین صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور روزانہ بیعت ہونے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی، جن کو حضرت شیخ بیعت فرمایا کرتے تھے۔ راقم کے قیام کے دوران مولانا احمد لولات جو سورت گجرات کے رہنے والے تھے، وہ حضرت شیخ کے کلمات کو بلند آواز سے دہراتے اور بیعت ہونے والے ان کلمات کا اعادہ کرتے۔

پانچوں نمازیں حتی کہ جمعہ کی نماز بھی کچے گھر میں ہوا کرتی تھی، راقم جمعہ کی نماز کے ساتھ پنج وقتہ نمازیں بھی حضرت شیخ کی معیت میں ادا کرتا تھا، کچھ دیر عشاء کے بعد خواص و خدام کی مجلس ہوا کرتی تھی، اس میں بھی راقم شریک رہا کرتا تھا، عیدالاضحیٰ کی نماز اور قربانی کے بھی ایام حضرت شیخ کی معیت میں گزرے۔

ایام قربانی کا ایک اہم واقعہ

قربانی کے زمانے میں بہت سے اہم مہمان خانقاہ میں مقیم تھے اور ان حضرات نے اپنی اپنی طرف سے قربانی کے لئے بکرے کا بھی نظم کر رکھا تھا، ان مہمانوں میں ایک اہم مہمان مولانا عبد الوحید مکی تھے جو حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مکی کے چھوٹے بھائی تھے، اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ التحصیل بھی تھے، انہوں نے بھی قربانی کے لئے دس بکرے خرید رکھے تھے، انھوں نے جب اپنے

بکرے ذبح کروائے تو ان بکروں کے خصیتین جس کو کپورے بھی کہا جاتا ہے نکلوائے اور بہت اہتمام سے اس کو کڑھائی میں تلوایا اور بہت شوق سے مولانا عبدالوحید مکی اور ان کے رفقاء نے جن میں حضرت شیخ کے بعض اہم خدام بھی تھے تناول کیا۔

یہ پورا منظر راقم دیکھتا رہا اور فتاوی ہندیہ کا وہ جزئیہ ذہن میں گردش کرتا رہا جس میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حلال جانور کی سات چیزیں حرام ہیں، جن میں خصیتین بھی داخل ہے۔ اپنے حافظہ کی تجدید کے لئے کتب خانہ اختری سے اختری بہشتی زیور مکمل و مدلل لے کر دیکھا تو اس میں بھی وہی مسئلہ مذکور تھا جو راقم کے ذہن میں محفوظ تھا، راقم نے اپنے ذہن کو بہت سمجھانے اور منانے کی کوشش کی کہ مولانا عبدالوحید صاحب بڑے عالم ہیں اونچی نسبت کے حامل ہیں، ممکن ہے اس کی گنجائش ان کے علم میں ہو، بالآخر مجبوراً راقم نے مولانا عبدالوحید صاحب سے ملاقات کر کے یہ سوال ان سے کر ہی ڈالا کہ آپ نے کپورے پکوا کر کھائے ہیں جبکہ فقہاء نے اس کے کھانے سے منع کیا ہے۔ کیا اس کے جواز کی کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ راقم جاننا چاہتا ہے۔

لیکن اس کے جواب میں بجائے کوئی مثبت بات کرنے کے راقم کا استہزاء اور مذاق اڑانا شروع کیا جس کی تائید دوسرے بیٹھے ہوئے ان کے رفقاء نے بھی کی، انہوں نے دل کھول کر راقم کا مذاق اڑایا اور بات یہیں نہیں رکی بلکہ شام کے وقت پھر انہوں نے چند بکرے ذبح کروائے اور ان کے بھی کپورے نکلوا کر تلوا کر دسترخوان پر راقم کے قریب بیٹھ کر تناول کیا، اور خوب راقم کا مذاق اڑایا، اس پر راقم اپنے غصے کو

برداشت نہیں کرسکا اور عالمانہ انداز میں ان کی زبردست خبر لی، جس کے جواب میں بعض خدام نے بعد میں راقم سے کہا کہ تم کو پتہ ہے یہ مولانا عبدالوحید مکی ہیں، یہ حضرت شیخ کے چہیتے خدام میں ہیں، اگر حضرت شیخ تک خبر پہونچ گئی تو تم خانقاہ سے نکال باہر کردیئے جاؤ گے، اس پر راقم نے ان کی بھی خوب خبر لی اور کہا کہ کوئی غلط کام حضرت شیخ کے دسترخوان پر ہو اور اس پر نکیر نہ کی جائے، یہ راقم کے نزدیک مداہنت ہے، راقم اس کو کسی قیمت برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ بات دھیرے دھیرے سارے مہمانوں میں پھیل گئی، ان مہمانوں میں ایک اہم مہمان حاجی ابراہیم پہلوان بھی تھے جو فیصل آباد پاکستان کے رہنے والے تھے اور حضرت شیخ کے عشاق میں سے تھے، اس واقعہ کی اطلاع جب ان کو ہوئی تو راقم کو بلاکر واقعہ کی تفصیل معلوم کی اس کے بعد اسی وقت جبکہ رات عشاء کے بعد کا وقت تھا راقم کو لے کر حضرت مفتی یحیٰ صاحب کے مکان پر گئے، شروع میں حضرت مولانا سلمان صاحب سے ملاقات ہوگئی، حاجی ابراہیم صاحب پہلوان نے ان سے کپورے کا مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو راقم دے چکا تھا، اس کے بعد حضرت مفتی یحی صاحب جو مدرسہ مظاہر علوم کے دارالافتاء کے صدر مفتی تھے ان سے ملاقات کرکے حاجی ابراہیم صاحب پہلوان نے مسئلہ معلوم کیا کہ کپورے کھانے کا کیا حکم ہے؟ حضرت مفتی یحیٰ صاحب نے بھی وہی جواب دیا جو راقم بتا چکا تھا۔ اس کے بعد حاجی ابراہیم صاحب پہلوان پورے غصے میں واپس آئے اور مولانا عبدالوحید مکی اور ان کے رفقاء کو بلاکر راقم کی موجودگی میں اتنا ڈانٹا کہ ان سب کی بولتی بند ہوگئی۔

اس کے بعد باوجودیکہ ان سب کے مقابلہ میں راقم عمر کے اعتبار سے خورد تھا لیکن حاجی ابراہیم صاحب پہلوان بہت احترام کرنے لگے، یہ ایک اہم واقعہ تھا جو قربانی کے ایام میں حضرت شیخ کی خانقاہ میں پیش آیا۔

چالیس دن کے قیام کے دوران ایک دوسرا واقعہ

انہی ایام میں جب راقم حضرت شیخ کے یہاں مقیم تھا اور تزکیہ باطن کا چلہ لگا رہا تھا جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے پہلے دو بڑے عالم جو وضع قطع اور لباس سے بھی بڑے عالم معلوم ہورہے تھے، کچے گھر میں داخل ہوئے جیسے وہ دروازہ پر پہونچے حضرت شیخ کی نظر ان پر پڑ گئی، حضرت شیخ نے گھور کر بھائی ابوالحسن کو دیکھا، بھائی ابوالحسن جو حضرت شیخ کے چہیتے خادم خاص تھے، وہ حضرت شیخ کی نگاہ کو تاڑ گئے اور کود کر دروازہ پر پہونچے اور ان دونوں علماء کو باہر کردیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر یہ دونوں حضرات آئے، پھر وہی پرانا برتاؤ، ان کے ساتھ کیا گیا راقم کو یہ منظر دیکھ کر بڑا ترس آیا، لیکن ان کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ وہ کون حضرات تھے، عصر کے بعد راقم کچے گھر میں موجود تھا، انہی دونوں علماء کو اپنے ساتھ لے کر مولانا خالد صاحب حضرت شیخ کے پاس پہونچے، مولانا خالد صاحب حضرت مفتی یحیٰ صاحب کے لڑکے اور حضرت مولانا سلمان صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، جو مدرسہ مظاہر علوم کے کام کے سلسلہ میں جونپور شاہ گنج وغیرہ جایا کرتے تھے، اور اس مدرسہ

میں بھی وہ قیام کرتے تھے جس مدرسہ کے یہ دونوں حضرات ذمہ دار تھے۔حضرت شیخ کے پاس پہونچ کر مولانا خالد صاحب نے ان دونوں علماء کا تعارف کرایا اور سلام ومصافحہ کروایا اور کچھ دیر مجلس میں بیٹھنے کی ان کو سعادت حاصل ہوئی، ان دونوں علماء میں سے ایک مولانا احمد صاحب جونپوری تھے جو مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج ضلع جونپور کے ذمہ دار تھے اور دوسرے عالم مولانا شبیر احمد صاحب قاسمی تھے جو اسی مدرسہ کے صدر مدرس تھے، اور حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلالپوری کے بھائی تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد خواص کی مجلس سے فارغ ہوکر جب راقم دفتر پہونچا جہاں قیام تھا تو وہاں ان دونوں علماء سے ملاقات ہوئی۔ راقم جونپور کے نام پر بہت شوق سے ان سے ملا اور ان دونوں حضرات نے بھی راقم سے شفقت ومحبت سے ملاقات کی، دیر تک گفتگو ہوتی رہی جب ان حضرات کو یہ معلوم ہوا کہ راقم چلہ پورا کرنے کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی جانے والا ہے تو ان کو اس پر بہت حیرت ہوئی اور یہ کہا کہ وہاں تو کوئی قاسمی ٹک نہیں پاتا ہے، آپ کیسے ٹک پائیں گے۔اس کے بعد دیر تک گفتگو ہوتی رہی، اس گفتگو میں انہوں نے مختلف انداز کے سوالات راقم سے کئے، راقم ان کا جواب دیتا رہا۔اخیر میں ان دونوں حضرات نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ آپ عمر میں تو کم دکھائی دے رہے ہیں لیکن تجربات آپ کے کسی پرانے ماہر اور تجربہ کار مدرس سے کم نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ ضرور وہاں ٹک جائیں گے، اسی کے ساتھ انہوں نے اپنا نام و پتہ بھی دیا کہ جب گورینی آپ تشریف لائیں تو شاہ گنج بدر الاسلام ضرور آئیں اور ضرور ملاقات کریں، ہمیں آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور

بہت ساری معلومات حاصل ہوئیں۔

چلہ مکمل ہونے کے بعد ریاض العلوم گورینی جونپور کے لئے روانگی

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے یہاں جب چالیس دن مکمل ہوگئے تو بقرعید کے بعد راقم مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا، جب شاہ گنج پہونچ کر ٹرین سے اترا تو پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے ایک طالب علم سے ملاقات ہوئی، تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا نام مظفر ہے اور تھانہ بھون سے آرہے ہیں، اور ریاض العلوم گورینی جانا ہے۔ راقم نے جواب میں اپنا تعارف کرایا اور یہ بتلایا کہ مجھ کو بھی ریاض العلوم گورینی جانا ہے، یہ سننے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ سے سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں ریاض العلوم گورینی بعافیت پہونچ گئے۔

وہاں پہونچنے کے بعد وہاں کے طلباء واساتذہ سے ملاقات کی، چونکہ راقم اس سے پہلے یہاں آچکا تھا اس لئے کوئی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی، ذمہ داروں سے ملاقات کے بعد راقم کا قیام ایک چھوٹے سے اس کمرے میں طے پایا جو دفتر کے سامنے مولانا وکیل احمد صاحب ناظم دفتر محاسبی کے بغل میں تھا اور جس میں حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب بانی وناظم مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔

اسباق مجوزہ کی تفویض

کل ہوکر مدرسہ کے ذمہ داروں نے جو اسباق راقم کے سپرد کئے جن کی تدریس راقم کے ذمے کی گئی وہ درج ذیل کتابیں تھیں:

میبذی، قطبی، مرقات، شرح تہذیب، بوستاں وغیرہ۔ چنانچہ راقم نے خوشی خوشی ان کتابوں کی تدریس قبول کی اور تدریس میں اپنے آپ کو مصروف کردیا۔

اکابرین ثلاثہ کو دعاء کے لئے مکتوب کی ترسیل

مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچنے کے بعد راقم نے تین بزرگوں کو جوابی خط لکھا: (۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب (۲) حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی (۳) حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی۔ راقم نے ان تینوں بزرگوں سے دعاء کی درخواست کی اور بخیر رسی کی اطلاع دی۔

تینوں بزرگوں کا جو جواب راقم کو موصول ہوا اس کا ماحصل تین باتیں تھیں: (۱) مدرسہ کے کام کو اپنا کام سمجھ کر کرنا (۲) مدرسہ کے انتظامی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کرنا (۳) مدرسہ کا کوئی کام ڈیوٹی سمجھ کر مت کرنا، بلکہ اپنا کام سمجھ کر کرنا۔

چنانچہ الحمداللہ خادم نے اپنے اکابرین کی نصیحت کے مطابق پوری تندہی اور فکرمندی کے ساتھ کام شروع کردیا۔

بوقت حاضری حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری کی عدم موجودگی

جب خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا تو اس وقت حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مدرسہ میں تشریف فرمانہیں تھے، بلکہ سفر حج میں گئے ہوئے تھے، جب حضرت حج سے تشریف لائے تو آپ نے اپنے برخوردار نائب ناظم کو بلا کر پوچھا کہ ہمارے مفتی صاحب کیسے لگے؟ انھوں نے جواب میں جو جملہ کہا حضرت نے وہ جملہ اپنی زبان سے خود نقل فرماتے ہوئے خادم کو سنایا کہ حج سے واپسی کے بعد جب میں نے نائب ناظم سے پوچھا کہ ہمارے مفتی صاحب کیسے لگے تو اس نے جواب میں کہا ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تسویف نہیں ہے، یعنی کسی کام میں ٹال مٹول نہیں ہے، بلکہ کل کے کام کو وہ آج کرتے ہیں۔ یعنی نائب ناظم کا جواب سن کر حضرت مولانا بہت مطمئن اور مسرور ہوئے جس کو انداز بیان اور چہرے سے خادم نے بھی محسوس کیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا کی توجہ خادم کی طرف بڑھتی گئی اور اس خادم نے حضرت کے منشاء کے مطابق کام شروع کردیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت سے قربت بڑھتی چلی گئی اور بہت جلدی یہ خادم اپنوں اور غیروں کا محسود بن گیا۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں حاضری کے وقت مدرسہ کا تدریسی انداز

یہ خادم جب مدرسہ ریاض العلوم پہونچا اور تدریسی کام میں مصروف ہوا تو یہ

جان کر خادم کو بہت حیرت ہوئی کہ وہاں کے اساتذہ درسی کتابیں عربی شروحات کے ساتھ اردو شروحات سامنے رکھ کر پڑھاتے ہیں، لیکن خادم نے وہ انداز بدلا اور ایک نیا انداز تدریس ریاض العلوم کو دیا جس سے مدرسہ محروم تھا اور وہ انداز تدریس وہ تھا جس سے مستفید ہو کر یہ خادم آیا تھا۔

جس کتاب کا درس دینا ہوتا مضمون کے اعتبار سے خادم اس کے صفحات کی تعیین کرتا اور پھر اس کا مطالعہ کر کے مصنف کی باتوں کے ماحصل کا نچوڑ مرتب انداز میں اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جس سے حل کتاب کے ساتھ مضمون بھی حل ہو جاتا، اس کے ساتھ بقدر ضرورت قیل و قال اور مالہ و ماعلیہ کو مرتب کر کے منقح انداز میں ذہن نشین کرتا اور اس کے لئے خادم نے چند چیزوں کا اپنے کو عادی بنایا:

(۱) کتاب کے حاشیہ اور بین السطور کو بہت غور سے پڑھتا اور اس کی مدد سے مصنف کی مراد کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتا۔

(۲) بوقت ضرورت صرف عربی شروحات سے مدد لیتا اردو شروحات سے مکمل گریز کرتا، اضطرار کی حالت میں استثنائی درجہ میں کبھی کبھار اردو شروحات کو ہاتھ لگانے کی نوبت آتی۔

(۳) کسی استاذ یا کسی بڑے سے مراجعت سے گریز کرتا اور پورا زور اپنے دماغ پر ڈال کر اس کو حل کرنے کی آخری دم تک کوشش کرتا۔

اس طرح منظّم اور مرتب انداز میں مضمون جب ذہن میں مستحضر ہو جاتا تب درس دینے کے لئے بیٹھتا، خادم کے سامنے شرح تو درکنار زیر درس متن کی بھی گنجائش

نہیں تھی، کتاب صرف طلباء کے سامنے ہوتی، طلباء میں سے کوئی ایک طالب علم عبارت پڑھتا اس کے بعد خادم حل عبارت وحل مضمون پر مرتب اور منظم انداز میں تقریر کرتا، تقریر ختم ہونے کے بعد عبارت خواں طالب علم ہی سے اس مضمون کا انطباق کراتے ہوئے ترجمہ اور تشریح مکمل کراتا، اس طرح طلباء کے ذہنوں میں پڑھے ہوئے سبق کا خلاصہ حل ہوکر محفوظ ہوجاتا۔ اور پوری بشاست وانبساط کے ساتھ خادم کی درسگاہ سے واپس ہوتے۔

اس نئے انداز تدریس کا یہ اثر ہوا کہ طلباء دھیرے دھیرے خادم کے گرویدہ بن گئے اور ان کی فریفتگی میں اتنا اضافہ ہوا کہ دوسرے اساتذہ کی نظر میں یہ خادم محسود بن گیا۔

قطبی کی تدریس کا ایک واقعہ

خادم نے جب قطبی کا درس شروع کیا تو اس میں شریک اکثر طلباء ذہین تھے، انہیں طلباء میں عمر نامی ایک طالب علم جو کمپیر گنج گورکھپور کا رہنے والا تھا اور بہت زیادہ با ادب اور باشعور اور سنجیدہ مزاج تھا، کچھ دنوں کے بعد جب طلباء خادم سے مانوس ہوگئے اور قدرے بے تکلفی بھی ہوگئی تو عمر گورکھپوری نے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں قطبی کی گھنٹی میں یہ واقعہ سنایا جس کی تصدیق اس کے سارے ساتھیوں نے کی۔

اس نے گفتگو کا آغاز اس جملہ سے کیا کہ حضرت اللہ آپ کو جزاء خیر دے کہ

آپ یہاں آ گئے اور قطبی کو دوبارہ زندگی مل گئی ورنہ تو اس کی تجہیز و تکفین ہو چکی تھی، صرف تدفین کا مرحلہ باقی تھا۔

خادم نے پوچھا کیا بات تھی؟ عمر گورکھپوری نے کہا کہ آپ کے آنے سے پہلے شوال میں یہ کتاب فلاں استاذ کے سپرد ہوئی، وہ دو ہفتے تک مستقل اس کے اور منطق کے خلاف تقریر کرتے رہے، تا آنکہ انہوں نے ہمارے تمام ساتھیوں کو اس پر تیار کر لیا کہ اجتماعی طور پر ایک درخواست لکھ کر تمام شرکاء سے دستخط کرا کر دفتر انتظام کو دیا جائے تا کہ وہ قطبی کو نصاب سے باہر نکال دیں۔ چنانچہ ہمارے سب ساتھی اس کام کے لئے تیار ہو گئے، انہوں نے ایک درخواست لکھی اور سب نے اس پر دستخط کیے جب میرے پاس دستخط کے لئے وہ درخواست لائے تو میں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے وہ درخواست دفتر انتظام نہیں پہونچ سکی اور اس پر کوئی کاروائی نہیں ہو سکی، لیکن بقرعید تک اس کا ایک سبق بھی نہیں پڑھایا گیا۔ تا آں کہ آپ تشریف لے آئے اور آپ کے حوالہ یہ قطبی کر دی گئی اور دو ہفتے میں آپ نے جس انداز سے جتنا پڑھایا اس سے ہمارے تمام ساتھیوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کتاب اور اس کے مضامین کافی اہم و قابل قدر اور پڑھنے کے لائق ہیں۔

الغرض اگر بقرعید کے بعد آپ نہ آئے ہوتے تو اس کتاب اور اس فن کے قتل ناحق کے گنہ گار ہمارے تمام ساتھی ہوتے۔

اس کے بعد قطبی کے تمام شرکاء نے پوری دلچسپی کے ساتھ ایک ایک سطر کو سمجھ کر مطمئن ہو کر یہ کتاب خادم سے پڑھی۔ انداز تدریس سے متاثر ہو کر مشکوۃ کے طلباء

نے خادم سے میبذی پڑھنے کی درخواست کی اور فجر کے بعد خارج میں تمام شرکاء مشکوۃ بہت اہتمام اور التزام کے ساتھ پورے سال خادم سے میبذی پڑھتے رہے۔

قطبی کا دوسرا واقعہ

قطبی پڑھاتے ہوئے ایک دن ایک عبارت لاینحل ہوگئی، بہت دماغ لگایا لیکن وہ عبارت حل نہیں ہوئی۔ بالآخر بیٹھ کر مطالعہ کرتے کرتے جب تھک گیا تو لیٹ کر اس عبارت کو حل کرنے لگا، ڈھائی بجے رات تک عبارت حل نہیں ہوسکی، اس کے بعد کتاب ہاتھ ہی میں تھی اور نیند آ گئی، خواب میں میرے ایک استاذ محترم (حضرت مولانا فیاض احمد صاحب) اچانک آئے میرے کمرے کا دروازہ کھولا اور دروازہ کھولتے ہی خادم کو آواز دے کر کہا اللہ کے بندے عبارت یہ نہیں بلکہ یہ ہے، جب انہوں نے عبارت درست کر دی تو فوراً مطلب سمجھ میں آ گیا جیسے کاندھلوی کو کوئی شخص کان دہلوی پڑھ دے تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا اور وہ پریشان ہوگا، اسی طرح خادم کے ساتھ بھی عبارت کا معاملہ پیش آ گیا تھا۔

شرح تہذیب پڑھاتے ہوئے ایک طالب علم کا واقعہ

ریاض العلوم گورینی کے تدریس کے پہلے ہی سال میں میبذی اور قطبی کے

ساتھ شرح تہذیب بھی دی گئی، شرح تہذیب پڑھانے کا بھی انداز اس خادم کا میبذی اور قطبی ہی جیسا تھا، شرح تہذیب کی جماعت میں بھی اکثر طلباء ذہین تھے، ان میں سب سے لائق و فائق عثمان نامی ایک طالب علم تھا، جو مدرسہ ریاض العلوم کے بانی و ناظم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری کا نواسہ تھا اور مدرسہ کے ناظم مالیات حافظ محمد عمر صاحب کا لڑکا تھا اور مدرسہ کے نائب ناظم کا بھانجہ تھا جس کا شمار ذہین طلباء میں ہوتا تھا، لیکن بچپن اور لا ابالی پن اس میں ضرورت سے زیادہ تھا، پورے مدرسہ میں صرف مدرسہ کے صدر مدرس کے علم کا قدرے معترف تھا، باقی کسی استاذ کو وہ گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ شرح تہذیب کا سبق آنے سے پہلے جب خادم کے تدریس کے انداز کی دھوم مچی تو کافیہ جو صدر مدرس سے پڑھ رہا تھا بطور امتحان کے اس کی عبارت سمجھنے کے لئے بھی اس خادم کے پاس آچکا تھا اور مطمئن ہو کر جا چکا تھا۔

جب خادم نے شرح تہذیب پڑھانا شروع کیا تو ابتداء بہت لاابالی پن کے ساتھ شریک درس ہوا، لیکن ایک ہفتہ پڑھانے کے بعد جب خادم نے آموختہ یاد کرنے کو کہا اور اس کے سنانے کی باری آئی تو بہت لا ابالی انداز میں اس نے سنانا شروع کیا جس سے اندازہ لگا کہ اسنے آموختہ پر کوئی توجہ نہیں دی، سوالات کے جوابات پر یا تو خاموش رہا یا غلط جواب دیا، اس کے بعد خادم نے ڈنڈا اٹھا کر دو چار ڈنڈا رسید کیا، اس کے بعد اس کا سارا غرور چکنا چور ہو گیا اور اس میں جو سنجیدگی پیدا ہوئی وہ دورۂ حدیث تک باقی رہی اور دھیرے دھیرے تعلق و وابستگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک مرتبہ ان کے ماموں نے جو مدرسہ کے نائب ناظم تھے راقم سے کہا کہ مفتی صاحب اس بچہ پر توجہ دیں اور اس کو کسی کام کے لائق بنادیں تا کہ ہمارے خاندان کا یہ نام روشن کر سکے۔

چنانچہ ان کی اس فرمائش پر اس خادم نے اس کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی اور وہ بھی بالتدریج مانوس وقریب ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم وآگہی سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی اور خادم کی علمی ہدایات کا اتنا پابند بن گیا کہ وہ خاندان حلیمی کا روشن ستارہ بننے کے قابل ہوگیا اور مستقبل میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی کی مسند بخاری پر بیٹھنے کے وہ قابل ہوگیا، لیکن بدقسمتی سے اس کی تقدیر اس پر غالب آگئی اور خادم کی ساری محنت پر اس نے پانی پھیر دیا جس کا تذکرہ انشاءاللہ آگے آئے گا۔

بوستاں کے پڑھانے کا انداز

دیگر کتابوں کے ساتھ پہلے سال میں خادم کے یہاں بوستاں بھی آئی جس کے پڑھانے کا انداز کچھ الگ ہی تھا۔ ترنم کے ساتھ خاص لہجہ میں خادم نے یہ کتاب پڑھانا شروع کیا جو مدرسہ ریاض العلوم میں تدریس کا ایک نیا انداز تھا اس انداز سے بوستاں کبھی نہیں ہوئی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ پانچویں گھنٹی میں چھٹی کے بعد خادم کی درسگاہ کے اردگرد اس لہجہ اور انداز سے سبق کو سننے کے لئے طلباء کا ایک ہجوم جمع ہونے لگا، جس کو دیکھ کر پرانے بہت سے مدرسین کو پریشانی ہونے لگی، جس خاص لہجہ میں ترنم

کے ساتھ بوستاں یہ خادم پڑھاتا تھا اس لہجہ کو کافی حد تک ایک طالب علم نے کیچ کرلیا تھا جس کا نام عمر شمیم تھا، جو چتارہ ضلع اعظم گڑھ کا رہنے والا تھا، اس کے دیگر ساتھیوں نے بھی اس لہجہ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا کامیاب نہیں ہو سکے جتنا کامیاب عمر شمیم ہوا، بوستاں کی جماعت کے طلباء میں ایک طالب علم نسیم نام کا بھی تھا جو دھنی پور ضلع اعظم گڑھ کا رہنے والا تھا لیکن وہ فطری طور پر کمزور ذہن کا تھا جس کی وجہ سے آموختہ سنانے کے دن اکثر کھیت میں جا کر چھپ جایا کرتا تھا۔

۱۹۸۰ء میں مدرسہ ریاض العلوم کا تعلیمی معیار

جب یہ خادم پہلی مرتبہ مدرسہ ریاض العلوم میں حاضر ہوا تو اس کو قائم ہوئے چونکہ ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، یہ ادارہ مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں سے منتقل ہو کر قائم ہوا تھا، اس لئے بہت سے مسائل میں ابھی ابتدائی مراحل میں تھا، لیکن حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی اولوالعزمی اور آپ کی آہ سحر گاہی کا جلوۂ صدر رنگ ارتقائی شکل میں ہر طرف نظر آرہا تھا، اور آپ ہی کی کاوش پیہم اور سعی بلیغ اور جہد مسلسل، تدبر و عالی ظرفی کا یہ ثمرہ تھا کہ ادارہ نے بہت تیزی کے ساتھ بلوغ کے مراحل طے کر لئے اور رنگ برنگ کے گل وہاں کھلنے لگے، لیکن افسوس کہ اس ادارہ کو جیسے مالی کی ضرورت تھی ویسا مالی نہیں مل سکا جس کا نتیجہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

بہر حال ۱۹۸۰ء میں جب یہ خادم حاضر ہوا تو پرائمری اور حفظ کے ساتھ

عربی، فارسی کی تعلیم مشکوۃ شریف تک ہورہی تھی، لیکن عربی اول سے لے کر مشکوۃ شریف تک سارے درجات مسلسل نہیں تھے، بلکہ کچھ درجوں میں طلباء تھے تو کچھ درجے خالی تھے، جتنے درجات موجود تھے ان میں سے تقریباً ہر درجہ کی کوئی نہ کوئی کتاب خادم کے سپرد ہوئی اور انداز درس وتدریس نے پورے مدرسہ پر خادم کی ایک خاص چھاپ قائم کردی، اور طلباء میں ایک خاص انداز کی مرعوبیت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طلباء میں بہت تیزی کے ساتھ محبوبیت ومقبولیت اس خادم کی پیدا ہوگئی۔

مدرسہ ریاض العلوم کے ایک مدرس کا استعجاب

پہلے سال میں خادم کو جو کمرہ ملا تھا وہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی نشست گاہ تھی اور اسی کمرہ کے سامنے دوسرا کمرہ جو تھا دفتر کے دوملازمین کی رہائش گاہ تھی:

(۱) مولانا وکیل احمد صاحب جو تمہا ضلع جونپور کے رہنے والے تھے اور دفتر محاسبی کے ناظم وخزانچی تھے اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے خصوصی معتمد تھے۔ دوسرے صاحب ان کے ساتھ اس کمرہ میں جو رہتے تھے ان کا نام عبد الحی تھا جو لپری ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، اور دفتر میں محرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ایک دو گھنٹی کے فارسی کے مدرس تھے۔

خادم کے وہاں پہونچنے کے چند روز کے بعد ہی جمعہ کا دن آیا شام کے وقت عبدالوحید نامی ایک طالب علم جو سلطانپور کا رہنے والا تھا اور وہاں کے تبلیغ کے اہم ذمہ دار

مولانا عبداللطیف صاحب کا نواسہ تھا، وہ ایک درجن کیلا لے کر آیا اور اس خادم کو یہ کہہ کر دینے لگا کہ حضرت میں کھیتا سرائے گیا تھا، واپسی پر یہ کیلا آپ کے لئے لے کر آیا ہوں، یہ آپ کو ہدیہ ہے۔ راقم نے یہ کہہ کے واپس کر دیا کہ طلباء سے ہدیہ لینے کا مزاج نہیں ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے اس کو لے جاؤ تم ہی کھا لینا، لیکن وہ اتنا مصر ہو گیا کہ مجبوراً اس خادم کو اس کا ہدیہ قبول کرنا پڑا، اس کے جانے کے بعد خادم نے مولانا عبدالحی صاحب کو آواز دی جو میرے کمرے کے سامنے والے کمرے میں موجود تھے جب وہ آئے تو اس خادم نے وہ ہدیہ والا کیلا ان کو بتا کر پیش کیا اس پر وہ حیرت زدہ اور پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ مفتی صاحب مجھ کو یہاں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن آج تک کسی نے مجھ کو ہدیہ نہیں دیا اور آپ کو آئے ہوئے ابھی چند روز ہوئے ہیں کہ آپ کے پاس ہدیہ بھی آنے لگا، ان کے اس استعجاب و حیرت کو دیکھ کر یہ خادم بھی حیران رہ گیا۔

خادم کا سفر اور طلباء کا ہجوم روڈ پر

اس علمی شہرت اور تدریسی مقبولیت کا اثر طلباء میں اتنی تیزی کے ساتھ بڑھا اور طلباء میں ایسی گرویدگی پیدا ہو گئی کہ دوسرے اساتذہ اس کو دیکھ کر حیران و پریشان ہونے لگے۔ چنانچہ دو چار مہینے کے بعد اس خادم کا سفر کئی مرتبہ ہوا، کئی سفر ایسا بھی ہوا کہ شاہ گنج سے رات میں بارہ بجے کی ٹرین تھی اور اس وقت رات میں کوئی سواری میسر نہیں تھی، شاہ گنج آنے کے لئے ٹرک کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب یہ خادم شاہ گنج آ کر ٹرین پکڑنے کے

لئے روڈ پر نکلتا تو پورا مدرسہ خالی ہوجایا کرتا تھا اور تمام طلباء رخصت کرنے کے لئے روڈ پر جمع ہوجاتے تھے، یہ منظر دیکھ کر پرانے اساتذہ حیران وپریشان ہوتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم بھی سفر میں جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی پہونچانے کے لئے روڈ پر نہیں جاتا، لیکن جب مفتی صاحب سفر پر نکلتے ہیں تو پورا مدرسہ خالی ہوجاتا ہے اور تمام طلباء ان کو پہونچانے کے لئے روڈ پر نکل جاتے ہیں، بلکہ وہاں کے صدر مدرس یہ کہا کرتے تھے ؎

شاہ خوباں می روند

گردش ہجوم عاشقاں

بلکہ بیس پچیس طلباء اسی ٹرک کے ذریعہ جس سے یہ خادم روانہ ہوتا شاہ گنج جاتے اور اس خادم کو ٹرین پر بیٹھا کر ٹرین کے چلنے کے بعد وہ کسی ٹرک کے ذریعہ گورینی پہونچتے۔

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ سردی کے موسم میں سفر کرنا پڑا اور سردی کو محسوس کرتے ہوئے بعض طلباء نے اپنے بدن کے اوپر کا کوٹ اتار کر اس خادم کو پہنا دیا کہ ٹھنڈک بہت ہے یہ کوٹ آپ پہن لیں۔ چنانچہ جاوید نامی ایک طالب علم جو ملا ٹولہ شہر جونپور کا رہنے والا تھا اس نے اسی طرح اپنا کوٹ شاہ گنج اسٹیشن پر اتار کر ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے اس خادم کو پہنا دیا اور خود صرف ایک کرتہ میں پوری رات گزار دی۔

درس مشکوۃ اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں آخری درجہ مشکوۃ

شریف کا تھا اور مشکوۃ شریف کا درس حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب خود دیا کرتے تھے اور اکثر یہ درس مغرب بعد یا عشاء کے بعد ہوا کرتا تھا۔

پہلے سال میں حضرت مولانا کی زبان سے کئی بار وہاں کے صدر مدرس کی موجودگی میں یہ سنا کہ مفتی صاحب میں بوڑھا ہوگیا ہوں، سفر بھی بہت رہتا ہے، میں نے کتنی مرتبہ ان سے کہا کہ مشکوۃ آپ لے لیجئے پڑھا دیا کیجئے، لیکن یہ سنتے ہی نہیں ان کو میبذی اور سلم پڑھانے ہی میں مزہ آتا ہے۔

خادم حضرت کی زبان سے یہ سنتا سنتا جب تھک گیا تو ایک دن ہمت کر کے بہت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت ایک سال صبر فرمائیں، آئندہ آپ کو اس کی زحمت نہیں ہوگی، یہ خادم مشکوۃ انشاء اللہ پڑھا دے گا۔ مشکوۃ کی جماعت میں اس سال تقریباً پندرہ سولہ طلباء تھے جن میں عبدالماجد نامی بھی ایک طالب علم تھا جو جمد ہاں ضلع جونپور کا رہنے والا تھا اور بعد میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا وہ آخری داماد بھی بنا اور ان کے والد ریاض احمد صاحب مدرسہ کے دفتر نظامت میں ایک زمانہ تک محرر کا بھی کام کرتے رہے۔

مجلس ذکر اور یہ خادم

یہ خادم چونکہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے یہاں ایک چلہ لگا کر مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور حاضر ہوا تھا اور حضرت شیخ کے یہاں چونکہ

پابندی کے ساتھ صبح کے ساتھ شام کی بھی مجلس ہوتی تھی اور یہ خادم اس میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتا تھا اور جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو حضرت شیخ الحدیث صاحب نے اس کی تاکید فرمائی تھی کہ پیارے صبح کے ساتھ شام کے ذکر کی بھی پابندی کرنا، اس لئے مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچنے کے بعد پابندی کے ساتھ صبح کے ساتھ شام کو بھی مغرب کے بعد ذکر جہری کیا کرتا تھا، جس کو سننے کے لئے طلباء کی ایک بھیڑ کمرے کے گرد و پیش جمع ہو جایا کرتی تھی، چونکہ اس مدرسہ کے ساتھ طلباء و اساتذہ کے لئے بھی ذکر کا یہ انداز نیا تھا جس کو سننے کا ان کو کبھی موقعہ نہیں ملا تھا اس لئے طلباء بہت دلچسپی کے ساتھ کمرے کے باہر اس کو سن کر محظوظ ہوتے تھے، چونکہ اس وقت تک حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے یہاں بھی ذکر کی مجلس نہیں ہوتی تھی جس کی شروعات اس خادم ہی کے ذریعہ ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے یہاں ذکر کی مجلس کا قیام

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مدرسہ ریاض العلوم پہونچ کر یہ خادم دوازدہ تسبیح کا ذکر جہری صبح شام اپنے کمرے میں کیا کرتا تھا، چونکہ حضرت مولانا کے یہاں ذکر کی مجلس نہیں ہوا کرتی تھی، لیکن اسی درمیان حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کا سفر حجاز طے پا گیا اور اس وقت حضرت شیخ کا معمول یہ تھا کہ حجاز مقدس روانگی سے پہلے ہفتہ عشرہ مرکز نظام الدین دہلی میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی

سفر کے ارادہ سے آپ دہلی مرکز نظام الدین میں قیام پذیر تھے، جس کی اطلاع حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب کو ہوگئی، حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب الوداعی ملاقات کے لئے دہلی تشریف لے گئے، جب دہلی کے سفر کی اطلاع اس خادم کو ملی تو حضرت شیخ کی ملاقات کے لئے سفر کی اس خادم نے بھی اجازت مانگی، حضرت نے برضاء ورغبت اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ یہ خادم بھی دہلی پہونچ گیا اور مرکز نظام الدین میں قیام کے دوران بھائی طلحہ سے ایک دن ملاقات ہوئی، بھائی طلحہ نے خیر خیریت کے بعد ذکر کے بارے میں مجھ سے دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ جی! پابندی سے ذکر صبح وشام کرتا ہوں، اس کے بعد بھائی طلحہ نے پوچھا کہ ذکر کہاں کرتے ہو، میں نے عرض کیا اپنے کمرے میں اس کے جواب میں انہوں نے کہا، کیا حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے یہاں ذکر کی مجلس نہیں ہوتی، میں نے عرض کیا کہ ''نہیں'' اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں گئے جس کمرے میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا قیام تھا، وہاں پہونچ کر حضرت مولانا سے بھائی طلحہ نے کہا کہ حضرت ان کی زبانی یہ سن کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ آپ کے یہاں ذکر کی مجلس نہیں ہوتی، حضرت مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا ''ہاں''، اب تک تو نہیں ہوتی تھی، لیکن اب انشاء اللہ شروع ہوجائے گی۔ چنانچہ اسی وقت حضرت مولانا نے اس خادم اور اپنے برخوردار مولانا عبد العظیم صاحب ندوی کو مخاطب کرکے فرمایا کہ سفر سے واپسی کے بعد مجھے مدرسہ پہونچ کر یاددلانا، انشاء اللہ اس کی ترتیب بنادی جائے گی۔

چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد مدرسہ پہونچ کر حضرت مولانا سے اس خادم نے

ملاقات کی اور حضرت کو بھائی طلحہ کے سامنے کیا ہوا وعدہ یاد دلایا، حضرت نے بہت بشاشت کے ساتھ ذکر کی مجلس کا نظم وانتظام اس خادم کے سپرد فرمایا، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے یہاں ذکر کی مجلس کا جو نظام تھا اس کو نافذ کرنے کا حکم فرمایا۔

چنانچہ ذکر کی ترتیب وتلقین افراد کی تشکیل اور اس سے متعلق ضروری کام اس خادم کے سپرد ہوئے اور ذکر کے بعد چائے کا نظم مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا کے اس کمرے میں جس میں آپ کا قیام تھا مجلس ذکر کی جگہ متعین ہوئی اور وہیں سے مجلس کا آغاز عمل میں آیا کچھ دنوں کے بعد جب ذاکرین کی تعداد بڑھ گئی اور کمرہ تنگ پڑنے لگا تو نئے مہمان خانے کے بڑے ہال میں ذکر کی مجلس کو منتقل کر دیا گیا جو اخیر تک باقی رہا، لیکن ذکر کی مجلس کے بعد چائے کے نظم کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے کچھ دنوں کے بعد موقوف کر دیا گیا۔

اس طرح حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے یہاں ذکر کی مجلس کا آغاز ہوگیا۔

ذکر کے قیام کے بعد مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کا ایک ملفوظ

جب ذکر کی مجلس قائم ہوگئی اور دھیرے دھیرے افراد بڑھنے لگے اور مجلس ذکر میں رونق آنے لگی تو ہمارے رفیق محترم مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی نے ایک جملہ کہنا شروع کیا کہ اس بند دروازہ کا تالا اب ہمارے مفتی صاحب ہی کھلوائیں گے،

یہ جملہ تسلسل کے ساتھ کئی سال تک کہتے رہے، ابتداء میں جب انہوں نے یہ جملہ کہنا شروع کیا تو بعض قریبی دوستوں نے ان سے اس کا مطلب پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ والد صاحب نے کئی سال ہوئے کچھ حضرات کو اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ایسا موقوف ہوا کہ لگتا ہے کہ جیسے اس پر تالا ڈال دیا گیا ہو، لیکن اس ذکر کی مجلس کے قیام کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اب یہ تالا کھلے گا اور وہ تالا ہمارے مفتی صاحب ہی کھلوائیں گے، چونکہ ہمارے مفتی صاحب کے ذکر میں جو سوز وگداز ہے اور ان کا انداز ذکر جس انداز سے قلب خفتہ کو بیدار کرتا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ مفتی صاحب ضرور اس تالے کو کھلوائیں گے۔

چنانچہ الحمدللہ رفیق محترم مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی اور چند سالوں کے بعد ۱۹۹۰ء میں یہ بند دروازے کا تالا کھلا اور درجنوں حضرات جو حضرت مولانا سے وابستہ تھے اجازت وخلافت سے فیض یاب ہوئے جن کے اسماء گرامی انشاءاللہ آئندہ ذکر کئے جائیں گے۔

اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کا واقعہ

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور پہونچا تو چند ماہ تک مدرسہ کے مطبخ سے فیض یاب ہوتا رہا، لیکن ہر مدرسہ کے مطبخ کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے جس

نظام کے بارے میں موشگافی نامناسب ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر مدرسہ کی کچھ ذاتی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں اور اجتماعیت کو بہرحال انفرادیت پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ خادم اپنی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے بجائے اس کے کہ مدرسہ کے ذمہ داروں سے نظام مطبخ کے سلسلہ میں کچھ گوش گزار کرتا عافیت اس میں محسوس کیا کہ یہ خادم اپنے کو اس نظام سے الگ کر کے اپنا ذاتی نظام قائم کر لے۔ چنانچہ اس کے لوازمات ومناسبات کا چندروز میں نظم کرنے کے بعد خادم نے مطبخ سے کھانا بند کروادیا اور اپنی سبزی و اپنا کھانا بنانا خود شروع کر دیا۔ لیکن عزیزم مظفر تھانوی جو سہارنپور سے آتے ہوئے سب سے پہلے شاہ گنج میں ملے تھے انہوں نے بصد اصرار سبزی بنانے کی خدمت خادم سے واپس لے کر اپنے ذمہ کر لیا اور جب تک وہ رہے اس مشکل ترین فریضہ کو پوری خوشی اور انبساط کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اس سال عزیز موصوف اس خادم کے قطبی کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا ظہور احمد صاحب جو خانقاہ تھانہ بھون کے نگراں و جانشین تھے ان کے برخوردار تھے، طبیعت میں بے حد سلامتی اور شائستگی کے ساتھ ادب وتادب کے بے حد خوگر تھے، نشست و برخاست سے لگتا تھا کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد سبزی بنانے کی ذمہ داری عزیزم مولوی کوثر سلمہ نے لے لی جو کمراواں ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور جناب ابوالکلام صاحب کے برخوردار تھے اور جناب صغیر احمد صاحب کے پوتے تھے، جو حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب کے خواص میں سے تھے اور بعد میں مفتی عبداللہ صاحب پھولپوری کے بہنوئی

بھی ہوئے جن کا نکاح اس خادم ہی نے پڑھایا تھا،عزیز موصوف طبعاً بہت ہی سنجیدہ و مستقل مزاج تھے، بہت استقلال و پابندی کے ساتھ روزانہ بر وقت سبزی بنانے کا اہتمام کرتے رہے اور اپنی عدم موجودگی میں اپنا نائب خود بنا کر غیر حاضر ہوتے تھے۔ اور حاضری کے بعد فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے تھے۔موصوف نے قطبی،جلالین،مشکوۃ شریف،ترمذی شریف وغیرہ کتابیں اس خادم سے پڑھیں۔

عزیز موصوف کا یہ جملہ شاید یہ خادم مرتے دم تک نہ بھلا سکے کہ باوجود اصرار کے آلو کی ایک قاش یا سبزی کا کوئی حصہ کبھی نہیں لے جاتے تھے،جب خادم نے بہت اصرار کیا اور کبھی سبزی لے جانے کا حکم دیا تو یہ کہہ کر سبزی واپس کر دی کہ مفتی صاحب میری خدمت کے اخلاص کو آپ ضائع نہ کریں میں جس خلوص کے ساتھ خدمت کر رہا ہوں اس کو باقی رہنے دیں،اگر میں کوئی جزء لے گیا تو میرا خلوص ضائع ہو جائے گا۔

عزیز موصوف کے اس جملہ سے یہ خادم حیران رہ گیا جبکہ عموماً طلباء کے ذہنوں یہ جزئیہ ہوتا ہے کہ ''**یجوز للطلاب مالا یجوز لغیرہ**'' اور اس جزئیہ پر عمل کرتے ہوئے اساتذہ کا مال طلباء عموماً مال غنیمت و مال مباح سمجھتے ہیں،لیکن یہاں اصرار کے باوجود ایسا جواب ملا جس کو یہ خادم سوچ بھی نہیں سکتا تھا جب تک عزیز موصوف مدرسہ میں زیر تعلیم رہے بلا ناغہ پابندی کے ساتھ یہ بھاری خدمت انجام دیتے رہے۔

فجزاہ اللہ تبارک و تعالی فی الدارین احسن الجزاء وبارک اللہ فی عمرہ و اولادہ و رزقہ و ایمانہ و عملہ (آمین)۔

سبزی کے ساتھ دوسری اہم خدمت روٹی کی تھی اور یہ مسئلہ تھوڑا ٹیڑھا اور اہم بھی تھا، لیکن اس خدمت کے لئے عزیزم مفتی رشید احمد معروفی نے اپنے کو خود ہی پیش کیا اور جب تک وہ رہے پوری پابندی اور بشاشت کے ساتھ تین چار روٹیاں بنا کر لاتے رہے اور راقم کی کئی سال تک یہی خوراک رہی آلو کی سبزی کبھی کبھار اس میں ہری سبزی ڈال لیا اور صرف روٹی کبھی کبھار چاول بنا لیا۔ عزیز موصوف مئو کے معروف صنعتی و علمی قصبہ پورہ معروف کے محلّہ کرتھی جعفر پور کے رہنے والے تھے اور اس خادم سے قطبی، جلالین، مشکوۃ شریف اور ترمذی شریف کے علاوہ افتاء کی بھی کتابیں پڑھی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد حسین نے روٹی پکانے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی اور ایک طویل عرصہ تک بحسن و خوبی وہ بھی اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اللہ پاک ان تمام عزیزوں کو دونوں جہاں میں ہر طرح کی برکتوں سے مالا مال فرمائے اور عزت و راحت اور سکون کے ساتھ علمی ترقی سے نوازے۔ آمین

تدریس کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری

تقرری کے وقت ہی مدرسہ کے ذمہ داروں نے خادم کو یہ بتلا دیا تھا کہ تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کا کام بھی آپ کے ذمہ ہوگا، چنانچہ یہ خادم دونوں کاموں کے لئے اپنے کو تیار کر کے وہاں حاضر ہوا، پہونچنے کے بعد تدریسی کام میں

ابتداء مصروف ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہاں باضابطہ دارالافتاء کا قیام عمل میں آچکا ہے اور فتوی نویسی کے کام کے لیے باضابطہ مدرسہ نے ایک مفتی کی تقرری کرلی ہے تو بالتدریج تحریری سوال ناموں کا سلسلہ شروع ہوا۔

چونکہ یہ خادم حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند اور مفتی اعظم ہند کی خدمت میں رہ کر دسیوں ہزار فتوے لکھ چکا تھا اور ان کی خدمت میں رہتے ہوئے فتوی نویسی کے نوک و پلک سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اس لئے آنے والے سوالات کے جوابات کے لکھنے میں کبھی بھی کوئی تردد یا تذبذب یا تأمل نہیں ہوا بلکہ پوری تحقیق اور اطمینان کے ساتھ مکمل و مدلل مرتب و مفصل حسب ضرورت صاف ستھرے اور منقح انداز میں جواب لکھتا رہا جس کا بین ثبوت خادم کی ''حبیب الفتاوی'' کی آٹھ جلدیں ہیں جو کئی بار شائع ہوکرا کابرین فتوی، زعماء ملت، ام المدارس کے مفتیان کرام کی تصدیق وتصویب بلکہ تائید وتحسین کے ساتھ شائع ہوچکی ہیں۔

یہ امر آخر ہے کہ خادم کو معہود وقت سے کہیں زیادہ وقت ان امور کی انجام دہی کے لئے دینا پڑا، لیکن خادم نے کبھی اس کو بار محسوس نہیں کیا بلکہ اپنا کام سمجھ کر برضاء ورغبت امور مفوضہ سے زائد کام جب تک تھا انجام دیتا رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں اس کا چرچہ تھا کہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں سارے اساتذہ بمشکل تمام چھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتے ہیں لیکن وہاں کے مدرسین میں مفتی حبیب اللہ قاسمی ایک ایسا شخص ہے جو اٹھارہ گھنٹہ مدرسہ کا کام کرتا ہے، اس کے باوجود وہ تھکتا نہیں۔

جس کا تذکرہ دارالعلوم کے شیخ ثانی حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی نے بلا واسطہ خود خادم سے کیا، اس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آئندہ کے صفحات میں آپ پڑھیں گے۔

چونکہ دارالافتاء کا قیام اس خادم ہی کے ذریعہ عمل میں آیا، اس لئے اس کے لوازمات ومناسبات کا نظم وانتظام بھی خادم نے اپنے دیرینہ تجربات کی روشنی میں اور دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے نظام کے تناظر میں مرتب اور قائم کیا۔ یعنی باضابطہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے درخواست کر کے نقل فتاویٰ کے لئے ایک رجسٹر تیار کروایا بعد میں اس کی طباعت کروائی گئی، چنانچہ وہی رجسٹر نقل فتاوی کے لئے آج بھی رائج ہے اور حضرت مولانا سے درخواست کر کے نقل فتاوی کے لئے ایک محرر طے کروایا اور اس کی جگہ متعین کروائی، چنانچہ حضرت مولانا نے مولانا مقبول احمد صاحب فیض آبادی جو کتب خانہ کے نگراں وذمہ دار تھے ان کے ذمہ نقل فتاوی کا کام کیا اور نقل فتاوی کی جگہ کتب خانہ کو حضرت مولانا نے طے فرمایا۔

اسی طرح دارالافتاء کی ایک مہر بنوائی جو نقل فتاوی کے بعد لگا کر مستفتی کے سپرد جواب کر دیا جاتا تھا۔

فتویٰ نویسی میں بڑی رکاوٹ

چونکہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں نہ پہلے سے دارالافتاء تھا نہ ہی کوئی

باضابطہ مفتی اور نہ ہی فتوی نویسی کا کوئی نظام تھا، اس لئے مدرسہ کے کتب خانہ میں فتوئ نویسی سے متعلق کتابوں کی کمی تھی جس کمی کو دھیرے دھیرے پوری کرلی گئی، لیکن چند کتابیں موجود تھیں، ان کتابوں سے مراجعت میں بھی بہت ساری دشواریاں تھیں، بار باران سے مراجعت کے لئے وقت بے وقت کتب خانہ بھی جانا مشکل تھا، چونکہ کتب خانہ کے کھلنے اور بند ہونے کا وقت متعین تھا اور بغیر کتابوں کی مراجعت کے فتوی لکھنا اپنے کمرہ میں بیٹھ کر ہر وقت ممکن نہیں تھا اور اگر کتب خانہ سے مراجعت کے لئے کوئی کتاب لے کر یہ خادم اپنے کمرے میں آجاتا تو چوبیس گھنٹے کے بعد وہ کتاب اٹھاکر نگراں کتب خانہ، کتب خانہ میں جمع کردیتے جس کی وجہ سے فتوی نویسی میں ابتداء کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑااوران دقتوں سے وہ افراد آشنا نہیں تھے جو وہاں پہلے سے کام کررہے تھے، بالخصوص کتب خانہ کے نگراں، اور ہر چھوٹی بڑی بات حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

چونکہ اس کے حشر سے یہ خادم ماضی کے تجربات کی روشنی میں واقف تھا جس کے حاصل کرنے کا موقع اس خادم کو بہت سے بزرگوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے مل چکا تھا۔ بہر حال اس خادم نے اپنی اس مجبوری اور دقت کو اس طرح حل کیا کہ اپنی تنخواہ سے جس کی مقدار اگرچہ کم تھی اور ضروریات وتقاضے بہت زیادہ تھے، لیکن ان کو دباکر فتوی نویسی سے متعلق اہم اور ضروری کتابوں کی خریداری شروع کردی۔ چنانچہ چند سال کے عرصہ میں فتوی نویسی سے متعلق کتابوں کے ساتھ درسی کتابوں کی شروحات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا جو اس وقت کے وہاں موجود مدرسین میں

سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

پھر اپنے ذوق کے مطابق اپنے رہائشی کمرے میں دیوار میں الماری بنوائی اور ان کتابوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ سجا دیا جس سے اس خادم کے لئے ہمہ وقت ان کتابوں سے انتفاع آسان تر ہوگیا اور یہ خادم نگراں کتب خانہ کے سامنے دست گدائی دراز کرنے سے اوران کی ترش روئی جھیلنے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔

لیکن نگراں کتب خانہ جب جب اس خادم کے کمرے میں آئے اور کتابوں کے ذخیرے کو دیکھتے اوراس کے حسن ترتیب کو دیکھتے پھر وہ اپنے عدم احتیاجگی کو دیکھتے ہوئے انگشت بدنداں ہوجاتے اور قلق وصدمہ کے ساتھ ایک آہ بھر کر واپس ہوجاتے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس خادم کی غیبی مدد فرمائی اور کچھ ہی عرصہ میں کتابوں کا اتنا لمبا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ جب ریاض العلوم گورینی کو چھوڑنے کی نوبت آئی تو ان کتابوں کے ساتھ ذاتی ضروریات کے سامان کی منتقلی کے لئے ٹرک کا سہارا لینا پڑا، چونکہ چھوٹی موٹی گاڑی میں اتنی کتابیں منتقل نہیں ہوسکتی تھیں۔

دارالافتاء کے قیام سے پہلے مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مسئلہ بتانے کا معمول

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب چونکہ صاحب نسبت بزرگوں میں سے تھے، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی وحضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے

اجازت یافتہ اور خلفاء میں سے تھے اور اپنے بزرگوں کا معمول یہ دیکھا کہ جب کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آتا تو خود مسئلہ نہ بتلا کر کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتے۔

چنانچہ مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں جس کو مکتب سے لے کر مشکوۃ شریف تک حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب ہی نے اپنی جہد مسلسل اور کاوش پیہم اور آہ سحر گاہی کے ذریعہ پہونچایا تھا جو ایک چمنستان علم تھا وہاں کے صدر مدرس مولانا عبدالستار صاحب تھے جو بستی ضلع کے رہنے والے تھے، وہاں کے قیام کے زمانہ ہی سے حضرت مولانا کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آتا تو اپنے بزرگوں کے معمول کے مطابق وہ مدرسہ کے صدر مدرس مولانا عبدالستار صاحب کے سپرد فرما دیتے۔ اس طرح گویا کہ صدر مدرس جو ہوتا تھا وہ عوام کو چھوٹے موٹے مسائل زبانی بتا دیا کرتا تھا۔

لیکن بتقدیر الٰہی کافی عرصہ کے بعد ایک دن وہ بھی آیا کہ حضرت مولانا کو مانی کلاں اور مدرسہ ضیاء العلوم سے ہجرت کرنی پڑی اور احباب و اکابرین وقت کے مشورہ سے جونپور کھیتا سرائے روڈ سے متصل ایک لمبی چوڑی زمین جو اوسر ہونے کی وجہ سے نا قابل کاشت تھی اور گورینی چوکیہ والوں کی وہ ملکیت تھی اور ایک چھوٹا سا مکتب وہاں چل رہا تھا، اسی جگہ کا انتخاب عمل میں آیا اور ریاض العلوم کے نام سے آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور بچی ہوئی زندگی کا قیمتی سرمایہ اس کی تعلیمی وتعمیری ترقی اور اس کے استحکام کے لئے لگا دیا۔

چنانچہ جب آپ نے ہجرت کی تو آپ کے ساتھ کام کرنے والا وہ عملہ جو مانی کلاں مدرسہ ضیاء العلوم میں مصروف عمل تھا وہ بھی ہجرت کر کے آپ کے ساتھ یہاں

آ گیا، البتہ وہاں کے سابق صدر مدرس مولانا عبدالستار صاحب بستوی یہاں کے صدر مدرس نہیں بنے بلکہ یہاں کی صدارت کے منصب پر مولانا محمد حنیف صاحب فائز ہوئے جو گورینی کے قریب لپری کے رہنے والے تھے اور ایک طویل زمانہ تک حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں رہ کر فیض یاب ہوئے تھے۔ وہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے سمدھی بھی تھے آپ کے ایک برخوردار کی نسبت ان کی بچی سے طے پائی تھی جو بعد میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے نائب ناظم بھی بنائے گئے۔

مدرسہ ریاض العلوم کے وجود میں آنے کے بعد اور صدر مدرس کے عہدہ پر مولانا محمد حنیف صاحب کے فائز ہونے کے بعد مسئلہ و مسائل کی دریافتگی کے سلسلہ میں وہی دستور باقی رہا جو مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں میں جاری تھا۔ یعنی مدرسہ ریاض العلوم کے صدر مدرس کے پاس حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مسئلہ پوچھنے والوں کو بھیج دیا کرتے تھے، لیکن باضابطہ کوئی مستند مفتی یا دارالافتاء نہیں تھا، دارالافتاء کا باضابطہ قیام اس خادم کے پہونچنے کے بعد ہی عمل میں آیا۔

فتوی نویسی کے سلسلہ میں اس خادم کو حضرت مولانا کی چند وصیت

جب اس خادم نے تحریری فتوی نویسی کا کام شروع کیا تو از خود اس کا التزام کیا کہ جب تک حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی نگاہ سے میرا فتوی نہ گزر جائے اور آپ تائیدی دستخط نہ فرمادیں اس وقت تک یہ خادم اپنا لکھا ہوا فتوی مستفتی کے سپرد

نہیں کرے گا۔ چنانچہ جب تک یہ خادم ریاض العلوم کی خدمت سے وابستہ رہا اور جتنے فتاوے خادم نے لکھے حضرت کی موجودگی میں کوئی بھی فتوی بغیر آپ کو دکھائے اور آپ کی تائیدی دستخط کے بغیر مستفتی کے حوالے نہیں کیا۔

لیکن شروع ہی میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے چند باتیں اس خادم سے تاکیداً وحکماً فرمائیں۔

(۱) مفتی صاحب ہر فتوی پر اپنے نام کے ساتھ قاسمی ضرور لکھئے گا، چونکہ اس علاقہ کے بعض قاسمی علماء مجھ کو بدنام کرتے ہیں کہ عبدالحلیم چونکہ خود مظاہری ہے اس لئے اپنے مدرسہ میں کسی قاسمی کو نہیں رکھتا ہے اور اگر غلطی سے کوئی قاسمی آجاتا ہے تو اس کو وہ ٹکنے نہیں دیتا ہے، بلکہ بھگا دیتا ہے تاکہ وہ لوگ جان سکیں کہ ہمارے مفتی صاحب جو یہاں آئے ہیں وہ مظاہری نہیں بلکہ قاسمی ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا کے اس حکم اور تاکید کے بعد یہ راقم تحریر کردہ اپنے ہر فتوے پر نام کے ساتھ قاسمی لکھنے لگا اور حضرت مولانا اس کو دیکھ کر اظہار مسرت فرماتے تھے۔ اس طرح اس خادم کے نام کے ساتھ قاسمی اور مفتی نام کا جز بن گیا اور لوگ مفتی حبیب اللہ قاسمی کے ساتھ جاننے لگے اور اس طرح قاسمی لکھنے کا گویا کہ معمول بن گیا جو تادم تحریر باقی ہے۔

دوسری بات حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے یہ فرمائی کہ مفتی صاحب میں رہوں یا نہ رہوں بہرصورت اپنے لکھے ہوئے فتاوی پر یہاں کے صدر مدرس مولانا محمد حنیف صاحب سے بھی ضرور دستخط کروالیا کریں۔ اس میں آپ کے لئے

عافیت ہے، حضرت مولانا نے اس حکم کی کوئی علت نہیں بتلائی لیکن تعمیل حکم میں اپنے لکھے ہوئے فتاوی پر صدر مدرس کے دستخط کا معمول بنالیا، یعنی جب بھی کوئی فتوی یہ خادم لکھتا تو صدر مدرس سے تائیدی دستخط کرواتا، اس کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتا اور سوال وجواب سنا کر تائیدی دستخط حاصل کرتا۔

حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اس دوسرے حکم کی علت اگرچہ نہیں بتلائی لیکن راقم کی سمجھ میں کچھ عرصہ کے بعد از خود وہ علت آ گئی جس کو یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اس معمول کے ساتھ خادم نے از خود صدر مدرس صاحب کو صدر صاحب کے لقب سے ملقب کرتے ہوئے صدر صاحب کہنا شروع کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس خادم کا بولا ہوا لفظ طلباء اساتذہ میں اس قدر رائج ہوا کہ وہ بھی صدر صاحب کہنے لگے۔ اور بعد میں صدر صاحب کے کچھ خواص اور حواریین نے ان کو صدر مفتی کہنا شروع کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد جب کچھ لوگوں کی رقابت اس خادم سے بڑھی تو صدر مفتی کے شروع سے صدر کا لفظ نکال کر صرف مفتی صاحب ان کو کہنا شروع کر دیا۔

جبکہ پورے مدرسہ میں طلباء اور اساتذہ کی زبان پر شروع سے جب سے یہ خادم وہاں پہونچا صرف مفتی کے لقب سے ملقب یہ خادم ہی تھا۔

صدر مدرس کو لوگوں نے اور ان کے کچھ حواریین نے اگرچہ مفتی کہنا شروع کر دیا لیکن بار بار وہ اس خادم سے یہ کہتے تھے کہ مفتی صاحب علامہ شامی نے رسم المفتی میں لکھا ہے "**لابد ان یتلمذ عند استاذ ماھر**" اور میں نے تو کسی ماہر

استاذ کا تلمذ حاصل نہیں کیا ہے، اس کے جواب میں یہ خادم عرض کرتا کہ یہ چیز تو آپ کے لئے خود سوچنے کی ہے کہ آپ لوگوں سے اپنے کو مفتی کیسے کہلواتے ہیں؟ اس کے جواب میں وہ خاموش ہوجاتے۔

خادم کے بعض فتاوے اور صدر مدرس کا اصرار

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے تاکیدی حکم پر صدر مدرس سے دستخط کا معمول تو اس خادم نے بنالیا لیکن بعض مرتبہ بعض اہم دشواریوں سے بھی گزرنا پڑا، بعض مسائل میں خادم کا ان کی رائے سے اختلاف بھی ہوا، جس کی تطبیق میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، چونکہ اختلاف کی صورت میں وہ زبردستی اس کا حکم دیتے کہ میں جو کہہ رہا ہوں اس کو آپ اپنے قلم سے لکھیے، خادم یہ کہتا کہ آپ اپنی رائے اپنے قلم سے لکھیں، لیکن وہ ماننے کو تیار نہ ہوتے۔

اسی طرح بعض کتابوں کے حوالے لکھنے پر اصرار کرتے جبکہ اس کا حوالہ لکھنا فتوی میں خادم کے نزدیک مناسب نہیں ہوتا، مثلاً ایک فتوے میں انہوں نے اصرار کرکے علامہ شوکانی کی ایک عبارت جو نیل الاوطار میں تھی وہ لکھوادیا جس کو یہ خادم لکھنا نہیں چاہ رہا تھا، لیکن ان کے اصرار پر لکھنا پڑا۔ اتفاق سے وہ فتوی حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے ہاتھ میں پہونچ گیا جب اس خادم کی ملاقات حضرت مفتی صاحب سے ہوئی تو خیر خیریت کے بعد حضرت نے شروع ہی میں پوچھ لیا اور سخت لہجہ میں پوچھا

کہ مفتی صاحب نیل الاوطار کب سے فتوی کی کتاب ہوگئی ہے۔اور علامہ شوکانی کب سے فقیہ ہوگئے ہیں کہ آپ اپنے فتوے میں نیل الاوطار کا حوالہ دینے لگے ہیں۔خادم نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت میں نے یہ عبارت نہیں لکھی مدرسہ ریاض العلوم کے صدر مدرس نے مجبور کر کے مجھ سے لکھوایا۔اس پر حضرت نے فرمایا: کسی کے مجبور کرنے پر فتوے پر آپ رامائن کا حوالہ لکھنا شروع کر دیں گے۔

اسی طرح بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کے مصارف کے سلسلہ میں بھی خادم اور صدر مدرس کی رائے میں اختلاف تھا،صدر مدرس کی رائے وہ تھی جس کے قائل مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری تھے،یعنی رفاہی کاموں میں بھی سودی رقم کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔لیکن خادم کی رائے وہ تھی جس کے قائل حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی اور دیگر کبار مفتیان کرام کی تھی،یعنی سودی رقم کو رفاہی کاموں میں استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

اس مسئلہ میں غور وفکر کے بعد راقم نے ایک درمیان کی راہ نکالی اور جواب لکھنے کا انداز بدلا اور اس انداز کے سوالات کا جواب یہ لکھنے لگا کہ سودی رقم کے تین مصارف ہیں:

(۱) غیر واجبی ٹیکس میں ادا کر دینا چاہئے۔

(۲) بلا نیت ثواب فقراء ومساکین میں خرچ کر دیا جائے۔

(۳) رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے۔

لیکن اول کے دو مصارف متفق علیہ اور تیسرا مصرف مختلف فیہ ہے اور متفق

علیہ پر عمل کرنا اولیٰ ہے، مختلف فیہ پر عمل کرنے سے۔

اس جواب کے بعد ہم دونوں کی رائے کے اختلاف میں تطبیق کی شکل پیدا ہوگئی اور اس جواب پر انہوں نے دستخط کرنا شروع کر دیا۔

صدر مدرس صاحب کی آخری حکمت عملی

جب مسائل کے اختلاف میں شدت پیدا ہوئی تو صدر مدرس صاحب نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت بکری کے دودھ کی چائے ظہر کے بعد تھرمس میں بھر کر بھیجنے کا معمول بنایا، کیونکہ صدر مدرس صاحب نے بہت ساری بکریاں مرغیاں کبوتر بھی پال رکھے تھے جس کی وجہ سے مدرسہ کا بڑا گوشہ گندہ بھی رہتا تھا اور تدریس سے زیادہ ان کی خدمت کا اہتمام بھی وہ کرتے تھے اور مدرسہ کے مطبخ کی بہت سی چیزیں ضرورت سے زائد ہونے کے نام پر بکریوں کو استعمال بھی کراتے تھے جس پر اس خادم نے کھل کر نکیر کی تو موصوف نے طلباء کی موجودگی میں اس کے جواز کی دلیل پیش کی کہ یہ نبیوں کی سنت ہے اور تمام انبیاء نے بکری چرائی ہے، جب طلباء نے خادم کو ان کی یہ دلیل بتلائی تو اس خادم نے انہیں طلباء سے یہ جواب کہلا بھیجا کہ ان سے کہہ دینا کہ بکری چرانا انبیاء کی سنت ضرور ہے اور ہر نبی نے بکری ضرور چرائی ہے لیکن چالیس سال سے پہلے، اور چالیس سال کے بعد کار نبوت میں لگ گئے۔ ان کی یہ دلیل غلط ہے اس لئے کہ ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہے، اس لئے ان سے کہیے کہ بکری چرانا بند کر دیں، طلباء نے

یہ جواب ان سے نقل کیا تو یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔

جس طرح اعظم گڑھ کے ایک عالم جس گاڑی میں بیٹھتے ڈرائیور کو کہتے سو کے اوپر چلواور بہت تیز گاڑی چلواتے تھےاور یہ کہتے تھے کہ تیز چلنا سنت ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کا یہ ملفوظ خادم سے نقل کیا تو خادم نے عرض کیا کہ ان سے جا کر کہہ دو کہ تیز چلنا سنت ضرور ہے لیکن پیدل، گاڑی سے تیز چلنا سنت نہیں ہے، یہ ان کا استدلال غلط ہے،کل ہو کر معلوم ہوا کہ رات میں ایک جگہ سے واپس آ رہے تھے معمول کے مطابق گاڑی سو کے اوپر چل رہی تھی، اچانک ایک سائیکل سوار گاڑی کے سامنے آ گیا اس کو ٹکر لگی وہ اسی جگہ مر گیا ایکسیڈنٹ کے بعد گاڑی کا نمبر پلیٹ موقعہ حادثہ پر ٹوٹ کر گر پڑی، وہ پلیٹ پولیس کے ہاتھ لگ گئی، پولیس نے قتل کا مقدمہ ان پر درج کر دیا، اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے بعد ان کی جان بچ پائی۔

اس طرح کا غلط استدلال بعض پڑھے لکھے لوگ بھی کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال بکری کے دودھ کی چائے بہت دنوں تک صدر صاحب بھیجتے رہے، بہت اصرار اور مشکل کے بعد صدر صاحب راضی ہوئے اور تھرمس کا آنا بند ہوا، لیکن ذہنی وفکری دوری میں بالتدریج اضافہ ہوتا گیا جو اخیر تک ختم نہیں ہو سکا۔

تذکرہ مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی

یہ خادم جب پہلی مرتبہ تدریسی خدمت انجام دینے کے لئے مدرسہ ریاض

العلوم گورینی جونپور پہونچا تو وہاں جوحضرات مدرسین وملازمین موجود تھے ان میں سب سے زیادہ قلبی لگاؤ اور طبعی انس مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی سے ہوا اور بالتدریج یہ لگاؤ بڑھتا گیا اور اس انس ولگاؤ کے چند اسباب تھے۔

(۱) چونکہ ندوی صاحب حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے لائق وفائق اور معتمد خاص سفر وحضر کے خادم خاص، مزاج شناس، ملنسار ہر ایک کے قدرداں، عالی ظرف، وسیع القلب، مہمان نواز، باصلاحیت، خوردنواز، صاحبزادہ تھے۔

چونکہ یہ خادم اس ماحول سے گزر کر اور تربیت پا کر یہاں آیا تھا جہاں اپنے بڑوں کے ساتھ بڑوں سے نسبت رکھنے والوں کی بھی عزت کی جاتی تھی اور ان کو احترام اور وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے ندوی صاحب کی طرف قلبی جھکاؤ کے ساتھ حضرت کی نسبت سے ان سے وابستگی اور محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور یہ لگاؤ اتنا بڑھا کہ ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ مدرسہ کے بعض ناعاقبت اندیش ذمہ داروں نے دفتر میں بلا کر بہت تلخ لہجہ میں خادم سے یہ کہتے ہوئے اپنی بھڑاس نکالی کہ مفتی صاحب آپ اور ندوی صاحب ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں، اگر اوپر آپ ہیں تو نیچے ندوی صاحب، اور اگر اوپر ندوی صاحب ہیں تو نیچے آپ ہیں، لیکن خادم نے اس تلخ کلامی کو بہت ہی صبر وتحمل کے ساتھ ضبط کیا اور اپنا کام کرتا رہا۔

(۲) حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی نسبت کے ساتھ ندوی صاحب سے انس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خادم کے مدرسہ ریاض العلوم آنے سے پہلے دارالعلوم دیوبند میں افتاء کے سال دومرتبہ حضرت مولانا کی رفاقت میں شوریٰ کے موقعہ پر آمد کے موقع

سے تفصیلی ملاقات ہو چکی تھی اور فی الجملہ ان سے ایک گونہ لگاؤ بھی ہو چکا تھا۔

(۳) حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے احترام وعظمت کی وجہ سے اکثر حضرت مولانا سے کسی کام کی مراجعت میں ندوی صاحب ہی چونکہ خادم کا واسطہ بنتے تھے، اس لئے قربت کا یہ بھی ایک سبب بنا۔

(۴) مہذب اور صاف ستھری زبان کے ساتھ ندوی صاحب چونکہ صاف ستھرے دل کے بھی مالک تھے، حسد، بغض، عناد اور تعصب جیسے مہلک اور خطرناک بیماریوں سے بہت دور تھے اور ندوہ کا جو ایک خاص مزاج ہے، یعنی تعصب سے صاف ستھرا ذہن اس کے حامل ہونے کی وجہ سے تعلقات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

(۵) والدمحترم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی نگاہ میں اس خادم کی جو حیثیت تھی اور جس محبت وشفقت کا لگاؤ حضرت مولانا اس خادم کے ساتھ رکھتے تھے اس کو بھی بہت قریب سے ندوی صاحب دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، اس کی وجہ سے بھی شفقت ومحبت میں والدمحترم حضرت مولانا کی نیابت اس خادم کے ساتھ ندوی صاحب کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے اس خادم کا رجحان بھی ان کی طرف بڑھتا گیا۔

(۶) ندوی صاحب کے دل ودماغ میں یہ بات ہمیشہ تازہ رہتی تھی کہ اس خادم کو والدمحترم نے حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے مانگا ہے تاکہ مدرسہ ریاض العلوم میں دارالافتاء کا قیام باضابطہ وجود میں آسکے جواب تک موجود نہیں تھا اور ندوی صاحب مسلسل یہ دیکھتے رہے کہ مدرسہ کے دارالافتاء کے قیام کے ساتھ اس کو شہرت وعظمت، مرجعیت ومرکزیت کس طرح حاصل ہورہی ہے اور اس کی دل سے ندوی

صاحب قدر کرتے تھےاوراس خادم کی ہمت حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے تھے۔

(۷)اس خادم کے اندر تدریس کے ساتھ تقریر وتحریر، امامت وخطابت، علمی وفنی صلاحیت ولیاقت جومنجانب اللہ تھی، اس کی وہ قدر دانی کے ساتھ اظہار بھی کرتے تھے اوراس خادم کے مدرسہ ریاض العلوم میں آنے کے بعد علمی وفنی ارتقاء جو وجود میں آیا اس کی قدر دانی کے ساتھ برملا اظہار میں کوئی دریغ نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ ایک دن وہ بھی آیا کہ انہوں نے سیکڑوں لوگوں سے برملا اس کا اظہار کیا جن میں بڑے مدارس کے بڑے اساتذہ بھی شامل ہیں کہ مجھ کو مدرسہ ریاض العلوم میں اصول الشاسی سے شرح وقایہ اور شرح وقایہ سے ہدایہ اور ہدایہ سے مشکوۃ اور مشکوۃ سے مسلم شریف تک پہونچانے میں مفتی صاحب ہی کا ہاتھ ہے اور انہی کا عمل دخل ہے اور انہی کی قربانی اور رہبری میں یہاں تک پہونچا، ورنہ تو مدرسہ والے مجھ کو علیاء تو درکنار متوسطات تک بھی نہ پہونچنے دیتے۔

(۸) ندوی صاحب میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ حق بات کسی کے سامنے بھی برجستہ و برملا کہہ دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان سے دوری بنا کر رکھتے تھے، چونکہ ندوی صاحب کے نزدیک تعلق میں تملق کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ہر قسم کے تصنع اور چاپلوسی سے دور رہا کرتے تھے ان کی اس حق گوئی وحق شناسی کے ساتھ بے باکی نے بھی ان کی عزت وعظمت میں خادم کی نظر میں بہت اضافہ کیا اور تعلقات کی استوارگی میں یہ بھی ایک اہم کڑی بنی۔

تذکرہ مولانا مبارک علی صاحب بارہ بنکوی

مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے اساتذہ میں ایک نام مولانا مبارک علی بارہ بنکوی کا بھی ہے جو ضلع بارہ بنکی کے سدھور کے رہنے والے تھے اوران کے ماموں سے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری کے تعلقات تھے، انہی کے واسطہ سے مولانا مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں حضرت مولانا کی سرپرستی میں زیر تعلیم رہے اور مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور سے فراغت حاصل کی۔فراغت کے بعد تبلیغ میں ایک سال کا وقت لگایا،تبلیغی کام کے اہم رکن حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کی خدمت میں ان کو رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس زمانہ میں مولانا سے خادم کی پہلی ملاقات ہوچکی تھی، دوسری ملاقات مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں آنے کے بعد ہوئی۔

تبلیغ میں وقت لگا کر جب فارغ ہوئے تو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے ان کو شعبہ حفظ کا مدرس بنا دیا اور جب تک مدرسہ ریاض العلوم میں رہے پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی سے مولانا مبارک علی صاحب کے بہت بے تکلفانہ اور قریبی تعلقات تھے، اسی مناسبت سے اس خادم کی بھی مولانا سے اچھی شناسائی ہوگئی، یہ خادم بلا تکلف جب چاہتا ان کے کمرے میں چلا جاتا اوران کا جب دل چاہتا میرے کمرے میں آجاتے۔ اس طرح تعلقات میں بالتدریج اضافہ ہوتا گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے اورالحمدللہ تعلقات میں کبھی کوئی تلخی نہیں آئی۔

مولانا کا مزاج کتب بینی کا تھا، خالی اوقات میں اکثر اپنے کمرے میں کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے اور اکثر کتب خانہ میں بھی خالی اوقات میں کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظر آتے تھے، جب خادم نے اپنا ذاتی کتب خانہ تیار کرلیا تو جب میرے کمرے میں وہ آتے تو اکثر ان کی نظر کتابوں پر ہی رہا کرتی تھی اور جو کتاب ان کو پسند آتی اس کو الماری سے نکال کر تھوڑی دیر اس کی ورق گردانی ضرور کرتے تھے۔

مولانا کا مزاج چونکہ مطالعہ کا تھا اور حافظہ بھی اچھا تھا اس لئے بہت سے علمی کاموں میں انہوں نے خادم کا تعاون بھی کیا، رفتہ رفتہ کچھ بے تکلفی ایسی بڑھی اور مزاج میں ایسی ہم آہنگی ہوئی کہ علاقائی اور قرب وجوار کے تقریری اسفار میں وہ خادم کے رفیق سفر بن گئے اور بہت ہی خوش مزاجی کے ساتھ لطائف وظرائف کے ساتھ ان کے ساتھ سفر کٹتا تھا۔

اسفار میں بہت سے دلچسپ واقعات بھی پیش آئے جواب تو یاد نہیں رہے، لیکن ایک واقعہ ضرور یاد ہے۔ وہ یہ کہ حافظ صغیر احمد صاحب جو مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، لیکن انہوں نے مڑیاہوں کے قریب جمالا پور میں اقامت اختیار کرلی تھی، وہ کبھی کبھار اپنے آبائی گاؤں بھی آیا کرتے تھے اور جب آتے تو مدرسہ ریاض العلوم کے کچھ اساتذہ سے بھی ملاقات کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جب وہ آئے تو اس خادم سے بھی ملاقات کی اور جمالا پور میں

تقریر کی دعوت دی خادم نے ان کی دعوت کو منظور کرلیا اور مولانا مبارک علی صاحب کی رفاقت میں وہاں کا سفر کیا، وہاں پہونچ کر مغرب سے عشاء تک کے درمیان کا وقت وہاں کی جامع مسجد میں گزرا، اس وقفہ میں اس مسجد کے امام صاحب بھی ہم دونوں کے ساتھ رہے جو ایک ادارہ کے فارغ التحصیل بھی تھے، مولانا مبارک علی صاحب نے معمول و مزاج کے مطابق بہت سنجیدگی سے ان کا انٹرویو لینا شروع کیا، انٹرویو کے درمیان ان سے بہت سے سوالات کئے اور مزاج کے مطابق چٹکی لیتے رہے، ان کا ایک خاص انداز یہ بھی تھا کہ جب کسی کو بیوقوف بناتے تو اس کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ یہ مجھ کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور جب سامنے والا بیوقوف بن جاتا تو اس پر مسکراتے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ امام صاحب سے مولانا نے ایک سوال کیا کہ آپ کی تحصیل کہاں سے ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کہاں کے فارغ ہیں، لیکن امام صاحب مولانا کے سوال کو نہیں سمجھ پائے انہوں نے تحصیل کا عرفی معنی سمجھا اور اپنے گاؤں کی تحصیل کا نام بتایا، اس کے بعد مولانا نے اس کو بے وقوف بنانا شروع کیا اور اس خادم سے ہنسی برداشت نہیں ہو پائی، لہٰذا مجلس سے اٹھ کر دور چلا گیا اور مولانا کافی دیر تک امام صاحب سے محو گفتگو رہے۔

عشاء کی نماز کے بعد خادم کی تقریر تھی، ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کیا جس کے بیچ میں مختلف انداز کے نعرے بھی خوب لگے، تب اندازہ ہوا کہ پوری بستی محبین یعنی جاہل بدعتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بیان سے فارغ ہونے کے بعد حافظ صغیر صاحب کے مکان پر آیا، رات کا قیام انہی کے مکان پر رہا، کل ہو کر وہاں سے مدرسہ ریاض العلوم

گورینی کے لئے بذریعہ بس واپسی ہوئی۔ جونپور سے گورینی آتے ہوئے لپری نامی گاؤں کے پاس سے جب بس گزری تو روڈ کے داہنے ہاتھ پر کھیتوں میں پچاسوں عورتیں دوڑتی ہوئیں نظر آئیں، ہماری سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے وہ اس منظر کو دیکھ کر بولنے لگے، کیا بات ہے عورتیں ہی عورتیں لَوُکُ رہی ہیں کوئی مرد نہیں لَوُکُ رہا ہے، اس فصیح اردو پر مولانا مبارک علی صاحب نے ان کی خوب چٹکی لی اور کافی دیر تک اس کا مذاق اڑاتے رہے، بھڑ کرہاں کے آگے جب بس نکلی تو روڈ کے داہنے ہاتھ پر پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک شخص پورب رخ کر کے کھڑا ہوکر پیشاب کر رہا تھا، پورب سے چلنے والی تیز ہوا نے اس کے پیشاب کا رخ بدلتے ہوئے اس کے پینٹ کو بھگا دیا، اس نے جھٹ اپنا رخ پچھّم طرف تبدیل کر دیا تا کہ اس کی پینٹ نہ بھیگے، لیکن اس کو یہ خیال نہیں رہا کہ اس راستہ سے گزرنے والے مجھ کو دیکھ کر کیا سوچیں گے، لیکن مولانا کی نظر اس کی اس حرکت پر دور ہی سے تھی، جب قریب بس پہونچی تو پیچھے سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کر کے کہا، اب تو مرد لَوُکُ رہا ہے، لیکن مولانا کی اس تعریض و تلمیح کو وہ شخص نہیں سمجھ پایا، اور یہ خادم ہنستا ہوا گورینی پہونچ گیا۔

مولانا کے مزاج میں سادگی، متانت، طبیعت میں لطافت وظرافت کے ساتھ ذکاوت بھی بہت تھی۔ چنانچہ اکثر ہم تینوں مدرسہ کے احاطہ میں جب کہیں بیٹھ جاتے یعنی یہ خادم اور مولانا عبد العظیم صاحب ندوی اور مولانا مبارک علی صاحب تو ہماری سہ نفری جماعت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر لوگ دور سے کترا کر نکل جاتے تھے کہ کہیں

چائے کے بہانے یہ تینوں ہماری کھٹیانہ کھڑی کردیں اور اگر کبھی کوئی پھنس جاتا تو اس کے لئے چائے مکمل کرنی دشوار ہوجاتی تھی، چونکہ چائے پیتے ہوئے ہم تینوں مل کر اس کو اتنا بور کردیتے تھے کہ اس کی میٹھی چائے کڑوی ہوجایا کرتی تھی، اور ہم تینوں کا اکثر عصر سے مغرب تک تفریح کا یہی معمول تھا اور اسی سے ہم لوگ دن بھر کی تدریسی تکان نکالا کرتے تھے۔ چونکہ اس خادم کے زیر درس مختصر المعانی بھی کئی سال رہی، اس لئے اس کے استعارات، تشبیہات، تلمیحات، کنایات، بدیعیات، نکات کا خوب استحضار تھا اور اس انداز کی مجلسوں میں اس کا خوب استعمال بھی کرتا تھا اور اس پر حاشیہ اور بین السطور لگانے کا کام مولانا مبارک علی صاحب اور مولانا عبد العظیم صاحب ندوی کیا کرتے تھے، اس سے مجلس کی جملہ بازیاں پُر مغز و پُر معنی ہوجایا کرتی تھیں، جن کو سن کر مولانا مبارک علی صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ آپ کی باتوں کو، آپ کے جملوں کو، آپ کے استعارات کو، آپ کے کنایات کو، آپ کی تلمیحات کو سمجھنے والے نہیں رہیں گے۔ چنانچہ اپنی زندگی میں وہ وقت بھی آیا کہ مولانا کی اس بات کی تصدیق ہوگئی اور اس وقت بہت زیادہ مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔

مولانا مبارک علی صاحب کے اندر جہاں لطافت اور ظرافت اور ذکاوت تھی وہیں سخاوت بھی بے پناہ تھی، غربت کے باوجود پورے مہینے کی تنخواہ اپنے دوستوں کی پُر تکلف دعوت اور ناشتے پر خرچ کردیا کرتے تھے اور خرچ کرنے کے بعد خوش ہوا کرتے تھے جس کا صلہ اللہ نے ان کو اس طرح دیا کہ چند سالوں کے بعد لندن جانے

کی سبیل پیدا ہوگئی اور کچھ دنوں کے بعد پوری فیملی اور اپنے بھائی کو بھی وہاں بلالیا کافی عرصہ تک ٹورڈ مارڈن میں مسجد حمزہ کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد بریڈفورڈ ہجرت کر گئے وہاں پہونچ کر وہ خود کفالت کی زندگی گزارنے لگے اور اپنے بہت سے اعزاء واقارب اور احباب کی خدمت برضاء ورغبت کرنے لگے۔

جس کی صورت یہ بنی کہ مولانا طلحہ صاحب جو کوٹلہ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں وہ اس مقام پر اسی مسجد کی خدمت انجام دے رہے تھے، کچھ دنوں کے بعد وہ ہجرت کر کے لندن قیام پذیر ہو گئے، وہاں کے منتظمین اور نمازیوں نے مولانا طلحہ صاحب سے درخواست کی کہ آپ اپنے ہی جیسا کوئی امام ہمیں مہیا کر کے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے اصرار وخواہش پر ایک عریضہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری کے نام بھیجا جس میں امام طلبی کی درخواست کے ساتھ کچھ شرائط لکھے ہوئے تھے کہ وہ شخص عالم کے ساتھ حافظ بھی ہوتا کہ تراویح سنا سکے اور جماعت میں وقت لگائے ہوا ہوتا کہ مقامی تبلیغی کام کو سنبھال سکے اور تیسری شرط یہ تھی کہ وہ مظاہری ہو یعنی مظاہر علوم سہارنپور کا فارغ ہو۔

جب یہ خط حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کو ملا تو آپ نے اپنے برخوردار مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی سے اس کا تذکرہ کیا اور ندوی صاحب نے اس خادم سے تذکرہ کیا، ہم دونوں کی رائے مولانا مبارک علی صاحب کے بارے میں بنی، چونکہ وہ ان شرائط پر پورے اتر رہے تھے، ندوی صاحب نے اس رائے کی اطلاع حضرت مولانا کو دی، مولانا نے بھی اس رائے کی تصدیق وتصویب فرمائی اور مولانا

مبارک علی صاحب کو بلا کر اس کی خبر کر دی گئی۔ چنانچہ وہ سرکاری کاروائی میں لگ گئے اور کاغذات کی تکمیل کے بعد غالباً ۱۹۸۳ء یا ۱۹۸۴ء میں برطانیہ پہونچ گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے زمانہ تک ہم دونوں کا رابطہ نہیں رہا۔ بالآخر ۲۰۰۰ء میں جب یہ خادم پہلی مرتبہ برطانیہ پہونچا تو انہوں نے اتنی خدمت کی جس کو یہ خادم پوری زندگی فراموش نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی خدمت کا کوئی صلہ دے سکتا ہے۔ اس کا اجر اللہ پاک ہی ان کو اپنے خزانہ غیب سے مرحمت فرمائیں گے۔

اس خادم کی دعاء ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو ایمان اور اعمال صالحہ پر زندہ اور قائم رکھے اور اپنے وقت پر ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی کا ابتدائی ماحول

یہ خادم جب مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا تو وہاں کے اساتذہ کے مزاج میں اتنی خشکی پائی کہ اس ماحول کو میں دیکھ کر حیران رہ گیا، اساتذہ جب ایک دوسرے کے کمرے میں جاتے تھے تو صاحب کمرہ چائے پانی کو بھی نہیں پوچھتا تھا، لیکن یہ تو اندر کی بات تھی، حیرت بالائے حیرت اس وقت ہوئی جب اس خادم نے دیکھا کہ دور سے آنے والے مہمانوں کے ساتھ بھی وہاں کے مدرسین اور ذمہ داروں کا یہی برتاؤ وسلوک ہے کہ کسی مہمان کو چائے پانی کے لئے کوئی پوچھنے کو روادار نہیں۔

ایک مرتبہ مدرسہ ریاض العلوم کے نائب ناظم نے اس خادم سے بتلایا کہ بابا

یعنی حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا بمبئی سے خط آیا ہے۔ بابا نے مدرسہ کے ذمہ داروں کو بہت ڈانٹ پلائی ہے، لکھا ہے کہ مدرسہ کے لئے میں در، در کی خاک چھانتا پھرتا ہوں بمبئی میں کئی مہینہ پڑا رہتا ہوں لیکن اگر میرا کوئی مہمان یا مجھ کو چاہنے والا مدرسہ پہونچتا ہے تو تم لوگوں کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اس کو چائے پانی کو پوچھ لو۔

ہوا یہ تھا کہ اعظم گڑھ ضلع کے رہنے والے ایک صاحب جو بمبئی رہا کرتے تھے وہ اپنی کسی ضرورت سے گھر آئے، حضرت مولانا کے حکم اور خواہش پر پہلی مرتبہ وہ مدرسہ ریاض العلوم پہونچے، انہوں نے مدرسہ دیکھا اور مدرسہ کے ذمہ داروں سے ملاقات کی، لیکن کسی نے بھی چائے پانی کو نہیں پوچھا، جب وہ بمبئی پہونچے اور حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مدرسہ ریاض العلوم کی حاضری کی روداد بتلائی اور خصوصیت کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کیا کہ میں مدرسہ گیا، مدرسہ دیکھا، لیکن کسی نے چائے پانی کو نہیں پوچھا، یہ سن کر حضرت مولانا کو بہت صدمہ ہوا اور اسی پر ڈانٹ کا خط مدرسہ کے ذمہ داروں کے نام لکھا۔

بہرحال اس خشک ماحول کی تبدیلی کا اس خادم نے ارادہ کیا اور باوجود قلیل تنخواہ کے یہ معمول بنالیا کہ میرے کمرہ میں جو بھی آتا اس کی چائے پان کے ذریعہ ضیافت کرتا اس کا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ جب یہ خادم ان کے کمرے میں جاتا تو ان کو چائے پان کے ذریعہ میری ضیافت کرنی پڑتی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سال کے اندر پورے مدرسے کا ماحول بدل گیا اور ضیافت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس بدعت حسنہ کا موجد لوگوں نے اس خادم کو قرار دینا شروع کردیا۔ اس طرح سے ماحول خشکی سے تری

کی طرف اس طرح بڑھا کہ آنے والے مہمانوں کی بھی خاطر خواہ ضیافت شروع ہونے لگی۔

تبلیغی جماعت اور مدرسہ ریاض العلوم گورینی

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری اگرچہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے خوشہ چینوں میں تھے لیکن فراغت کے بعد وطن عزیز دیوریا ضلع فیض آباد واپسی کے بعد گویا کہ فی الجملہ مدرسہ مظاہر علوم سے ایک گونہ رشتہ مضمحل ہو گیا، علمی تعلق کے باوجود معاشی مسائل کے دباؤ میں آپ علاقہ ہی میں متمکن ہو گئے لیکن بزرگوں سے تعلق محبت عقیدت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس زمانہ میں ٹانڈہ میں ایک بزرگ میاں چاندشاہ صاحب تھے جن کے حلقہ اثر میں فیض آباد کے ساتھ جونپور بھی تھا۔

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب گھریلو مشاغل کے ساتھ ٹانڈہ میاں چاندشاہ صاحب کے یہاں بھی آتے جاتے رہے اور انہی کے حکم پر مانی کلاں ایک مکتب میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، آپ نے مکمل سمع وطاعت کے ساتھ مکتب کی تدریسی خدمت ہی انجام نہیں دیا بلکہ بالتدریج آپ نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ اس مکتب کو مدرسہ کی شکل دے دی اور کچھ ہی دنوں کے بعد وہ مکتب مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں کے نام سے جانا اور پہچانا جانے لگا، دھیرے دھیرے آپ نے اپنے وطن عزیز دوریا ضلع فیض آباد کو بھی خیرا باد کہہ دیا اور مانی کلاں ہجرت کر گئے اور اپنے آپ کو مکمل ادارہ

کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے وقف کردیا اور ایک لمبے وقفے تک آپ مانی کلاں میں مقیم رہ کر مدرسہ ضیاء العلوم کی ہمہ جہت ترقی میں مشغول رہے، ایک دن وہ آیا کہ آپ کی کاوشوں، سعی بلیغ، آہ سحر گاہی کی بدولت یہ مدرسہ علاقہ میں معروف ومشہور ہوا اور مشکوۃ شریف تک تعلیم ہونے لگی اور حضرت مولانا کی برکت سے قابل اعتماد اور ماہر اساتذہ اس مدرسہ کے لئے فراہم ہوگئے، تعلیمی، تدریسی، انتظامی مشاغل کے ساتھ چونکہ آپ کا مزاج مظاہر علوم سہارنپور کی طالب علمی کے زمانہ سے اولیاء اور بزرگوں سے وابستہ رہا، بالخصوص حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے آپ کا بہت گہرا تعلق تھا، عشاء کے بعد روزانہ حضرت شیخ کے سر پر تیل رکھنے کے لئے آپ جایا کرتے تھے، لیکن بُعد مکانی کے ساتھ مدرسہ کے مشاغل کی وجہ سے آپ کا سہارنپور کا سفر متاثر ہوا، لیکن وہ چنگاری جو دل میں جل چکی تھی وہ بجھی نہیں تھی۔

ادھر حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی جو حضرت تھانوی کے خلفاء میں سے تھے اور ان کا سفر جونپور اور اس کے گردونواح میں بھی ہوتا رہتا تھا، قرب مکانی کی وجہ سے آپ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی سے منسلک ہوگئے اور ایک طویل زمانہ تک آپ کے یہاں آمد ورفت رہی اور آپ کی روحانی دولت سے خوب خوب فیض یاب ہوئے، ایک دن وہ بھی آیا کہ آپ حضرت شاہ صاحب کی اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت شاہ صاحب سفر حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے اور حضرت شاہ صاحب کی رفاقت میں آپ کا بھی سفر طے پایا۔ چنانچہ آپ بمبئی تشریف لے

گئے، لیکن حضرت شاہ صاحب کے قافلہ میں آپ کی شرکت نہیں ہوسکی، یہ طے پایا کہ آپ اس کے بعد والے جہاز سے آئیں، لیکن بتقدیر الٰہی حضرت شاہ صاحب جدہ پہونچنے سے پہلے پانی کے جہاز ہی میں اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے اور آپ کا جسد خاکی سمندر کے حوالہ کر دیا گیا اور آپ کا بار بار پڑھا جانے والا شعر صادق آگیا ؂

پھول کیا ڈالوگے تربت پہ میری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

جب اس اندوہناک خبر کی اطلاع احباب اور متعلقین کو ہوئی تو سب اس ناگہانی حادثہ سے ایسا ٹوٹے کہ سنبھلنے میں ہفتوں کا وقت لگا۔ آخر کار سب کو صبر کا دامن تھامنا پڑا اور انہی حضرات میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب بھی تھے جو شکستہ دل بمبئی میں صبر کا دامن تھامے ہوئے پریشان حال تھے، اسی درمیان کسی نے آپ کو یہ خبر دی کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب بمبئی تشریف لائے ہوئے ہیں، آپ فوراً اٹھے اور حضرت شیخ کی ملاقات کے لئے چل پڑے، جونہی آپ نے سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا حضرت شیخ اپنے دیرینہ شاگرد و خادم کو پہچان گئے اور یہ فرماتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا اور دیر تک لگائے رکھا کہ میاں مولوی عبدالحلیم اتنے دنوں تک کہاں تھے، بس حضرت کے سینہ سے آپ کا لگنا کیا تھا کہ جیسے زخم کو مرہم اور دوا مل جائے، اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا غم ایک دم سے ہلکا ہو گیا اور اسی دن سے حضرت شیخ کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد پوری زندگی حضرت شیخ سے وابستہ رہے اور اس وابستگی کے بہتر

ثمرات ونتائج سے آپ فیض یاب ہوئے، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، جب تک حضرت شیخ باحیات رہے آپ کے بہت سے اسفار میں آپ کی رفاقت ملی، حضرت شیخ کے سارے متعلقین ومحبین ومتوسلین کی مصاحبت اور محبت آپ کو ملی۔ حضرت شیخ کی برکت سے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کی رکنیت حاصل ہوئی، تبلیغی جماعت اور تبلیغی کام کرنے والے ذمہ دار حضرات اور رفقاء کی رفاقت اور عنایت ملی، اس کے بعد آپ تبلیغی جماعت اور نظام الدین سے قریب تر ہوتے چلے گئے، نوبت باینجا رسید کہ دومرتبہ اضلاع مشرقیہ اور ایک مرتبہ عالمی اجتماع حضرت مولانا کی ہی زندگی میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں منعقد ہوا اور علاقائی ماہانہ اور سالانہ اجتماعات بکثرت ہوئے، گورینی حلقہ کا مرکز بھی مدرسہ ریاض العلوم بنا جہاں ہفتہ واری شب گزاری بھی ہوتی تھی۔

لیکن مدرسہ ریاض العلوم میں کام کرنے والے مدرسین اور ملازمین وہ تھے جو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی وجہ سے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی تعلیمات اور مزاج سے وابستہ تھے، جس کی وجہ سے حضرت مولانا کی خواہش کے باوجود مدرسہ ریاض العلوم میں تبلیغی کام قدم نہیں رکھ پایا تھا جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم پہونچا اور حضرت مولانا کی وابستگی اور خواہش کو بار بار سنا تو اپنے رفیق محترم مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کو لے کر مانی کلاں پہونچا جہاں کی جامع مسجد میں ضلع جونپور کا تبلیغی اجتماع ہورہا تھا، عرب کی جماعت بھی اس میں آئی ہوئی تھی اور مولانا مستقیم صاحب

بستوی جو اس وقت ماہانہ تبلیغی اجتماع کے روح رواں ہوا کرتے تھے موجود تھے، اس خادم کی ان سے پہلی ملاقات تھی، ملاقات کے بعد عرب جماعت کی رفاقت کے لئے تین دن کی میری تشکیل کر دی، میں نے اپنے ساتھ اپنی رفاقت کے لئے مولانا عبدالعظیم ندوی کو پکڑا، وہ بھی تیار ہو گئے، ہم دونوں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال سے ان کو باخبر کیا۔ انہوں نے بہت خوشی سے عرب جماعت کے ساتھ جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی کا نمائندہ بن کر جماعت میں نکلا، تین دن جماعت میں لگانے کے بعد علاقہ کے جماعت کے ساتھیوں کو اس خادم کی انگلی پکڑنے کا موقع مل گیا اور چونکہ حضرت مولانا کی بھی خواہش تھی کہ میرا مدرسہ تبلیغ سے جڑ جائے، اس لئے آپ کی تائید اور تقویت بھی حاصل رہی، اور دھیرے دھیرے یہ خادم ضلع جونپور کے ماہانہ اجتماع میں شریک ہونے لگا اور ہر اجتماع میں اس خادم کا بیان بھی شروع ہو گیا۔

ایک دن وہ بھی آیا کہ اس خادم کے مطالبہ پر مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں ضلع جونپور کا پہلا تبلیغی اجتماع طے پایا، اجتماع سے چند روز قبل دفتر نظامت میں اس خادم کو طلب کیا گیا اور نائب ناظم نے مجھ سے کہا کہ مفتی صاحب مدرسہ میں اجتماع آپ کے مطالبہ پر ہو رہا ہے، اس لئے مدرسہ ایک نمک کا ڈلا بھی آپ کو نہیں دے گا، اور نہ اجتماع پر خرچ کرے گا، آپ جانیں اور آپ کی تبلیغ جانے، مدرسہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس خادم نے اپنی تنخواہ سے خواص کے کھانے کا نظم

وانتظام کیااور بحسن وخوبی ماہانہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔

لیکن حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی خواہش کے احترام میں یہ خادم تبلیغی کام سے قریب تر ہوتا چلا گیا، ماہانہ وسالانہ اجتماعات کی شرکت مرکز نظام الدین کی آمدورفت، یوپی کے جوڑ میں شرکت، اضلاع مشرقیہ اور عالمی اجتماعات میں شرکت شروع کردی، نیز دومرتبہ مدرسہ ریاض العلوم کی نمائندگی کرتے ہوئے چلہ بھی لگایا۔ پہلا چلہ نظام الدین سے گودھرا، وہاں سے سورت گجرات میں مکمل ہوا، دوسرا چلہ نظام الدین سے مرادآباد میں مکمل ہوا۔

ایک دن وہ بھی آیا کہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں تبلیغی جماعت کا ضلع جونپور کے تبلیغی ذمہ داروں کی طرف سے طلباء اساتذہ کا امیر اس خادم کو بنایا گیا اور اس کے بعد اس خادم نے منظّم اور مرتب انداز میں طلباء اور اساتذہ کی جماعت نکالنا شروع کیا اور ایک لمبے عرصہ تک یہ سلسلہ پابندی کے ساتھ چلتا رہا، ہر ہفتہ طلباء واساتذہ کی کئی کئی جماعتیں مدرسہ ریاض العلوم کے گردوپیش میں جاتی رہیں۔

اسی دوران نوگڈھ کے اضلاع مشرقیہ کے اجتماع میں مرکز کے ذمہ داروں نے اس خادم کا بیان کروایا۔ ہتھورہ میں ہونے والے اضلاع مشرقیہ کے اجتماع میں بھی ذمہ داروں نے اس خادم کا بیان کروایا اور مرکز نظام الدین میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگی کہ اب مدرسہ ریاض العلوم بھی مکمل طور پر تبلیغ سے وابستہ ہوگیا ہے۔ حالانکہ اس تحریک سے وابستگی صرف اسی خادم تک محدود تھی، لیکن اس خادم کی تنہا نمائندگی نے مرکز نظام الدین کے تمام اکابرین کے ذہنوں میں پورے مدرسہ ریاض

العلوم کوتبلیغی بنا دیا۔

ایک مرتبہ یوپی کے جوڑ میں مرکز نظام الدین جانا ہوا، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب کے کمرہ کے باہر برآمدہ میں یہ خادم بیٹھا ہوا مولانا نوازش علی صاحب جو علن پور ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے گپ شپ میں مصروف تھا، اتنے میں مولانا عمر صاحب پالن پوری کا خادم اوپر سے آیا اور مجھ سے کہا کہ حضرت مولانا عمر صاحب پالنپوری آپ کو یاد فرما رہے ہیں، یہ خادم جب اوپر پہونچا تو حضرت مولانا عمر صاحب پالن پوری بالائی منزل کے برآمدہ میں ٹہل رہے تھے اور قرآن پاک ایک صاحب کو سنا رہے تھے، سلام ومصافحہ کے بعد بہت محبت سے خیر وخیریت پوچھی اور جیب سے ایک ہزار روپیہ نکال کر اس خادم کو دیا، حضرت مولانا کے پاس سے جب نیچے واپس آیا تو مولانا نوازش علی صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، میرے پہونچتے ہی انہوں نے خیریت پوچھی ، میں نے جب ان کو بتایا کہ حضرت مولانا عمر صاحب پالن پوری نے ایک ہزار روپیہ مجھ کو ہدیہ دیا ہے تو ان کو یقین نہیں آیا، جب مٹھی کھول کر میں نے دکھایا تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور کہنے لگے کہ مفتی صاحب میری زندگی گزر گئی، تبلیغ میں لگے ہوئے اور تبلیغی کام کرتے ہوئے، لیکن مجھ کو آج تک حضرت مولانا عمر صاحب نے کبھی ایک پیسہ بھی ہدیہ نہیں دیا اور آپ کو تبلیغ میں لگے ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور آپ کو ایک ہزار روپیہ حضرت مولانا نے ہدیہ دیا، اس کے جواب میں اس خادم نے ان سے کہا کہ لگتا ہے کہ آپ خلوص سے نہیں لگے ہوئے ہیں، اس لئے آپ اس مقام تک نہیں پہونچے، اس کے بعد مولانا نوازش علی صاحب

خاموش ہو گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ یوپی ہی کے جوڑ میں مرکز نظام الدین جانا ہوا اس جوڑ میں حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی بھی موجود تھے اور مرکز کے حوض کی چھت پر ان کا قیام تھا، اس وقت اس خادم کی "**احکام یوم الشک**" **المساعی المشکورہ فی الدعاء بعد المکتوبہ، احب الکلام فی مسئلۃ السلام، بنام** سلام کی اہمیت و حیثیت، یہ تینوں کتابیں شائع ہو چکی تھیں، یہ تینوں کتابیں حضرت قاری صاحب کی خدمت میں اس خادم نے پیش کیا، حضرت قاری صاحب نے بہت محبت اور اہتمام کے ساتھ ورق گردانی فرمائی اور کچھ حصوں کا کہیں کہیں سے مطالعہ فرمایا، اس کے بعد اس خادم سے کہا کہ مفتی صاحب یہ کام یعنی تصنیف و تالیف بہت اہم ہے۔ جس کے کرنے والے ہزاروں میں ایک دو پیدا ہوتے ہیں، رہ گیا تبلیغی کام یہ تو ہر ایک کر لیتا ہے، ایک جاہل بھی اچھی تبلیغ اور اچھی تقریر کر لیتا ہے، اس لئے تصنیف و تالیف کے کام پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے چونکہ یہ کام بہت اہم اور ضروری ہے۔

ادھر جب تبلیغ سے وابستگی بہت بڑھی تو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے مدرسہ کے صدر مدرس نے یہ شکایت شروع کر دی کہ مفتی صاحب تو ہر وقت تبلیغ ہی میں لگے رہتے ہیں، تو اب یہ کیا پڑھائیں گے، لیکن حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب اس خادم کی تبلیغ اور تدریس دونوں کاموں سے اپنے ذرائع سے باخبر رہنے کی وجہ سے مطمئن اور خوش تھے، اس لئے صدر مدرس کی شکایت کے باوجود حضرت مولانا نے

خادم کو بلا کر کبھی کچھ نہیں فرمایا بلکہ تائید و تحسین ہی فرماتے رہے۔

مولانا مستقیم احمد صاحب بستوی جو جونپور اور اعظم گڑھ کے ماہانہ ضلعی اجتماعات کو پابندی سے سنبھالتے تھے اور بستی سے ہمیشہ اجتماعات میں شرکت کیا کرتے تھے، مرکز بلا لیے گئے اور مرکزی کاموں میں ان کا رہنا طے کر دیا گیا، جس کا اعلان مرکزی مشورہ کے بعد حضرت مولانا عمر صاحب پالن پوری نے مجمع میں کیا۔

مولانا مستقیم صاحب کے مرکز جانے کے بعد حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ اب ضلع جونپور کے ماہانہ تبلیغ اجتماعات کا کیا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا تذکرہ قصبہ شاہ گنج کے تبلیغی کام کے ایک اہم ذمہ دار مرزا کامل صاحب سے کیا جس مجلس میں ڈاکٹر سخاوت علی شمیم صاحب بھی موجود تھے کہ مرزا صاحب مولانا مستقیم صاحب تو اب مرکز نظام الدین بلا لیے گئے، اب ضلع جونپور کے ماہانہ تبلیغی اجتماعات کا کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں مرزا کامل صاحب نے برجستہ اور بلا توقف یہ جواب دیا کہ حضرت، مفتی حبیب اللہ صاحب کے ہوتے ہوئے کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے، انشاء اللہ بحسن و خوبی وہ اس کو سنبھال لیں گے، یہ جواب سن کر حضرت مولانا خاموش ہو گئے، بعد میں جب مرزا کامل صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوری بات مجھ سے نقل کی۔ چنانچہ مولانا مستقیم صاحب کے مرکز جانے کے بعد کئی سال تک ضلع جونپور اور اعظم گڑھ کے ماہانہ تبلیغی اجتماعات یہ خادم باحسن وجوہ انجام دیتا رہا، بیان سے لے کر روانگی کی ہدایات تک دعاء سے لے کر سلام و مصافحہ اور جماعت کی روانگی تک سارے فرائض اس خادم کے سپرد ہوتے تھے

اور باحسن وجوہ انجام پذیر ہوتے تھے۔

جب یہ خادم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا منشا دیکھ کر تبلیغی جماعت کے کام سے جڑا اور کام کرنے والوں کی زبانوں پر یہ چرچہ شروع ہوگیا کہ اب ریاض العلوم گورینی میں بھی تبلیغی کام ہورہا ہے اور ماہانہ اجتماعات شروع ہو چکے ہیں تو حضرت مولانا کو بھی اس سے بڑا حوصلہ ملا اور یوپی کے جوڑ میں مرکز نظام الدین جاتے ہوئے حضرت مولانا نے اس خادم کو حضرت جی (مولانا انعام الحسن) کے نام ایک خط سپرد فرمایا جس میں حضرت مولانا نے مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں اضلاع مشرقیہ کے اجتماع کا مطالبہ فرمایا، نظام الدین پہونچ کر میں نے وہ خط حضرت جی کے سپرد کیا اور تین روزہ مشورہ کے درمیان مرکز کے اکابرین سے ملاقات کرکے مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں اجتماع کی سفارش کرتا رہا، بالآخر یہ اجتماع منظور طے پاگیا اور اس کا اعلان مرکز سے مجمع میں ہوگیا۔ واپسی پر حضرت مولانا کو اس خادم نے اطلاع دی، حضرت مولانا یہ اطلاع پاکر بہت مسرور ہوئے اس کے بعد یہ خادم اجتماع کی محنت میں لگ گیا، جب اجتماع کا وقت قریب آیا تو جماعت کے احباب جمع ہوئے اور اجتماع کی محنت کے لئے علاقہ کی تعیین کے ساتھ افراد طے کئے گئے ان میں دو افراد ایسے تھے جن کا دو مہینہ کا روزانہ کا پروگرام طے پایا۔

(۱) مولانا مستقیم صاحب بستوی (۲) یہ خادم۔ راقم کے ذمہ جونپور اور اعظم گڑھ کے کئی گاؤں طے پائے، اس کے ساتھ بنارس اور بھدوہی بھی دیا گیا، یہ خادم دن بھر مدرسہ میں سبق پڑھاتا اور شام کے وقت بس کے ذریعہ متعینہ مقامات کا سفر کرتا اور رات میں عشاء کی نماز کے بعد بیان وتشکیل سے فارغ ہوکر اور پروگرام مکمل کرکے

رات ہی میں یا صبح مدرسہ واپس آجاتا اور دن بھر سبق پڑھاتا ایک مہینہ تک مسلسل یہی سلسلہ رہا اور ہر سفر اپنے ذاتی اخراجات سے کرتا رہا۔

لیکن اس وقت اس خادم کو بہت افسوس اور صدمہ ہوا اور اس سوچ پر بہت رنج اور غم ہوا جب ایک دن پروگرام کے بعد صبح کو واپسی ہوئی اور بعض مخلص اور سچے دوستوں نے یہ بتایا کہ کل مدرسہ کے نائب ناظم طلباء میں یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی صاحب اجتماع کی محنت تھوڑے کر رہے ہیں وہ تو اجتماع کے نام پر اپنی جیب بھر رہے ہیں۔ نائب ناظم کا یہ چبھتا ہوا جملہ نشتر کی طرح دل میں لگا اور دل زخمی و چور چور ہو گیا جبکہ پورے مہینہ کا سفر اس خادم نے اپنی جیب خاص اور اپنی تنخواہ کی رقم سے کیا، کسی بھی تبلیغی یا غیر تبلیغی یا مدرسہ نے کرایہ کے لئے یا بغیر کسی نام کے کوئی تعاون نہیں کیا، لیکن مدرسہ کے نائب ناظم اس طرح کے دلخراش جملہ اپنی زبان سے بے دلیل نکال کر خادم کا دل دکھاتے رہے اور ہمت و حوصلہ پست کرتے رہے، لیکن اس خادم کی نظر صرف اللہ پر اور اللہ کے ولی حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب پر رہی اور پورے اخلاص اور ہمت کے ساتھ ہر خدمت انجام دیتا رہا۔

قرب وجوار کے تقریری اسفار

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا تو مدرسہ کے اساتذہ وملازمین میں کوئی ایسا نہیں تھا جو دور وقریب کے جلسوں میں پہونچ کر خطاب کر سکے اور مدرسہ ریاض العلوم گورینی کی نمائندگی کر سکے، میرے پہونچنے کے بعد یہ قرعۂ فال

بھی اسی خادم کے نام نکلنے لگا اور قرب و جوار اور دور وقریب کے جلسوں میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی کی نمائندگی شروع ہوگئی، میرے پہونچنے سے پہلے بعض حضرات مدرسہ میں ایسے تھے جو صرف وعظ کہنے کی اہلیت رکھتے تھے، اور وہ بھی کبھی کبھار کسی گاؤں میں جاہلوں میں وعظ کہا کرتے تھے لیکن جلسوں کے اشتہارات میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی کی ترجمانی غائب تھی، دھیرے دھیرے دور وقریب کے جلسے والے مدرسہ میں آنے لگے اور یہ خادم نمائندہ بن کر جانے لگا، کئی بار ایسی بھی صورت حال پیش آئی کہ یہ خادم لمبے سفر سے واپس آیا اور ابھی کمرہ کھول بھی نہیں پایا کہ مدرسہ کے نائب ناظم دوڑے ہوئے پہونچے اور آکر انہوں نے کہا کہ مفتی صاحب آپ کی وجہ سے فلاں جگہ کے جلسے والوں کو میں نے منظوری دے دی ہے، وہ بے صبری سے انتظار کررہے ہوں گے، لہٰذا آپ وہاں کے لئے فوراً روانہ ہوجائیں۔ چنانچہ یہ خادم تعمیل حکم میں بلاتوقف بغیر کمرہ میں داخل ہوئے اسی حال میں پروگرام کے لئے روانہ ہوجاتا۔

دوروقریب کے جلسوں میں عموماً رفیق سفر کے طور پر مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی یا مولانا مبارک علی صاحب مظاہری یا قاری انیس الرحمٰن صاحب جونپوری ہوا کرتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مدرسہ ریاض العلوم کے دیگر اساتذہ بھی ہوتے تھے، لیکن تقریر صرف اس خادم ہی کی ہوا کرتی تھی، قرب وجوار سے بعض دیہات کے پروگراموں میں مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد حنیف صاحب جونپوری کا بھی

کبھی کبھار وعظ ہوا کرتا تھا، لیکن اس خادم کی پوری تقریر بہت دھیان سے وہ سنتے تھے، کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ تقریر ختم ہونے کے بعد صدر مدرس صاحب نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مفتی صاحب جب آپ تقریر کرتے ہیں تو سانس کب لیتے ہیں، آپ کے خطاب میں اس قدر تسلسل اور روانی ہوتی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہو پاتا کہ آپ کب کب سانس لے رہے ہیں۔

یہی بات یہ خادم جب ذکر کی مجلس میں دوازدہ تسبیح کا جہری ذکر کرتا تھا تب بھی بہت سے شرکاءِ مجلس مجلس ذکر کے ختم ہونے کے بعد یہ سوال کیا کرتے تھے کہ مفتی صاحب جب آپ ذکر کرتے ہیں تو سانس کب لیتے ہیں کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں لگتا کہ آپ سانس کب لے رہے ہیں اور آپ کے ذکر میں اس قدر تسلسل اور حلاوت ہوتی ہے اور اتنا مزہ آتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اپنا ذکر بند کر کے آپ ہی کا ذکر سنتے رہیں، چونکہ آپ کا ذکر سن کر قلب میں جو کیفیت اور حرارت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے ذکر سے نہیں پیدا ہوتی۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے قیام کے زمانہ میں ضلع جونپور اور اعظم گڑھ کا شاید ہی کوئی گاؤں بچا ہو جہاں متعدد بار یا کم از کم ایک بار تقریر کے لئے جانا نہ ہوا ہو، لیکن ان مواضعات میں تقریر کے لئے سب سے زیادہ جانا مجھورا میں ہوا جو مینچھا اور سنبل پور کے بیچ میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے قریب واقع تھا۔

وہاں حافظ عبد الرزاق نام کے ایک بزرگ صفت حافظ صاحب تھے جو انتہائی سادہ مزاج، شریف النفس، ملنسار متواضع علماء اور اللہ والوں سے محبت کرنے

والے، خوشدل، دیندار، صوم وصلوۃ کے پابند اور عبادت گزار تھے، ان کی دعوت پر اس خادم کا مجھورا بہت جانا ہوا، بلکہ ایک مرتبہ تو جب حضرت مولانا سے حافظ عبدالرزاق صاحب نے تقریر کے لئے اس خادم کو لے جانے کی اجازت مانگی تو حضرت مولانا نے ناراض ہوکر ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ حافظ جی میرے استادوں کو دعوت کھلا کھلا کر آپ خراب کردیں گے، لیکن اس کے بعد پھر اجازت دے دی۔

چونکہ اس خادم کا معمول یہ تھا کہ کسی جلسے میں جانا ہو یا تقریر میں کہیں سفر میں جانا ہو یا کسی کام کے لئے نکلنا ہو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی موجودگی میں بغیر حضرت مولانا کی اجازت اور مشورہ سے نہ کوئی کام کرتا تھا اور نہ کوئی سفر، اس لئے جب کبھی کوئی پروگرام یا جلسہ یا تقریر کے لئے آتا تو چاہے چھٹی ہی کا دن کیوں نہ ہو میں اس کو حضرت مولانا کے یہاں بھیج دیتا کہ حضرت سے اجازت لے کر آؤ۔ اگر حضرت اجازت دیں گے تب جاؤں گا ورنہ نہیں، اور حضرت کی عدم موجودگی میں یہ خدمت حضرت کے صاحبزادہ مولانا عبدالعظیم ندوی کے سپرد کردیا تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر نہ کوئی کام کرتا اور نہ سفر کرتا تھا اور نہ کسی پروگرام کی منظوری دیتا تھا۔

چونکہ اس خادم کا مزاج اپنے بڑوں کی تربیت اور ان کی صحبت میں رہ کر یہ بنا ہوا تھا کہ جہاں رہو وہاں جو بڑا ہو اس کی ماتحتی میں اپنے کو بنا کر رکھو اور اس کی مرضی اور مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرو، انکی مان کر چلو اور ان کی تابعیت کو قبول کرو، من مانی اور خودرائی میں سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ہے اور اگر کوئی بڑا نہ ہو تو معاصرین یا خوردوں میں سے کسی کو بڑا بنالو اور اس کی مان کر چلو، اس میں اجتماعیت کے ساتھ

راحت بھی ہے۔ چنانچہ زندگی کا یہ اصول آج تک اس عمر میں بھی اس خادم کا ہے، کہ کسی نہ کسی کو اپنا بڑا امان کر اور بڑا ابنا کر اور بڑا سمجھ کر اس کے مشورہ سے چلتا اور اپنے کو چلاتا ہوں اور اس میں عافیت سمجھتا ہوں۔

دوہری گھاٹ کے ایک جلسہ کا واقعہ

جس زمانہ میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں رہتے ہوئے بکثرت جلسوں میں شرکت رہی اس میں یہ پابندی رکھی کہ تعلیم کا نقصان نہیں ہونے دیا، رات بھر جلسہ کرتا اور صبح تعلیم کے وقت میں بہرحال مدرسہ پہونچ جاتا اور پوری بشاشت کے ساتھ درس دیا کرتا تھا، جب جلسوں میں جاتا تو مطالعہ کے لئے کچھ کتابیں ساتھ رکھ لیتا اور فرصت کے اوقات میں بس یا ٹرین میں آتے جاتے مطالعہ کرتا رہتا جس کی وجہ سے سفر سے واپسی پر مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور نہ ہی اسباق کے پڑھانے میں کوئی تکلیف ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ دوہری گھاٹ جو بڑھل گنج کے قریب ہے، وہاں کے ایک مدرسہ کے جلسہ میں جانا ہوا، عشاء کے وقت یہ خادم وہاں پہونچا، عشاء کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر جب جلسہ شروع ہوا تو منتظمین جلسہ سے میں نے یہ درخواست کی کہ میری تقریر سب سے پہلے کرالی جائے چونکہ مجھ کو رات ہی میں واپس ہونا ہے اور صبح پہونچ کر سبق پڑھانا ہے۔ چنانچہ ان حضرات نے یہ درخواست منظور کر لی، خادم جب

تقریر کے لئے بیٹھا تو پورا اسٹیج علماء ومشائخ سے بھرا ہوا تھا جس میں گورکھپور اور مئو کے بڑے بڑے حضرات علماء تھے، یہ خادم ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کر کے جب اسٹیج سے اترا اور منتظمین اعلان کرتے رہ گئے کہ بھائی ابھی جلسہ باقی ہے، ابھی بڑی بڑی شخصیات کے بیان ہونے ہیں، لیکن خادم کے وہاں سے نکلنے اور چلنے کے ساتھ آدھے سے زیادہ مجمع اس طرح سے نکل اور چل پڑا جیسے دوسروں کی تقریر سننے کی ان کو اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بہر حال یہ خادم روڈ پر آیا اور پوری رات سفر کر کے وایا جونپور صبح کے وقت مدرسہ پہونچ گیا اور حسب معمول سارے اسباق پڑھائے۔

یہ کمزوری خادم کی تقریروں میں اکثر دیکھنے کو ملی اور اس کا اظہار بھی درجنوں علماء نے کیا کہ آپ کی تقریر کے بعد جلسہ خراب ہو جاتا ہے، یعنی آپ کی تقریر سننے کے بعد لوگوں کو دوسرے علماء کی تقریریں اچھی نہیں لگتیں اور مزہ نہیں آتا، آپ کی تقریر وخطاب میں معنویت اور علوم ومعارف کے ساتھ جو تسلسل اور روانی ہوتی ہے وہ عام طور پر مقررین کی تقریروں میں نہیں ہوتی، اس لئے آپ کی تقریریں وخطابات جس توجہ و بیدار مغزی کے ساتھ لوگ سنتے ہیں وہ بیدار مغزی وتوجہ دوسرے مقررین اپنی طرف نہیں کھینچ پاتے ہیں، جس کی وجہ سے کرسی خطابت سے آپ کے اٹھنے کے بعد مجمع بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جب تک آپ تقریر کرتے ہیں آمد ورفت مکمل بند رہتی ہے، اور مجمع پر پورا سکوت اور یکسوئی طاری رہتی ہے، یہ بات اس خادم کے برادر اوسط بھی اکثر کہا کرتے تھے جس کو میں نے خود بھی اپنے کانوں سے سنا کہ ہمارے مفتی صاحب مقرر تو بڑے اچھے ہیں لیکن ان کی تقریروں میں ایک ہی خامی ہے کہ ان کی تقریر کے بعد کوئی مقرر ٹک نہیں پاتا ہے۔

بلرام پور ضلع گونڈہ کے جلسے کا واقعہ

اسی زمانہ میں جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم کا نمائندہ بن کر دور وقریب کے جلسوں میں شرکت کر رہا تھا، بعض مرتبہ بعض پروگراموں کے لئے سخت مجاہدات سے بھی گزرنا پڑا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چیونٹی جو ضلع اعظم گڑھ کا ایک گاؤں ہے جمعرات کے دن رات میں عشاء کے بعد وہاں کا پروگرام تھا۔ چنانچہ یہ خادم وہاں پہونچا، وہاں کے پروگرام میں مولانا افتخار احمد صاحب جگدیش پوری مولانا عبد العلی فاروقی لکھنؤ اور دوسرے حضرات بھی تھے، رات میں ایک بجے وہاں کا پروگرام ختم ہوا۔ اس پروگرام میں مولانا افتخار احمد صاحب جگدیش پوری نے ایک اپنے تجربہ کی بات بتائی، کہنے لگے مفتی صاحب اگر کسی جلسہ میں آپ جائیں اور جلسہ ختم ہونے کے بعد وہیں رات کا قیام ہو اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ صبح کا ناشتہ جلدی اور شاندار ملے تو رات کے پروگرام میں عورتوں کے محاسن کا تذکرہ اور ان کی دلجوئی وحوصلہ افزائی ضرور کریں، یہ بات مولانا نے اپنے تجربات کی روشنی میں کہی تھی جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

بہر حال چیونٹی کا جلسہ ختم کرنے کے بعد رات کو ایک بجے موٹر سائیکل سے ٹھکما گیا جہاں ڈاکٹر اسلام اللہ صاحب کا مکان تھا جن سے پرانی آشنائی تھی، حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب کے منتسبین میں سے تھے، ہر سال رمضان المبارک میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی اعتکاف میں بہت اہتمام سے آتے تھے مزاج کے اعتبار سے بہت نیک اور شریف تھے، ان کے مکان پر قیام کر کے صبح سویرے بذریعہ موٹر

سائیکل گوری نی پہونچا اور وہاں سے جمعہ سے پہلے شاہ گنج گیا اور شاہ گنج پہونچ کر حاجی غلام رسول صاحب کی مسجد میں معمول کے مطابق بیان کیا اور جمعہ پڑھایا۔

جمعہ کی نماز کے بعد فوراً شاہ گنج اسٹیشن پہونچا اور دہرہ دون ایکسپریس کے ذریعہ فیض آباد پہونچا اور فیض آباد سے بذریعہ بس بلرام پور پہونچا۔

جب جلسہ گاہ میں اس خادم کی حاضری ہوئی تو مدرسہ کے احاطہ میں جہاں جلسہ تھا کثیر تعداد میں مجمع بیٹھا ہوا مقرر کا منتظر تھا اور حضرات مقررین جمع غائب تھے، اشتہار میں مقررین میں حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی، حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی، حضرت مولانا سلمان حسنی ندوی کا نام تھا، لیکن ان حضرات میں سے کوئی صاحب بھی نہیں پہونچ سکے، منتظمین کا بہت برا حال تھا، مجمع کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا، اتنے میں یہ خادم وہاں پہونچ گیا، رات بھر اور دن بھر کے سفر کے تکان کے باوجود وہاں کے منتظمین نے منھ ہاتھ دھونے اور پانی پینے کی بھی اجازت نہیں دی اور سیدھے کرسی خطابت پر بیٹھا دیا، ڈھائی گھنٹہ تسلسل کے ساتھ اس خادم نے تقریر کی، جب جلسہ ختم ہوا تو تمام منتظمین نے دل کی گہرائیوں سے اس خادم کا شکریہ ادا کیا کہ مفتی صاحب آپ نے ہمارے جلسہ کی لاج رکھ لی ورنہ آج ہم لوگ منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

اس خادم کے خطابات سے بہت سے لوگوں کی دلچسپی

الحمد للہ، اللہ کا یہ خصوصی فضل شامل حال رہا کہ معنویت کے ساتھ مضامین

کا تسلسل اور برجستگی کے ساتھ الفاظ میں برجستگی وشائستگی خطابات میں من جانب اللہ ایسی رہی کہ کبھی بھی کوئی تقریر فیل نہیں ہوئی اور نہ ہی مجلس میں کبھی اکتاہٹ پیدا ہوئی، بلکہ بعض احباب کو تو اس خادم کے خطابات سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ دور دراز سے سفر کر کے خطاب سننے کے لئے آیا کرتے تھے، انھیں حضرات میں ایک نام غلام شرف الدین یحیٰ منیری عرف غلامن جو بھدوہی کے رہنے والے تھے جناب حاجی عبدالوحید صاحب کے صاحبزادہ تھے اور ایم، ایم مجید اینڈ برادرس ایک بڑے فرم کے مالک تھے، ان کی دلچسپی میرے خطابات سے اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اکثر بھدوہی میں خادم کو بلوا کر تقریریں کروایا کرتے تھے اور بہت شوق ودلچسپی سے سنتے تھے، یہی نہیں بلکہ بھدوہی کے پچاس ساٹھ کیلومیٹر کے گردونواح میں اگر کہیں اس خادم کی آمد ہوتی اور بیان ہوتا تو وہاں وہ ضرور پہونچتے تھے اور بہت دلچسپی سے بیان سنتے تھے اور اپنے احباب کی مجلس میں یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے مفتی صاحب کا جیسا بیان ہوتا ہے ویسا بیان کسی کا نہیں سنا، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہمارے مفتی صاحب کی نشست وبرخاست رفتار وگفتار بیان وخطاب کسی بھی چیز سے کبھی بھی ہلکی سی بھی کوئی ایسی جھلک نہیں آئی جس سے لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ ان کا آبائی وطن یوپی کے علاوہ کوئی دوسرا صوبہ ہے، یہ آپ کا خصوصی کمال ہے جو میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا، جو بات غلامن صاحب کہا کرتے تھے اس کی شہادت ہزاروں لوگوں کی زبان سے اس خادم نے سنی جن میں عوام وخواص علماء طلباء اپنے پرائے چھوٹے بڑے شہری دیہاتی امیر وغریب ہر قسم کے افراد تھے۔

مدرسہ ریاض العلوم میں مقالہ نویس اور انشاء پرداز کا فقدان

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا اس وقت وہاں جو مدرسین اور ملازمین موجود تھے ان میں نہ کوئی مقالہ نویس تھا نہ انشاء پرداز، کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مقالہ کس کو کہتے ہیں اور کیسے لکھا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی اشتہار یا ہینڈ بل کا مضمون بنانے اور لکھنے کے لائق تھا۔ چنانچہ یہ دونوں کام اس خادم کے پہونچنے کے بعد اس خادم کے سپرد ہونے لگا۔ چنانچہ جب تک مدرسہ ریاض العلوم میں یہ خادم رہا مدرسہ کا اشتہار اجمالی تعارف ھینڈ بل وغیرہ کے مضامین کی ترتیب اور لکھنا پڑھنا بحسن وخوبی انجام دیتا رہا، یہی نہیں بلکہ اساتذہ کی میٹنگوں کی کاروائی کا لکھنا بھی اسی خادم کے ذمہ ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ مدرسہ ریاض العلوم کے نائب ناظم میرے پاس آئے اور انھوں نے آ کر کہا کہ مفتی صاحب ہمارے مدرسہ کے شعبہ تعلیمات اور دیگر شعبوں کا کوئی دستور نہیں ہے اگر ان شعبوں کا اصول اور ضابطہ مرتب کر دیتے تو اس کی رہبری میں کام کرنا اور دوسروں سے کام لینا آسان ہوجاتا۔ چنانچہ چند روز میں اس خادم نے شعبہ تعلیمات، برقیات، دار الاقامہ، مطبخ وغیرہ اہم شعبوں کے دستور کو مرتب کر کے اور رجسٹر پر لکھ کر ان کو دے دیا، خادم کی وہ تحریر رجسٹروں میں آج بھی محفوظ ہے اس کو پڑھ کر اور دیکھ کر مدرسہ کے نائب ناظم انگشت بدنداں رہ گئے اور جی بھر کر خادم کی ذہانت اور ذکاوت کی مدح سرائی کی

اسی طرح حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے اسی زمانہ میں اسلامک فقہ

اکیڈمی کی بنیاد ڈالی اور مدرسہ ریاض العلوم کے دارالافتاء کو اکیڈمی کی طرف سے بھیجے جانے والے دقیق سوالات پر مشتمل لمبے سوالنامے آنے لگے، اس کے جوابات مقالہ کی شکل میں یہ خادم ہی لکھتا رہا اور جب تک مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں رہا مدرسہ کا نمائندہ بن کر سمیناروں میں یہ خادم ہی جاتا رہا، اس خادم کے علاوہ مدرسہ کے مدرسین وملازمین میں سے کسی میں اس کی اہلیت وصلاحیت نہیں تھی کہ وہ مقالہ لکھ سکے اور سمیناروں میں شرکت کرسکے۔

اسی طرح ادارۃ المباحث الفقہیہ کی طرف سے بھی سوالات آتے تھے اس کے جوابات بھی بشکل مقالہ یہ خادم ہی لکھتا رہا اور ادارۃ المباحث الفقہیہ کی طرف سے منعقدہ اجتماعات میں شرکت بھی کرتا رہا اور بہت سارے مقالات تحقیقات فقہیہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں اور حضرات علماء ومفتیان کرام کے ہاتھوں میں پہونچ کر خراج تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں۔

تصنیف وتالیف کا فقدان

مدرسہ ریاض العلوم میں جس طرح کوئی مقالہ نویس اور انشاء پرداز نہیں تھا اسی طرح تصنیف وتالیف کا مزاج رکھنے والا اور یہ عظیم خدمت انجام دینے والا بھی کوئی نہیں تھا، اس عظیم خدمت کی سعادت بھی اس خادم ہی کو حاصل ہوئی، وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے اپنے گھر پر اس خادم کو بلایا جب میں گھر پر پہونچا تو وہاں ضلع فیض آباد کے قصبہ جلالپور کے چند تجار بیٹھے ہوئے تھے(۱) حاجی محی الدین

صاحب (۲) حاجی محمد تعریف صاحب (۳) حاجی محمد حسن صاحب۔

حضرت مولانا نے ان تینوں مہمانوں کا تعارف کرایا اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ ہمارے دوست ہیں، جلالپور کے رہنے والے ہیں یہ بتا رہے ہیں کہ کل جمعہ میں مدرسہ کرامتیہ جلال پور کے صدر مدرس مولانا ضمیر احمد صاحب نے جمعہ سے پہلے تقریر کی جس میں انھوں نے یہ حدیث پڑھی ''**من صام یوم الشک فقد عصی ابا القاسم**''، یعنی اگر ۲۹ شعبان کو مطلع صاف نہ ہو غبار آلود یا ابر آلود ہو جس کی وجہ سے چاند نظر نہ آسکے تو شعبان کی تیسویں تاریخ جس کو یوم الشک کہا جاتا ہے ہر ایک کے لئے اس کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ لہٰذا آپ اس مسئلہ پر کوئی رسالہ لکھ دیجئے ہمارے یہ احباب اس کو شائع کر کے جلالپور میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت کے حکم پر میں نے ہاں تو کہہ دیا لیکن چونکہ تصنیف و تالیف کا کام اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اس کے ساتھ مختلف فنون کی تدریس کے ساتھ افتاء کی بھی ذمہ داری تھی، اس لئے اس کام کو انجام تک پہونچانے میں دقت و دشواری بہت پیش آئی، لیکن حضرت سے چونکہ اس خادم نے وعدہ کر لیا تھا اس لئے اللہ کا نام لے کر اس سے متعلق جزئیات کی جستجو اور کتابوں کی مراجعت کے ساتھ اس مسئلہ سے متعلق مالہ و ماعلیہ کی ترتیب وتبویب میں لگ گیا اور الحمد للہ ایک مہینہ کی کاوش کے بعد ''احکام یوم الشک'' کے نام سے کتاب مرتب ہوگئی جو اس خادم کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی اور حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر خادم نے پوری کتاب سنائی۔ حضرت نے بے حد پسند فرمایا، دعاؤں کے ساتھ حوصلہ افزائی فرمائی اور اس پر تقریظ لکھ کر اس کی تائید وتصدیق فرمائی

اوراس کی کتابت کاحکم دے کرطبع کروا کر جلال پور کے ان تجار کو بلا کر خادم کی موجودگی میں خادم کی تحسین فرماتے ہوئے احکام یوم الشک نامی کتاب ان کے سپرد کیا کہ لیجئے حاجی صاحب ہمارے مفتی صاحب نے یوم الشک کے متعلق تمام گوشوں پر مکمل و مدلل گفتگو پر مشتمل کتاب لکھ ڈالی، اب اس کو لے کر آپ جلاپور میں تقسیم کردیں۔ اس طرح احکام یوم الشک مدرسہ ریاض العلوم سے شائع ہونے والی پہلی کتاب تھی جو وجود میں آئی اوراس نے مدرسہ ریاض العلوم کے شعبہ تصنیف وتالیف کو زندہ اور قائم کردیا اوراس طرح اس کتاب کے ذریعہ عوام وخواص میں یہ چرچا ہونے لگا کہ ریاض العلوم میں افتاء کے کام کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی کام شروع ہوگیا ہے۔

اسی طرح کچھ دنوں کے بعد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے خادم کو بلا کر ایک سوالنامہ دیا جس کا سائل شہر جونپور کے ملاٹولہ کے ایک صاحب تھے جس میں بنگلہ دیش کے ایک مشہور عالم دین حضرت مولانا فیض اللہ صاحب کے حوالہ سے یہ بات منقول تھی کہ انہوں نے فرائض کے بعد اجتماعی دعاء کو کتابوں کے حوالہ سے بدعت سیئہ اور واجب الترک قرار دیا ہے اوراس کی وجہ سے بنگلہ دیش میں بڑا فتنہ برپا ہے، لہٰذا اس کے جواب میں کوئی آپ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں لکھیں جس کو ہمارے یہ احباب شائع کرکے بنگلہ دیش میں تقسیم کرسکیں اور اس فتنہ کی سرکوبی ہوسکے۔ چنانچہ حضرت مولانا کے حکم پر اس موضوع پر بھی کام شروع کیا اورایک مہینہ میں افتاء اور تدریس کے مشاغل کے ساتھ اس رسالہ کو بھی مکمل کرکے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ حضرت کو جب یہ کتاب سنایا تو حضرت نے بہت پسند فرمایا

اور بہت دعائیں دیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے اس کی اشاعت اور طباعت کا حکم دیا۔ چنانچہ "**المساعی المشکورہ فی الدعاء بعد المکتوبہ**" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوکر ملاٹولہ پہونچی اور وہاں سے بنگلہ دیش پہونچ کر تقسیم ہوئی اس کے ساتھ ہندوستان کے اکابرین کے ہاتھوں میں بھی یہ کتاب پہونچی۔

جب حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی خدمت میں یہ کتاب پہونچی تو حضرت نے بھی اس کتاب اور اس میں موجود مضامین کی تائید فرمائی، البتہ نام کے سلسلہ میں فرمایا کہ اس کتاب کا نام **المساعی المشکورہ** کے بجائے **المساعی المخطوبہ فی الدعاء بعد المکتوبہ** رکھتے تو اچھا تھا، لیکن چونکہ یہ کتاب اسی نام سے شائع ہوچکی تھی اس لئے اس کا تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس زمانہ میں چونکہ یہ خادم جواں سال تھا قلم میں بھی توانائی تھی، نیز حضرت مولانا فیض اللہ صاحب سے ذاتی کوئی واقفیت نہیں تھی، اور نہ ہی کسی نے تعارف کرایا، اس لئے کتاب میں ان کا ذکر جہاں آیا اگر چہ کوئی گستاخی کا جملہ تو نہیں لکھا گیا لیکن جو ادب واحترام ایک بزرگ کا ہونا چاہئے تھا اس کا فقدان تھا، اس لئے جب حضرت مولانا یونس صاحب جونپوری شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے ملاقات ہوئی تو چونکہ وہ بھی اس کتاب کو پڑھ چکے تھے اس لئے انہوں نے یہ فرمایا کہ مفتی صاحب مولانا فیض اللہ صاحب بنگلہ دیش کے بڑے علماء میں سے ہیں اور جیسا کہ یاد آتا ہے کہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ شیخ الہند کے تلامذہ میں سے ہیں، اس لئے قلم کو سنبھال کر چلانا چاہئے تھا، میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ حضرت میں ان کے سلسلے

میں واقف نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے تعارف کرایا، اس لئے تحریر کا انداز وہ رہا جو آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن **دعاء بعد المکتوبہ** کے سلسلہ میں خادم نے جو کچھ لکھا تھا اس کے بارے میں حضرت مولانا یونس صاحب نے کچھ نہیں فرمایا۔

اسی طرح جب حضرت مولانا حج کے لئے تشریف لے گئے تو ان کے ذریعہ یہ کتاب شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خدمت میں بھی پہونچی، حضرت نے پوری کتاب بیت اللہ کے مطاف میں سنی اور پوری کتاب سننے کے بعد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ تمہارے شاگرد کی پوری کتاب میں نے مطاف میں سن لی ہے، بہت اچھا لکھا ہے اور بذل المجہود کا حوالہ مولانا فیض اللہ صاحب نے جو دیا ہے اس سے متعلق کچھ لکھنے کو میں نے مولانا عاشق الٰہی بلندشہری سے کہہ دیا ہے، وہ تحریر ان سے لے لیں۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے وہ تحریر ان سے لی اور حج سے واپسی پر اس خادم کے سپرد فرمایا اور حضرت شیخ کے اس جملہ پر بہت مسرور ہوئے کہ تمہارے شاگرد کی کتاب میں نے سن لی۔

چنانچہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے مکہ مکرمہ سے ہندوستان اپنے برخورداروں کو خط لکھا اور اس میں اظہار مسرت کے طور پر یہ بھی لکھا کہ ابھی تک تو مدرسہ مظاہر علوم کے شیخ الحدیث مولانا یونس صاحب ہی کو لوگ میرا شاگرد کہتے تھے، جبکہ وہ میرے شاگرد بھی نہیں ہیں، بلکہ اصل شاگرد مولانا ضیاء الحق صاحب برہی فیض آبادی کے ہیں اور میرے لئے خوشی کی بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے سامنے مطاف میں بیٹھ کر حضرت شیخ نے "**المساعی المشکورہ فی الدعاء**

بعد المکتوبہ'' پوری کتاب سنی اور مجھ کو بلا کر یہ فرمایا کہ عبدالحلیم میں نے تمہارے شاگرد کی پوری کتاب مطاف میں سن لی، بہت اچھا لکھا ہے جبکہ مفتی صاحب میرے شاگرد بھی نہیں ہیں۔ اس طرح مولانا یونس صاحب کے بعد دوسرے شاگرد مفتی صاحب مجھ کو مل گئے۔

حج کے لئے آتے ہوئے تم لوگوں نے مفتی صاحب کو میرا بیٹا اور اپنا بھائی بنا لیا تھا اور یہاں آ کر حضرت شیخ نے شاگرد بنا دیا۔اس طرح اس سفر میں دو خوشی حاصل ہوئی۔ بیٹا اور بھائی بننے کا واقعہ انشاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گا۔حضرت مولانا کا یہ خط جب ہندوستان پہونچا تو مدرسہ کے نائب ناظم نے اس خادم کو بلا کر پڑھ کر سنایا، اب پتہ نہیں والد بزرگوار کی لکھی ہوئی یہ تحریر ان کے ذہن میں ہے یا بھلا چکے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کے بعد تیسری کتاب اس خادم کی سلام ومصافحہ کے موضوع پر ''احب الکلام فی مسئلۃ السلام'' بنام سلام کی اہمیت وحیثیت وجود میں آئی، جب اس کے مضامین کو اس خادم نے حضرت مولانا کو سنایا جو سلام کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب تھی تو اس کو بھی حضرت نے بہت پسند فرمایا اور تقریظ لکھوا کر اس کی تصدیق وتائید فرمائی، یہ کتاب بھی مدرسہ ریاض العلوم میں رہتے ہوئے حضرت کے حکم وایماء پر شائع ہوئی اور عوام وخواص تک پہونچی۔

اس طرح مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے شعبہ تصنیف وتالیف سے اس خادم کی یہ تیسری کتاب تھی جس نے مدرسہ کے اس شعبہ کی بھرپور نمائندگی کی۔

اس کتاب کو ہندوستان کے اکابرین اور علماء نے بہت پسند کیا، بالخصوص حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دار العلوم دیوبند نے پانچ سونسخہ منگوایا اور کئی جلسوں میں اسی موضوع پر تقریر فرمایا اوراس کوخریدنے کی ترغیب دی اور بہت سے تبلیغی سفر میں اس کتاب کواپنے ساتھ رکھااوراس کی خوب تشہیر کی۔

نیل الفرقدین اورالتوسل کی تالیف کے محرکات

حضرت مولاناعبدالحلیم صاحب بنارس میں چندروز کے لئے قیام پذیر تھے،اسی درمیان اچانک کسی ضرورت سے اس خادم کابھی بنارس جانا ہوا،میرا قیام حاجی یحیٰ صاحب کے مکان پر مالتی باغ میں تھا اور حضرت مولانا کا قیام حاجی رحمت اللہ صاحب کے ایک عزیز کے مکان پر تھا۔حضرت کی ملاقات کے لئے مغرب سے قبل پہونچا،مغرب کے بعد حاجی رحمت اللہ صاحب،حضرت مولانا کی ملاقات کے لئے آئے دوران ملاقات انہوں نے حافظ عبدالمومن جوناگڑھی کی کتاب حدیث خیر وشر حضرت مولانا کوپیش کیا،حضرت مولانا نے ایک سرسری نظر ڈالی اس کے بعد حاجی رحمت اللہ صاحب نے حضرت سے کہا کہ حضرت اس کتاب نے بنارس میں بہت شر پھیلا رکھا ہے،خاص طور پر ایک ہاتھ سے مصافحہ اورتوسل کے مسئلہ پر۔اس کتاب کے حوالے سے غیر مقلدین بہت زیادہ شر پھیلا رہے ہیں اور دیوبندی عقائد کے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں،اگر دو ہاتھ سے مصافحہ کی سنت اورتوسل کے موضوع پر کوئی کتاب لکھ دی جاتی تو میں اس کوخود شائع کروا کر بنارس میں تقسیم

کرواتا۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا نے فرمایا کہ میرے مدرسہ میں تو کوئی لکھنے پڑھنے والا ہے نہیں یہی ایک مفتی صاحب ہیں جن کو لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے، انہی سے آپ درخواست کریں، اگر یہ منظور کرلیں تو یہ کام یہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت کے یہ کہنے پر حاجی رحمت اللہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ اس موضوع پر ضرور کام کریں، میں اس کو شائع کرواؤں گا اور بنارس میں ضرور تقسیم کراؤں گا، حضرت مولانا نے حاجی صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے تائید فرمادی، حضرت کا حکم سمجھ کر مدرسہ واپسی کے بعد اس خادم نے دونوں موضوع پر کام کرنا شروع کردیا، کافی عرق ریزی کے بعد دو ہاتھ سے مسنونیت اور توسل کے موضوع پر کتاب تیار ہوگئی جب حضرت مولانا کو سنایا تو بہت پسند فرمایا، چونکہ یہ دونوں موضوع ایسا تھا کہ اس پر کوئی اور رسالہ اپنے اسلاف کا نہیں مل سکا جس کی وجہ سے مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب وتبویب اور تفہیم وتشریح میں کافی دقت اٹھانی پڑی، کتاب مکمل کرنے کے بعد جب بنارس حاجی رحمت اللہ صاحب کے یہاں لے کر پہونچا اور ان سے ان کا کیا ہوا وعدہ یاد دلایا کہ آپ نے کہا تھا کہ میں اس کو شائع کراکے بنارس میں تقسیم کروں گا تو اب یہ کتاب تیار ہے اسے شائع کرواکر تقسیم کرادیں، اس پر انھوں نے صاف انکار کردیا ان کے صاف انکار سے بہت دکھ اور قلق ہوا اور اس خادم کے دل ودماغ میں ان کا اعتماد بہت مجروح ہوا اور اس کے بعد ان کے یہاں آمدورفت اور رابطہ مکمل بند کردیا۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں کسی دوسرے ذرائع سے مدرسہ ریاض العلوم ہی میں رہتے ہوئے شائع ہوئیں اور مقبول ہوئیں۔ اس طرح ریاض العلوم میں رہتے ہوئے اس خادم کی پانچ کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ریاض العلوم کے شعبۂ تصنیف

وتالیف کی اچھی نمائندگی ہوئی۔

۱۹۸۲ء میں حضرت مولانا کا اس خادم کے لئے اعلان

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں رہتے ہوئے جب اس خادم کو ایک سال ہوگئے اور مجھ کو اور میری صلاحیتوں کو حضرت مولانا نے بہت قریب سے دیکھ لیا تو ۱۹۸۲ء میں سفر حج کے لئے روانگی کے وقت جب حضرت مولانا کے مکان پر سیکڑوں کا ہجوم تھا جس میں طلباء اساتذہ کے علاوہ دور وقریب کے مہمان اور خواص بھی تھے، جو حضرت مولانا سے ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے، اس مجمع میں یہ خادم بھی تھا، حضرت نے آخری دعاء فرمائی، سب سے سلام ومصافحہ کیا اور گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے اونچی جگہ پر کھڑے ہوکر مجمع عام میں یہ اعلان فرمایا جس کو پورے مجمع نے سنا کہ مفتی صاحب آپ کو یہ مدرسہ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا ہے اور ہرگز نہیں جانا ہے، یہیں رہنا ہے یہیں رہنا ہے۔ یہیں رہنا ہے۔ یہ اعلان سن کر پورا مجمع حیران رہ گیا، اس کے بعد سفر حج کے لئے حضرت مولانا روانہ ہوگئے، بنارس تک جو حضرات حضرت مولانا کو پہونچانے کے لئے گئے، ان میں یہ خادم بھی تھا جونپور پہونچ کر وہاں سے بذریعہ بس بنارس جانا ہوا اور بنارس سے بذریعہ مہانگری ایکسپریس بمبئی جانا تھا، جس سیٹ پر حضرت مولانا تشریف فرما تھے آپ کے بائیں طرف والی سیٹ پر مدرسہ کے نائب ناظم بیٹھے ہوئے تھے، دونوں حضرات راستہ میں کچھ گفتگو کرتے ہوئے جارہے تھے،

یہ خادم حضرت کی سیٹ سے دوسیٹ پیچھے بیٹھا ہوا تھا، بنارس اسٹیشن پہونچ کر بڑی سی چادر فرش پر بچھا دی گئی، اسی چادر پر حضرت مولانا اور پہونچانے والے تمام حضرات بیٹھ گئے، وہاں موجود لوگوں میں نندا ؤں ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ایک حاجی قاسم صاحب بھی تھے، جن کی میری نقل وحرکت اور نشست و برخواست اور گفتگو پر بہت گہری نظر تھی، لیکن مجھ کوانھوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس لئے حضرت مولانا سے انہوں نے میرے بارے میں سوال کیا کہ حضرت یہ کون صاحب ہیں؟ حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ ہمارے مدرسہ کے مفتی صاحب ہیں جو مدرس کے ساتھ افتاء کا کام دیکھتے ہیں اور ماشاء اللہ بہت اچھی صلاحیت کے مالک ہیں اور اس کے بعد فرمایا کہ میرے بچوں سے بہت مانوس ہیں اور بچے بھی ان سے بہت قریب اور مانوس ہیں اور جونپور سے بنارس آتے ہوئے بس میں مجھ سے عبدالرحیم نے کہا کہ ابا آپ کے اعلان کے بعد میں نے مفتی صاحب کو یہ کہہ دیا ہے کہ ہم لوگ چھ بھائی ہیں، ساتویں نمبر پر حافظ عمر صاحب ہیں جو اگر چہ بہنوئی ہیں لیکن ان کا برتاؤ اور فیملی ممبر ہونے کی وجہ سے وہ بھی بھائی کے درجہ میں ہیں اور آٹھویں نمبر پر بھائیوں میں حاجی عبدالحق صاحب ہیں جو بستی کے رہنے والے ہیں جن کی ٹال اور لکڑی کی آرہ مشین کھیتا سرائے میں ہے، ان کے والد کا جب انتقال ہورہا تھا تو انہوں نے عبدالحق کو یہ کہہ کر ابا کے سپرد کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ابا کے ہاتھ میں پکڑا دیا کہ حضرت یہ آج سے آپ کا بیٹا ہے۔ اس طرح وہ بھائیوں میں آٹھویں نمبر پر ہیں اور آج ابا کے اعلان کے بعد آپ کا شمار بھی ہم بھائیوں میں ہوگیا ہے اور آپ کا نمبر نو ہے، آپ اپنا رجسٹریشن نمبر یاد رکھئے گا، آج

سے آپ بھی ہمارے بھائی ہوگئے۔ اب آپ کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، کہیں نہیں جانا ہے، اگر کوئی آپ کو نکالے بھی تو آپ کے لئے یہاں سے نکلنا اور اس جگہ کو چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ حضرت مولانا حاجی قاسم صاحب کو سنا کر خاموش ہوگئے اور حاجی قاسم صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بھی حضرت کے لڑکے کے درجہ میں ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ تک ہم لوگ بھائی کی طرح سے ایک دوسرے سے مربوط رہے اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے رہے اور بہت خوش اسلوبی کے ساتھ سارا نظام چلتا رہا اور آپس کا اعتماد بڑھتا رہا۔

یہاں تک کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ مطبخ کے ناظم حافظ علی حسن صاحب کے ساتھ جو لکھیم پور کے رہنے والے تھے ایسا دردناک حادثہ پیش آیا جس کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بات تھانہ پولیس تک کے پہونچ گئی۔ بات اتنی خراب ہوئی کہ مدرسہ کے نائب ناظم کو چند روز کے لئے مدرسہ چھوڑ کر روپوش ہونا پڑا۔ چنانچہ روپوشی سے پہلے نائب ناظم نے مجھ کو ایک کمرے میں بلایا اور تنہائی میں یہ کہا کہ منشی علی حسن صاحب کے واقعہ کو لے کر کچھ قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں ہیں اور کھیتا سرائے کا داروغہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے، اس لئے چند دنوں کے لئے میں روپوش ہو رہا ہوں اور مدرسہ کلی طور پر آپ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں، اس کے کلیات و جزئیات کی دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے۔ چنانچہ ان کے غائبانہ میں کئی روز تک پوری بیدار مغزی کے ساتھ مدرسہ کو سنبھالتا رہا اور کسی طرح کی کوئی آنچ نہیں آنے دی، اگرچہ داروغہ کو اس کی خبر لگ گئی تھی کہ نائب ناظم کی روپوشی کی خبر مفتی حبیب اللہ نامی شخص کو ہے، لیکن

اللہ کا کرم ہوا کہ اس دوران اس نے مجھ کو کبھی چھ نہیں کیا، مدرسہ آتا جاتا رہا لیکن مجھ کو بلا کر کبھی کوئی بات نہیں پوچھی، جب حالات معتدل ہو گئے تو نائب ناظم اپنے منصب پر واپس آ گئے۔

برادران میں شمولیت کی خبر دھیرے دھیرے کچھ لوگوں کو معلوم ہو گئی، چنانچہ بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ارے بھائی مفتی صاحب کی کیا بات ہے ان کا تو مدرسہ ریاض العلوم میں کھونٹا گڑ گیا ہے، ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد نائب صاحب والد محترم کی وصیت اور اعلان سب کچھ بھلا بیٹھے اور درپئے آزار واخراج ہو گئے، لیکن یہ اچھا ہوا کہ بندوق کی نال اور بندوق کی نوک پر نکلنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ وقت موعود سے پہلے عزت کے ساتھ مدرسہ ریاض العلوم کو ہمیشہ کے لئے اس خادم نے خیر باد کہہ دیا۔

مدرسہ ریاض العلوم کی بعض اصطلاحات کی اصلاح

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا تو وہاں کی بعض اصطلاحات محاورات اور بولی اور سمجھی جانے والی زبانیں میرے نزدیک قابل اصلاح تھیں جن کی میں نے اصلاح کی اور کچھ ہی دنوں میں طلباء و اساتذہ و ملازمین اور واردین وصادرین نے اس اصلاح کو قبول کیا اور اصلاح شدہ الفاظ ان کی زبان پر جاری ہو گئے جس کا موجد، مصلح محرک، یہ خادم بنا۔

۱- حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کو وہاں کے پرانے لوگ بڑے مولانا یا بڑے مولوی صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے اور پکارتے تھے اور یہی الفاظ مدرسہ میں رائج تھے لیکن اس خادم نے حضرت کے نام سے حضرت مولانا کو ملقب کیا اور طلباء اساتذہ میں اس کو رائج کیا اور کرایا۔

چنانچہ کچھ عرصہ کی محنت کے بعد طلباء اساتذہ ملازمین اور واردین وصادرین کی زبان پر یہ قابل تحسین اور مہذب لفظ یعنی حضرت کا لفظ رائج ہو گیا اور بڑے مولانا و بڑے مولوی صاحب کے لفظ کا استعمال ختم ہو گیا۔

(۲) مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے صدر مدرس کو وہاں کے لوگ مولانا صاحب یا مولوی صاحب کے نام سے پکارتے تھے اور اس کے ساتھ موصوف کا نام بھی شامل کرتے تھے، خادم نے وہاں پہونچنے کے بعد ان کو صدر صاحب کے لقب سے ملقب کیا اور طلباء اساتذہ وملازمین میں اس کو رائج کیا۔

چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ صدر صاحب کے لقب سے موسوم ہو کر مشہور ہو گئے اور بکثرت اس کا استعمال ہونے لگا۔

(۳) مدرسہ ریاض العلوم کے نائب ناظم کو وہاں کے موجود طلباء اساتذہ ملازمین نائب ناظم یا نائب صاحب یا نام لے کر پکارتے تھے۔

لیکن اس خادم نے سب سے پہلے ان کو ناظم صاحب کہنا شروع کیا اور پوری کے ساتھ طلباء اساتذہ میں اس لفظ کو رائج کیا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد

سبھی حضرات ان کو ناظم صاحب کہنے لگے اور اسی نام سے وہ معروف ومشہور ہو گئے، جس کا موجد اول یہ خادم تھا۔

بلکہ اخیر تک بارہا ایسا ہوا کہ جب کبھی حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے سامنے نائب ناظم کی کسی بات کا تذکرہ اس خادم نے ناظم صاحب کے نام سے کیا تو حضرت مولانا جھنجھلا گئے اور فرمایا کون ناظم صاحب؟ اس مدرسہ کا ناظم تو میں ہوں۔

چنانچہ حضرت مولانا اخیر عمر تک ضروری کاغذات پر اپنے قلم سے دستخط کرنے کے بعد ناظم مدرسہ ریاض العلوم گورینی لکھتے رہے تاکہ لوگوں کو یہ احساس رہے کہ حضرت مولانا نے اس منصب کو چھوڑا نہیں ہے اور عرفی ناظم نائب ناظم ہی ہیں، ناظم نہیں۔

(۴) اسی طرح مدرسہ ریاض العلوم کے مشرقی جانب جب کمروں کی تعمیر کی تکمیل ہوئی اور مدرسہ کا ایک بڑا گیٹ بنا تو مدرسہ کے لوگوں میں یہ یہ چرچہ شروع ہوا کہ اس گیٹ کا نام کیا رکھا جائے؟ چنانچہ سب سے پہلے اس خادم ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس گیٹ کا نام باب حلیم رکھا جائے اور اس گیٹ کو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی طرف منسوب کیا جائے اور اس فیصلہ پر یہ خادم اس قدر مصر ہوا کہ مجبوراً مدرسہ کے ذمہ داروں کو اس خادم کی یہ تجویز ماننی پڑی اور گیٹ پر باب حلیم کا پتھر لگانا پڑا۔ اس طرح یہ گیٹ باب حلیم سے موسوم ہوا اور آج بھی ہے۔

(۵) اسی طرح جب مدرسہ ریاض العلوم میں پہلی مرتبہ دورہ حدیث کا آغاز ہوا اور طلباء دورہ حدیث سے فارغ ہوئے تو یہ مسئلہ زیر گفتگو آیا کہ یہاں کے فضلاء کو

کونسی نسبت دی جائے اس موقعہ پر بھی اس خادم نے یہ تجویز رکھی کہ یہاں کے فضلاء اپنے کو حلیمی لکھیں، چونکہ کسی بھی ادارے کے فضلاء کی نسبت ادارہ کی طرف نہیں ہوتی بلکہ بانی کی طرف ہوتی ہے جیسے قاسمی اس میں نسبت حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی طرف ہے جو دارالعلوم دیو بند کے بانی محترم تھے۔

چنانچہ اس خادم کی یہ تجویز بھی وہاں کے ذمہ داروں کو بادل خواستہ و ناخواستہ منظور کرنی پڑی، لیکن چونکہ طلباء اس خادم سے مانوس اور قریب تھے، اس لئے میں نے تاکیداً ان سے کہا کہ وہ اپنے نام کے آگے حلیمی لکھیں۔ چنانچہ ایک ہی دوسال میں اس خادم کی اس تجویز میں پختگی پیدا ہوگئی اور فضلاء یہی نسبت لکھنے لگے اور کسی دوسرے نام یا نسبت پر وہ راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ آج تک یہی نسبت رائج اور باقی ہے، اگرچہ یہ خادم وہاں باقی نہیں رہا لیکن خادم کی تجویز کردہ اصطلاحات خادم کو زندہ جاوید کئے ہوئے ہیں۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم پہونچا تو چند ماہ کے بعد حضرت مولانا نے مدرسہ کے مدرسین و ملازمین کی آل میٹنگ کال کی جس میں مدرسہ کے تمام مدرسین و ملازمین اور بالخصوص مانی کلاس سے آئے ہوئے پرانے حضرات شریک ہوئے اور اس میٹنگ میں حضرت مولانا نے پورے گھن گرج اور غیض و غضب کے لہجہ میں تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ جس کو میں نے نائب ناظم بنایا ہے اگر وہ اور اس کا کام آپ لوگوں کو پسند نہ ہو تو آپ لوگ اپنی مرضی سے کسی کو نائب ناظم بنا سکتے ہیں، اس کے بعد

پورے مجمع پر سکتہ اور سناٹا طاری تھا کسی کو کچھ بولنے یا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی، دیر تک یہی ماحول باقی رہا، بالآخر اس خادم نے ہمت کر کے بات شروع کی اور موجودہ نائب ناظم کی پذیرائی کی اور ان کی اور ان کے کام کی جی بھر کر تحسین کی چونکہ یہ خادم وہاں کا نو وارد تھا، وہاں کے ماحول اور پرانے افراد کے مزاج سے آشنا اور واقف نہیں تھا اور نہ ہی ان کی سوچ سے واقف تھا اور نہ ہی حضرت مولانا کی اس گفتگو کی شان نزول وورد سے واقف تھا اس لئے میری گفتگو کے مکمل ہونے کے بعد مجلس برخواست ہوگئی، لیکن بعد میں میرے قریبی دوست نے بتلایا کہ آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ حضرت مولانا کی گفتگو کے مخاطب وہ پرانے حضرات تھے جو اس مجلس میں موجود تھے۔ حضرت مولانا انہیں سے بلوانا چاہ رہے تھے، اس لئے کہ موجودہ نائب ناظم اور ان کے کام کاج سے جو حضرات ناخوش وغیر مطمئن ہیں وہ وہاں موجود تھے، لیکن آپ نے اپنی گفتگو کے ذریعہ والد محترم کے سارے غیض وغضب کو ٹھنڈا کر دیا اور اچھے ماحول میں مجلس برخاست کروادی۔ یہ خادم جب تک رہا پوری اپنائیت اخوت کے ساتھ نائب ناظم کا معاون بن کر رہا اور تدریس کے علاوہ انتظامی امور میں ان کا بھرپور تعاون کرتا رہا اور اپنا بڑا بھائی سمجھ کر دل سے احترام کرتا رہا اور کبھی بھی ان کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا بلکہ اگر اندر یا باہر کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو پوری قوت کے ساتھ اس کا دفاع کیا اور ان کے کندھے پر آنے والے ہر بوجھ کو ہلکا کیا۔ لیکن کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ جس کو بڑا بھائی سمجھا وہ دوسروں کے اکسانے اور بہکانے پر چھوٹے بھائی کا دشمن بن جائے گا اور اتنا وہ تنگ کرے گا کہ وہ اپنا بوریا بستر ا باندھنے پر مجبور

ہوجائے گا اور افسوس کے ساتھ یہ شعر پڑھنے لگے گا ۔

كنا كند مانى جذيمة حقبة

من الدهر هو حتى قيل لن يتصدعا

فلما تفوقنا كانى ومالكا

لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

لیکن خیر کی بات یہ رہی کہ بڑے بھائی کو بندوق کا سہارا نہیں لینا پڑا، اس کے بغیر اور اس سے پہلے ہی ہمیشہ کے لئے اس نے اس سرزمین کو الوداع کہہ دیا ۔

ہرگز نمیرد انکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

مدرسہ ریاض العلوم کا امتحان ششماہی

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا اور ششماہی امتحان کا وقت آیا تو اس وقت تک امتحان کا معمول یہ تھا کہ اساتذہ اپنے کمروں سے مفوضہ کتب ممتحنہ کا سوالنامہ تحریر کر کے مسجد (امتحان گاہ) میں آتے، امتحان گاہ میں جب طلباء جمع ہو جاتے تو ممتحن بیٹھ کر پہلے سوالنامہ طلباء کو لکھواتا اس کے بعد طلباء اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر جوابات لکھتے تھے۔

جب پہلی مرتبہ ششماہی امتحان کے لئے امتحان گاہ میں حاضری ہوئی تو اس

خادم نے دیکھا کہ ممتحن سوالنامہ لکھوا رہا ہے اور طلباء آپس میں ایک دوسرے سے بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے جواب حل کر رہے ہیں اور سوال میں مذکور باتوں کا استفسار اور جواب کا سلسلہ جاری ہے، یہ منظر دیکھ کر اس خادم کو بڑی حیرت ہوئی اور یہ طے کرلیا کہ سالانہ امتحان اس طرح نہیں ہوگا۔ بلکہ اس نہج پر ہوگا جو دارالعلوم دیوبند میں رائج ہے۔

چنانچہ جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو ذمہ داروں نے اس خادم کو ناظم امتحان طے کیا اس کے بعد اس خادم نے محنت کی اور سالانہ امتحان مکمل دار العلوم دیوبند کے نہج پر کردیا، اس کے بعد سے آج تک وہی نہج قائم ہے، پرانا نہج پھر عود کر نہیں آیا، لیکن اس نہج کو تبدیل کرنے کا تحفہ اس خادم کو مدرسہ کی طرف سے یہ ملا کہ حوصلہ اور ہمت افزائی کے بجائے جب تک یہ خادم وہاں رہا ششماہی وسالانہ امتحان کا ناظم خادم ہی کو بننا پڑا، جب جب امتحان کی میٹنگ ہوئی تو اساتذہ نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اس خادم کا نام پیش کرنا شروع کردیا اور بلا مقابلہ ہر امتحان میں امتحان کی نظامت اس خادم کے سر آنے لگی، نوبت بایں جا رسید سالوں سال یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ جب میں تھک گیا اور دل چاہا کہ دوسرے اساتذہ بھی اس کام کو سیکھیں اور کریں تو کوئی بھی استاد اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

بلکہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امتحان کی میٹنگ میں اس خادم نے ناظم امتحان بننے سے معذرت کردیا تو نائب ناظم نے بہت غصہ اور تلخ لہجہ میں امتحان کی کارکردگی لکھنے والے محرر کو مخاطب کرکے یہ کہا کہ لکھو جی اس کا نام لکھو امتحان کا کام اسی کو کرنا پڑے گا، لب ولہجہ اتنا تلخ تھا کہ یہ خادم برداشت نہیں کرپایا، سوچا کہ پوری صورتحال سے حضرت مولانا

عبدالحلیم صاحب کو واقف کرادوں، لیکن برادر اوسط کی نصیحت اس سے مانع بن گئی۔

خادم کے برادر اوسط جو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی خدمت میں ایک زمانہ تک رہے اور حضرت شیخ کا جب جب ہندوستان کا سفر ہوا وہ بھی ہندوستان آئے اور جب ہندوستان آئے تو گھر بھی چند مہینوں کے لئے آنا ہوتا اور جب وطن آتے تو اکثر ہر سفر میں اس خادم کی ملاقات کے لئے مدرسہ ریاض العلوم گورینی بھی آتے تھے، ایک مرتبہ آنے کے بعد واپس جا رہے تھے، خادم ان کو پہونچانے کے لئے شاہ گنج اسٹیشن تک گیا، اسٹیشن پر روانگی سے پہلے انہوں نے بہت اہتمام کے ساتھ مجھ کو مخاطب کر کے ایک نصیحت کی، کہنے لگے کہ صاحبزادگان کی طرف سے کوئی بھی اذیت اگر تم کو پہونچے تو اس پر صبر کر لینا، حضرت مولانا سے اس کی شکایت کبھی نہ کرنا، ورنہ تم ہار جاؤ گے اور صاحبزدگان جیت جائیں گے، یہ تجربہ کی بات ہے جو میں تم کو بتا رہا ہوں۔ چنانچہ ان کی اس نصیحت پر خادم جب تک مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں رہا سختی سے عمل پیرا رہا، حالانکہ کئی مرتبہ دوران قیام صاحبزدگان بالخصوص نائب ناظم کی طرف سے ایسی تکلیف دہ باتیں سامنے آئیں جن کا اظہار و تذکرہ حضرت مولانا سے ناظم ہونے کی حیثیت سے کرنا ضروری تھا، لیکن برادر اوسط کی نصیحت اور وصیت پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ صبر سے کام لیتا رہا۔ چنانچہ امتحان کی میٹنگ میں جس انداز کی بدتمیزی اور بدزبانی نائب ناظم نے کی اس پر بھی اس خادم نے صبر کیا اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے اس کا تذکرہ نہیں کیا اور صبر و خاموشی کے ساتھ جب تک رہا نائب ناظم کی ہر جابرانہ اور حاکمانہ حکم کی تعمیل کرتا

رہا،لیکن ایک دن وہ آیا جب پانی سر سے اونچا ہوگیا اور صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہوگیا،تو بالآخر حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے بواسطہ مولانا عبدالعظیم ندوی ظلم وبربریت کی داستان سنا کر اور اجازت لے کر بادل ناخواستہ مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

مدرسہ ریاض العلوم کا سالانہ امتحان

جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو امتحان گاہ اور امتحان کا پورا نقشہ تبدیل ہو چکا تھا، جو وہاں کے موجود طلباء اساتذہ کے لیے مکمل ایک نیا نظام تھا،لیکن اس نئے نظام کو بحال کرنے کے لئے اس خادم کو مسلسل پندرہ بیس روز کی بلاشرکت غیرے سخت محنت کرنی پڑی تھی،جس کا معاوضہ تو درکنار ہمت وحوصلہ افزائی کا بھی ایک جملہ ان لوگوں کی زبان سے نہیں نکلا،جن کے فرائض میں حوصلہ وہمت افزائی تھی،لیکن اس خادم نے اپنا کام اپنی جگہ اپنا ادارہ اپنے لوگ سمجھ کر پورے حوصلے سے یہ کام انجام دیا تھا،کوئی عوض یا غرض کا کسی درجہ میں تصور حاشیہ خیال میں نہیں تھا،لیکن اتنا جدید اور مضبوط اور نئے نظام کو دیکھ کر جس سے مدرسہ کا وقار بھی بڑھا ہو جس سے علاقائی مدارس کا نظام خالی ہو کم از کم زبانی حوصلہ افزائی تو ذمہ داروں کے فرائض میں داخل تھی لیکن ان خشک تر لوگوں کی زبان پر کوئی جملہ حوصلہ افزائی کا بھی نہیں آسکا جس پر افسوس ہونا ایک فطری امر تھا جو ہونا چاہئے تھا اور ہوا بھی۔

سالانہ امتحان میں خادم کے ذمہ جن کتابوں کا امتحان آیا ان کتابوں میں ''الفوز الکبیر'' بھی تھی کیونکہ مشکوۃ کی جماعت وہاں اس سال کی آخری جماعت تھی اور

مشکوۃ کی جماعت کو ''الفوز الکبیر'' بھی پڑھائی گئی تھی، خادم نے الفوز الکبیر کا جو سوالنامہ بنایا اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل چند صفحے کا ایک مقالہ سپرد قلم فرمائیے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمات علمیہ و دینیہ کے ساتھ ان کے مسلک و مشرب کی بھی وضاحت ہو اور کوشش کریں کہ جو کچھ لکھیں بالوجہ ہو بلا وجہ نہ ہو۔

یہ سوالنامہ چونکہ مطبوعہ تھا پڑھنے کے بعد طلباء نے ہنگامہ شروع کر دیا، نہ ان کی سمجھ میں آیا نہ ان کو کوئی سمجھانے والا امتحان گاہ میں موجود تھا جو موجود تھے وہ بھی ان الفاظ کے مفاہیم کی تفہیم سے قاصر رہے کہ مقالہ کس کو کہتے ہیں اور مشرب کا مطلب کیا ہے اور بالوجہ اور بلا وجہ کا مفہوم مرادی کیا ہے۔

بہر حال کسی طرح سالانہ امتحان ختم ہوا، طلباء اس نئے نظام سے ابتداءً متوحش رہے، چونکہ پرانے اور فرسودہ نظام سے سوالات کے حل کرنے کی جو سہولت ان کو حاصل تھی اس نئے نظام میں اس کی گنجائش نہیں تھی، لیکن دھیرے دھیرے مدرسہ کا ماحول اور طلباء مانوس ہوتے گئے اور دوسرے امتحانات میں طلباء کی برگشتگی ختم ہوگئی، سالانہ امتحان ختم ہوا اور طلباء اساتذہ اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

فیض آباد شہر میں اس خادم کی پہلی تراویح

لیکن یہ خادم ابھی مدرسہ ہی میں تھا کہ فیض آباد سے انیس بھائی چشمہ والے

اپنے چند احباب کے ساتھ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی خدمت میں تشریف لائے، آنے کے بعد انہوں نے حضرت مولانا سے درخواست پیش کی کہ حضرت ہمارے یہاں رمضان میں شہر کی جامع مسجد میں تراویح کے لئے ایک حافظ کی ضرورت ہے جن میں یہ خوبیاں ہونا ضروری ہیں۔

(۱) حافظ کے ساتھ وہ عالم بھی ہو (۲) عالم ہونے کے ساتھ ان میں تقریری صلاحیت بھی ہو، تقریری صلاحیت کے ساتھ مسائل بتانے کی بھی صلاحیت ہو (۳) چونکہ ہماری مسجد کے گرد و پیش شیعہ اور جماعت اسلامی اور بریلوی لوگ بھی رہتے ہیں تو ان سے مل جل کر کے وہ رہنے والے ہوں تاکہ کوئی انتشار پیدا نہ ہو۔ (۴) متواضع منکسر المزاج ہوں چونکہ وہاں اکثر لوگ سبزی فروش ہیں اور غالب اکثریت جہلاء کی ہے۔

چنانچہ قرعۂ فال اس خادم کے نام نکلا اور حضرت مولانا کی طرف سے فیض آباد تراویح کے لئے جانا طے کر دیا گیا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر وہاں پہونچ کر پورا رمضان قیام کیا اور تراویح سنانے کے ساتھ انیس بھائی کی طرف سے پیش کردہ سارے شرائط پورے کئے، رمضان کے بعد مدرسہ ریاض العلوم واپسی ہوئی اور رمضان میں وہاں کے لوگوں سے جو رابطہ ہوا وہ پورے سال باقی رہا، اس کے بعد جب دوسرا رمضان آیا تو انیس بھائی چشمہ والے کی طرف سے پھر اس خادم کا مطالبہ ہوا، چنانچہ دوسرے رمضان میں بھی یہ خادم حضرت مولانا کے تعمیل حکم میں وہاں پہونچ گیا۔ لیکن دوسرا رمضان پہلے رمضان سے مختلف تھا، وہ اس طرح کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کا رمضان کے بعد مدینہ طیبہ میں انتقال ہو چکا تھا اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب اس سال رمضان کے

اخیر عشرہ میں چند احباب کے ساتھ مدرسہ ریاض العلوم کی مسجد میں اعتکاف فرمانے والے تھے، ادھر اس خادم کی دلی خواہش تھی کہ حضرت مولانا کے ساتھ میں بھی مدرسہ میں اعتکاف کروں۔ چنانچہ اس کے لئے ۱۹؍ رمضان کو تراویح میں ختم قرآن پاک کا پروگرام بنایا اور اپنے ارادے وخواہش و پروگرام کی اطلاع پیشگی انیس بھائی چشمہ والے سے کردی، لیکن وہ ۲۶؍ رمضان کو ختم پر مصر رہے اور کسی قیمت پر ۱۹؍ رمضان کو ختم کے لئے تیار نہیں ہوئے، ان کے اس بیجا اصرار پر اس خادم کو اس قدر تکلیف ہوئی کہ میں نے بہت واضح الفاظ میں ان سے یہ کہہ دیا کہ آئندہ رمضان میں مجھ کو آپ نہیں پائیں گے، لیکن انہوں نے اس کو مذاق پر محمول کیا اور میں نے حقیقت پر محمول کر کے یہ بات ان سے کہی تھی۔ حضرت مولانا کے ساتھ اعتکاف کے چھوٹنے پر اس قدر تکلیف ہوئی کہ اس کے بعد فیض آباد کی تراویح ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا، انیس بھائی نے لاکھ کوشش کی لیکن اس کے بعد تراویح کے لئے میں ان کو کبھی دستیاب نہیں ہوسکا، البتہ وسط سال میں آمد ورفت باقی رہی، وہاں کے لوگوں سے رابطہ بھی رہا اور بیانات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۹۸۳ء سے رمضان کا معمول

مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچنے کے بعد ابتدائی دوسال حضرت مولانا کے حکم سے تراویح کے لئے فیض آباد شہر جانا ہوا، لیکن اس کے بعد سے جب تک وہاں رہنا ہوا بلا ناغہ پورا رمضان بہت ہی اہتمام کے ساتھ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب

کی خدمت میں گزارنے کا موقعہ ملتا رہا، ابتداءً قرب وجوار کے چند افراد اعتکاف کے لئے آتے تھے، لیکن کئی سالوں کی محنت کے بعد انتہائاً ماشاءاللہ مدرسہ ریاض العلوم کی پوری مسجد بھرنے لگی جس میں زیادہ تر معتکفین قرب وجوار کے ہوتے تھے اور ممبئ کے چند احباب شرکت کرتے تھے جن میں حاجی رضوان اللہ صاحب تاجر عطور اور جناب شکیل احمد صاحب پابندی سے اعتکاف میں آتے تھے۔

اعتکاف کے نظام کو سنبھالنے کی ذمہ داری صرف دو افراد کی ہوتی تھی (۱) یہ خادم (۲) حضرت مولانا کے برخوردار مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی اندر کے نظام کو سنبھالنے کی ذمہ داری مکمل اس خادم کے ذمہ تھی، ناظم اعتکاف کی حیثیت سے اندر کے جملہ امور کے ساتھ سیٹوں کی تقسیم معتکفین کی نگرانی، ضروریات مسجد کی تکمیل اس کی صفائی ستھرائی وقت پر سلانا اور بیدار کرنا، وقت پر سحری اور افطاری سے معتکفین کو فارغ کروانا۔۱۹۸۳ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک اس خادم کے ذمہ رہی جس کو باحسن وجوہ انجام دیتا رہا اور باہر کے جملہ امور کی نظامت مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کی تھی، مہمانوں کے لئے افطاری وسحری اور کھانے کا انتظام کرنا پکوانا اور وقت پر مسجد پہنچانا اور وقت پر مہمانوں کو کھانے افطاری وسحری سے فارغ کرانا، ۲۴ ر گھنٹے کے معمولات یہ تھے کہ فجر کی نماز کے بعد فوراً سبھی حضرات آرام کے لئے لیٹ جاتے تھے، پھر حسب ہمت اور طاقت لوگ بیدار ہوتے اور اپنے انفرادی معمولات میں لگتے۔ دس سے گیارہ تک ایک گھنٹہ بیان کا معمول تھا جس میں سبھی معتکفین حضرات شرکت کیا کرتے تھے، بیان کی ذمہ داری مدرسہ ریاض العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد

حنیف صاحب کی تھی۔ چنانچہ وہ بہت شوق اور دلچسپی سے پابندی سے بیان کیا کرتے تھے اور بیان میں روزانہ دو چار کتابیں ساتھ لے کر آتے تھے، ان کتابوں کو کھول کر تصدیقی بیان فرماتے اور مجمع محظوظ ہوتا۔ظہر کے بعد ختم خواجگان کا معمول تھا، یہ عمل اور اس کے بعد اجتماعی دعاء ہمیشہ اس خادم کے ذمہ رہی، اس کے بعد اجتماعی ذکر کی مجلس ہوتی تھی، جس کی قیادت و سیادت اور تلقین بھی اس خادم کے ذمہ تھی عصر کے بعد تھوڑی دیر کتابی تعلیم ہوتی تھی، اس کے بعد اجتماعی افطاری کا نظم تھا، مغرب کی نماز کے بعد انفرادی اعمال سے فارغ ہو کر اجتماعی کھانا ہوتا، اس کے بعد تراویح کی تیاری میں لگ جاتے، تراویح سے فارغ ہونے کے بعد چہل حدیث، درود پاک ہوتی، اس کے بعد اجتماعی دعاء ہوتی تھی، یہ اجتماعی دعاء بھی اس خادم کے ذمہ ہمیشہ رہی، اس کے بعد تھوڑی دیر کتابی تعلیم ہوتی، پھر مجلس برخواست ہوجایا کرتی تھی، سحری تک بعض معتکفین آرام کرتے تھے، بعض بقدر ہمت و طاقت انفرادی اعمال میں لگ جاتے، سحری کے وقت اجتماعی سحری ہوتی اس کے بعد فجر کی تیاری میں لگ جاتے۔

پنج وقتہ امامت مولانا عبد العظیم صاحب ندوی کے ذمہ تھی، اور تراویح حضرت کی تجویز کے مطابق کبھی ندوی صاحب کبھی کوئی نواسہ اور کبھی کوئی پوتا پڑھایا کرتا تھا، تراویح میں پورے رمضان میں ایک قرآن پاک ختم کا معمول تھا۔

یہ خادم جب تک مدرسہ ریاض العلوم گورینی رہا اور حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب کے ساتھ رمضان گزارنے کی جب تک سعادت ملی، الحمد للہ ثم الحمد للہ پورے مہینے کا اعتکاف کرتا رہا جبکہ اس زمانہ میں رمضان کے مہینہ میں شدید گرمی ہوتی تھی، اور

دن بھی لمبے ہوتے تھے، اس کے باوجود بغیر کسی غرض اورعوض کے مذکورہ بالا خدمات باحسن وجوہ انجام دیتا رہااور کبھی یہ خیال بھی پیدانہیں ہوا کہ پورامہینہ جومیری ذاتی چھٹی کا ہے میں مدرسہ میں رہ کر یہاں کی خانقاہ کا پورا نظام اندرونی طور پر سنبھالتا ہوں اور مدرسہ ہی پر مقیم رہتا ہوں، لہٰذا مجھ کو بھی مدرسہ کی طرف سے ڈبل تنخواہ ملنی چاہئے جبکہ بہت سے وہ افراد جو رمضان میں مدرسہ میں رہ کر صرف وقت گزارتے تھے بلکہ اپنے ذاتی مشاغل میں لگے رہتے تھے ان کو ڈبل تنخواہ دی جاتی تھی، جس کا شاہد عدل آج بھی وہاں کا قبض الوصول ہے، نیز ۱۹۸۳ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک بعض لوگ وہاں ایسے بھی تھے جن کو خانقاہ اور خانقاہی نظام سے کوئی مطلب نہیں تھا، نہ ایک دن کبھی ذکر کی مجلس میں شریک ہوئے نہ کبھی بیان میں بیٹھتے، نہ کبھی دعاء میں شرکت کی نہ معتکفین کے ساتھ کبھی افطاری کیا، نہ سحری کھائی نہ ایک دن کا اعتکاف کیا، جس کی شہادت آج بھی یہ خادم دے سکتا ہے، لیکن واہ رے بندوق کی طاقت کہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو اس کے اہل تھے اور جنہوں نے قربانی دی تھی ان کو بندوق کی نوک پر نکال باہر کردیا گیا اور زبردستی خودساختہ جانشین بن کر اس مقدس جگہ پر قابض ہوگئے، اور خودساختہ قلم کے ذریعہ بے ساختہ حضرت مولانا کے متعلقین ومحبین متوسلین ومنتسبین کو داخل وخارج کرنے لگے جس کا کوئی حق ان کو حاصل نہیں تھا۔ فالی اللہ المشتکی۔

۱۹۸۲ء میں طلباء مشکوۃ کے داخلے کا مسئلہ

جب یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی پہونچا تو وہاں آخری جماعت مشکوۃ

شریف کی تھی، سالانہ امتحان سے فراغت کے بعد طلباء اپنے گھروں کو چلے گئے، عید کے بعد داخلہ کے لئے ان سب کو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانا تھا، چونکہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کا رجحان مدرسہ مظاہر علوم کی طرف تھا چونکہ وہ خود بھی مدرسہ مظاہر علوم کے فارغ تھے اور دیگر رجحانات کی وجہ سے اس سے پہلے بھی طلباء دورۂ حدیث کے لئے مدرسہ مظاہر علوم جاتے رہے، چنانچہ حسب معمول وحسب ہدایت یہ طلباء بھی وہاں پہونچے، لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی داخلہ وہاں نہیں ہوسکا اور سب کے سب واپس آ گئے۔ حضرت مولانا کو اس کا بہت قلق ہوا، حضرت کے قلق کو دور کرنے کے لئے اس خادم نے حضرت مولانا سے یہ کہا کہ حضرت فکر نہ کریں، اس سال تو کسی طرح کہیں بھی ان بچوں کو داخل کرا دیا جائے، لیکن انشاء اللہ آئندہ سال سے دورۂ حدیث یہیں ہوگا، یہ بات خادم نے ایسے وقت کہی جس وقت حضرت مولانا شکستہ دل کے ساتھ مایوس بھی تھے، چنانچہ خادم کی یہ بات حضرت مولانا کے دل میں اتر گئی اور حضرت مولانا نے اسی وقت دورۂ حدیث کے قیام کا ارادہ فرمالیا، اس کے بعد حضرت مولانا سے میں نے کہا کہ حضرت اگر اجازت ہو تو ان بچوں کو لے کر مدرسہ شاہی مرادآباد چلا جاؤں، انشاء اللہ وہاں داخلہ ہو جائے گا، حضرت مولانا نے اس کی تائید فرمائی اور حضرت مولانا کا ایک خط لے کر ان بچوں کو ساتھ لے کر مدرسہ شاہی پہونچ گیا، وہاں کے اس وقت ناظم تعلیمات مولانا محمد احمد صاحب تھے جو فیض آباد کے رہنے والے تھے اور پہلے سے بھی اس خادم کی ان سے شناسائی تھی اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے بھی ذاتی طور پر اچھی طرح واقف تھے، اس وقت وہاں

کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی تھے جو حضرت شیخ کے خلفاء میں سے تھے اور حضرت شیخ کے یہاں سے ان سے بھی شناسائی تھی۔ بہرحال ان تمام طلباء کا داخلہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ہوگیا اور اس کے بعد یہ خادم مدرسہ ریاض العلوم گورینی واپس آگیا جو طلباء مدرسہ شاہی میں داخل ہوئے ان میں عزیزم مولانا عبدالماجد سلمہ بھی تھے جو جمدہاں کے رہنے والے تھے، جن کے والد ریاض احمد صاحب تھے جو بہت ہی نیک اور صالح تھے، مولانا عبدالماجد شاہی سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں حفظ کے استاذ بھی بنے اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے سب سے چھوٹے داماد بھی تھے، اپنے والد کی طرح یہ بھی بہت نیک اور صالح اور ملنسار تھے، اس خادم سے بھی بہت قریبی تعلق تھا، مجھ سے بہت اپنائیت اور محبت رکھتے تھے اور حضرت مولانا کی نسبت سے یہ خادم بھی ان کی عزت کرتا تھا، گاہ بگاہ اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے بھی اس خادم کو نوازتے رہتے تھے، ان کا مشورہ چونکہ اندرون خانہ کے مشاہدہ پر مبنی ہوتا تھا، اس لئے خادم بہت عزت اور قدر کی نگاہ سے ان کو دیکھتا اور سنتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء میں جب اس خادم نے مدرسہ ریاض العلوم کو خیرباد کہا تو اس سے بہت پہلے سے وہ ایک جملہ کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب اب آپ کے لئے یہاں رہنے کی جگہ باقی نہیں رہی، لہٰذا آپ یہاں سے ہجرت کر جائیں، اسی کے ساتھ ایک جملہ یہ بھی قریبی وقت میں ہجرت سے چند ماہ پہلے کہنا شروع کر دیا تھا کہ مفتی صاحب میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی موجودگی میں آپ کو عزت کے ساتھ رخصت کردوں، لیکن یہ خادم ان کی بات کو مسترد کرتا رہا اور اس

کے بعد بھی کافی عرصہ تک وہاں موجود رہا، انشاء اللہ اس کی تفصیلات اگلے صفحات میں سپرد قلم کروں گا۔

بہر حال موقوف علیہ کے طلباء کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل کرا کر واپسی کے بعد پورے سال گاہ بگاہ وقتاً فوقتاً حسب موقعہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب سے دورۂ حدیث کے قیام کا تذکرہ کرتا رہا تا آنکہ حضرت مولانا اس کے لئے راضی اور تیار ہو گئے اور ۱۹۸۳ء سے باضابطہ دورۂ حدیث کا آغاز ہو گیا۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں دورۂ حدیث کا آغاز

جس سال دورۂ حدیث کا آغاز ہوا تو شوال میں حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب نے بلا کر اس خادم سے فرمایا کہ مفتی صاحب دورۂ حدیث کی کتابوں کا ایک چارٹ بنا کر مجھ کو دے دیں۔ چنانچہ اس خادم نے ایک چارٹ بنا کر حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا، اس کے کل ہو کر آپ دفتر نظامت میں تشریف لائے اور تمام اساتذہ کی موجودگی میں دورۂ حدیث کے اسباق خود تقسیم فرمائے۔

کتابوں کی تقسیم ترمذی شریف سے آپ نے کی اور سب سے پہلے ترمذی کو سپرد کرتے ہوئے تمام اساتذہ کی موجودگی میں یہ فرمایا کہ ترمذی شریف تو ہمارے مفتی صاحب پڑھائیں گے، باقی بخاری شریف جس کا دل چاہے پڑھائے، اس کے بعد بخاری شریف مدرسہ ریاض العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد حنیف صاحب کے سپرد

آپ نے فرمایا اور ابوداؤد شریف مولانا سعادت علی صاحب الہ آبادی کے نام لکھوایا، اس تقسیم کے بعد درسگاہ کی تعیین عمل میں آئی اور اس کے لوازمات و مناسبات کا نظم وانتظام اس خادم کے سپرد ہوا۔

مدرسہ ریاض العلوم میں چونکہ دارالحدیث کے نام سے کوئی مستقل عمارت نہیں تھی، اس لئے دورۂ حدیث کے لئے دفتر انتظام کے اوپر بنے ہوئے فوقانی منزل کے کمرے کو متعین کیا گیا اور اس کے بغل والا کمرہ موقوف علیہ کی درسگاہ قرار پائی اور اس کے دائیں بائیں جو فوقانی منزل کے کمرے تھے، ان میں حفظ اور تجوید کی تعلیم ہوتی تھی، باقی درجات کی تعلیم اساتذہ کے ان کمروں میں ہوتی تھی جو ان کی رہائش گاہ تھی۔

چند روز کے بعد مدرسہ کی مسجد میں تمام طلباء و اساتذہ جمع ہوئے اور ان کی موجودگی میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے بخاری شریف کا پہلا درس دے کر دورۂ حدیث کا آغاز فرمایا، آغاز بخاری کی مجلس میں حضرت مولانا محمد حنیف صاحب پر گریہ طاری ہوا اور اس کے بعد پندرہ روز مسلسل بخاری پانے کے بعد بخاری ہوگئے یعنی بخار میں مبتلا رہے، آغاز میں صرف یہ خادم اور مولانا سعادت علی صاحب اپنی مفوضہ کتابوں کا درس دیتے رہے۔

حسن اتفاق کہ موقوف علیہ کے تمام طلباء موجودہ اساتذہ کے تعلق اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی نسبت کی بنیاد پر رک گئے اور سب کے سب یہاں دورہ میں شریک ہوئے، کوئی بھی طالب علم دورۂ حدیث کے لئے کسی بڑی درسگاہ میں نہیں گیا اور سب سے بڑی خوبی کی بات یہ رہی کہ جو طلباء شریک دورہ تھے ان میں اکثر ذہین

تھے جیسے عمر گورکھپوری، رشید احمد معروفی، کوثر اعظمی، وغیرہم، پندرہ بیس روز کے بعد بخاری شریف کا بھی درس شروع ہوا، لیکن اکثر کتابیں موقوف رہیں، ادھر حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب اساتذہ کی تلاش میں لگے رہے اور کچھ حضرات کے بارے میں امید وابستہ کئے ہوئے بیٹھے تھے، مثلاً مولانا عبدالرشید صاحب بستوی جو کسی زمانہ میں مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں میں مشکوٰۃ شریف کے معتمد استاذ تھے، لیکن بعد میں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے اور وہاں کے دفتر انتظام سے وابستہ ہوگئے، لیکن ان کے بارے میں بھی حضرت مولانا امید لگائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے ان کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بھی حج کے بعد انشاءاللہ آجائیں گے، اس موقع سے اس خادم نے ایک استاذ کا نام لے کر عرض کیا کہ جب تک مولانا عبدالرشید صاحب نہیں آتے ہیں فلاں کتاب فلاں استاذ کے سپرد کردی جائے تاکہ طلباء میں اساتذہ کی کمی کی وجہ سے جو ہیجانی کیفیت ہے مضمحل ہوجائے، حضرت مولانا نے اس کے جواب میں اس خادم سے فرمایا کہ ان کو تجارت سے فرصت نہیں، وہ کتاب کیا پڑھائیں گے، اس کے بعد یہ خادم خاموش ہوگیا، مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ادھر بخاری شریف کے درس کا انداز یہ رہا کہ بخاری شریف جن کے سپرد تھی وہ لامع اور عینی لے کر درسگاہ جاتے تھے، اور اسی کو کھول کر سامنے رکھ کر درس دیا کرتے تھے، جس سے طلباء بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے، دورۂ حدیث کے دوسرے ایک استاذ تھے بقول حضرت مولانا چونکہ ان کا رجحان کاروبار کی طرف زیادہ تھا، مدرسہ کے

کمرے کا استعمال بھی وہ اپنے سامان تجارت کے رکھنے اور اس کے فروغ کے لئے بلا تکلف و بلا تردد کرتے تھے اور زیادہ وقت ان کا کاروبار ہی میں لگتا تھا، جس سے حضرت مولانا اور دوسرے منتظمین بھی واقف تھے جس کی وجہ سے دورۂ حدیث کے مفوضہ کتاب کا مطالعہ بھی بقدر فرض کفایہ ہی کر پاتے تھے۔

باقی بچ گیا یہ خادم تو خادم کا یہ معمول تھا کہ جتنی شروحات ترمذی شریف کی وہاں دستیاب تھیں ان سب کا بالاستیعاب چھ گھنٹہ مطالعہ کرتا جس کے لیے اوقات درس کے علاوہ خارج میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا تھا، اس کے بعد حاصل مطالعہ کو ترتیب دیتا، پھر مرتب انداز میں ایک گھنٹہ محقق و مدلل مفصل و مبرہن منقح و مبین درس ہوتا۔

انداز درس یہ تھا کہ حدیث پاک کی عبارت ہوتی، اس کا ترجمہ ہوتا اس کی تشریح ہوتی، اگر کوئی مسئلہ اس میں مذکور ہے تو اس مسئلہ کے سلسلہ میں اختلاف ائمہ کا بیان ہوتا، اس کے بعد حضرات ائمہ کے دلائل ہوتے، اخیر میں حضرات حنفیہ کے دلائل اور وجوہ ترجیح کے بیان پر گفتگو مکمل ہوتی، یہ انداز درس وہ تھا جس کے لیے اس خادم کو درس سے پہلے کافی مطالعہ اور محنت کرنی پڑتی تھی، لیکن یہ انداز طلباء کو بہت پسند آیا بہت مقبول ہوا، اور مبسوط تقریر سے وہ بہت منشرح ہوئے اور ان کی دلجمعی میں معاون ثابت ہوا۔ جس کا نتیجہ چند مہینوں کے بعد یہ نکلا کہ دارالعلوم دیوبند تک اساتذہ میں اس کا چرچا شروع ہوگیا کہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں سارے اساتذہ مشکل سے چھ گھنٹہ ڈیوٹی کر پاتے ہیں، لیکن مفتی حبیب اللہ صاحب ایک ایسے ہیں جو اٹھارہ گھنٹہ ڈیوٹی کرتے ہیں اور اس کا بھی تذکرہ ہونے لگا کہ وہاں بخاری شریف سے اچھی

ترمذی شریف ہو رہی ہے۔

لیکن اس شہرت اور مقبولیت کو کم اور ڈاؤن کرنے کے لئے بخاری شریف کے سبق میں یہ تقریر شروع ہونے لگی کہ بخاری شریف کا سبق کا انداز حضرت شیخ الہند جیسا ہے اور ترمذی شریف کے درس کا انداز علامہ انور شاہ کشمیری جیسا ہے، اس کے بعد طلباء سے یہ کہا جانے لگا، لیکن شیخ الہند کی تقریر زیادہ نافع ہوا کرتی تھی، علامہ انور شاہ کشمیری کے درس سے، طلباء اس طرح کے بیانات اس خادم سے نقل کرتے رہے، لیکن اپنے کو ان جملوں سے متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ درس کا انداز وہی باقی رکھا، نیز ترمذی شریف کے شروع میں پندرہ روز تک مسلسل مبادیات حدیث پر کلام کیا جس میں حدیث پاک اور کتاب کے ضروری مباحث مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب پر تفصیلی گفتگو کی، جس کو طلباء نے بہت پسند کیا اور بعد میں ''مبادیات حدیث'' کے نام سے بیان کردہ پندرہ روزہ مقدمہ مستقل کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہوا۔

ادھر محرم کے بعد قدرے تاخیر سے مولانا عبدالرشید صاحب بستوی مکہ مکرمہ سے واپس آئے جن سے حضرت مولانا کی توقعات وابستہ تھیں، میں بھی بہت خوش ہوا کہ ہم تین دورۂ حدیث میں تھے، چوتھے کی آمد ہوگئی، اب انشاء اللہ طلباء کی شکایت دور ہو جائے گی اور اساتذہ کی کمی کا خلاء پُر ہو جائے گا، لیکن ایک ہفتہ قیام کر کے اور مختلف زاویوں سے جائزہ لے کر وہ گھر واپس ہو گئے، بعد میں معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہو کر افسوس وصدمہ ہوا کہ انہوں نے دورۂ حدیث کی کتاب پڑھانے سے معذرت کر دی، خادم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ممکن ہے کہ انہوں نے چونکہ مشکوۃ شریف

ہی تک پڑھایا تھا اور تعلیمی سلسلہ سے انقطاع بھی ایک طویل عرصہ تک رہا، نیز یہاں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران انہوں نے دورۂ حدیث بالخصوص ترمذی شریف کے پڑھانے کا انداز واسلوب دیکھا اور سن لیا تھا اس لئے ان کی ہمت نہ پڑی ہو اور انہوں نے دورۂ حدیث کی کتاب پڑھانے سے معذرت کر دی ہو۔ لیکن جب اس خادم کو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے معذرت کی وجہ لوگوں کے درمیان یہ پھیلائی کہ مفتی حبیب اللہ صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ مولانا عبدالرشید صاحب کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ دورہ کیا پڑھائیں گے؟ ان کے بس کا نہیں ہے جبکہ یہ بات سراسر الزام اور تہمت تھی جس کو میں نے نہ زبان سے کہا نہ ہی کبھی ذہن میں یہ بات آئی۔ ہاں البتہ جب ان کے جانے کے بعد یہ خبر گرم ہوئی کہ وہ دورہ نہیں پڑھائیں گے اور صولتیہ ہی واپس جائیں گے جس کے بعد طلباء دورہ حدیث میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں اور درسگاہ کے طلباء نے مجھ سے کہا کہ مولانا عبدالرشید صاحب نے تو دورہ پڑھانے سے انکار کر دیا وہ تو اب نہیں آئیں گے، گھر چلے گئے تو اس خادم نے طلباء کے اس ذہنی انتشار کو ختم کرنے اور جماؤ پیدا کرنے کے لئے یہ کہا کہ کوئی بات نہیں گھبراؤ نہیں وہ نہیں تو کوئی دوسرا استاذ آجائے گا، اور کوئی نہیں آیا تو انشاء اللہ ساری کتابیں پڑھانے کے لئے میں تنہا کافی ہوں، اتنی ہمت رکھتا ہوں۔

اتنی سی بات تھی جو اس خادم نے کہی، وہ بھی اس کے بعد جب یہ تصدیق ہوگئی کہ انہوں نے انکار کر دیا ہے اور وہ بھی صرف طلباء میں جماؤ پیدا کرنے کے لئے۔

لیکن اس کے بعد اس خادم نے اپنے عزم میں مزید پختگی پیدا کی اور گھنٹی کے

علاوہ خارج وقت یعنی عشاء کے بعد دوڈھائی گھنٹہ مسلسل محرم سے لے کر رجب تک ترمذی شریف کا درس شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک خادم کے ذمہ ترمذی شریف رہی اور اس طرح معتد بہ مقدار میں ترمذی شریف کو روایت مع درایت پڑھانے کا موقع ملا، مزید پہلے ہی سال میں ترمذی شریف کے علاوہ نسائی شریف، ابن ماجہ، موطأ امام مالک اور موطا امام محمد کا بھی درس دیا۔ اس طرح دورۂ حدیث کی پانچ کتابیں اور صحاح ستہ کی تین کتابیں پوری سیرابی کے ساتھ پورے سال طلباء کو پڑھایا اور باقی کتابوں کا حال یہ رہا کہ چند صفحات پورے سال میں درایۃً ہوئے باقی کتاب روایۃً مکمل کی گئی۔

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مولانا افضال الحق صاحب کی آمد

ادھر حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب دورۂ حدیث کے لئے استاذ کی جستجو فرما رہے تھے کہ مولانا عبد الرشید صاحب بستوی کے انکار سے جن سے آپ کو بہت توقعات وابستہ تھیں دھکا لگا اور اس جستجو میں تیزی پیدا کر دی، اسی درمیان آپ کا جانا دار العلوم دیوبند کی شوریٰ میں ہوا اور آپ نے مولانا ارشد مدنی سے دورۂ حدیث کے لئے استاذ کا تذکرہ کیا، ان کے انتخاب اور حکم پر مولانا افضال الحق صاحب قاسمی جوگھوسی کے قریب ایک گاؤں رگھولی کے رہنے والے تھے اور امروہہ کے چلہ مدرسہ میں استاذ حدیث تھے، مدرسہ ریاض العلوم گورینی آ گئے اور بخاری شریف جلد ثانی اور مسلم شریف ان کے سپرد کر دی گئی اور انہوں نے درس شروع کر دیا، پہلے دن ہی جب بخاری شریف کے

کتاب المغازی کا درس دیا تو اپنی تقریر میں ملک وملت بچاؤ تحریک کو اس سے جوڑ کر ثابت کیا جس کی خبر طلباء نے صدر مدرس کو دی اور صدر مدرس نے عصر کے بعد حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب سے اس خادم کی موجودگی میں ناراضگی کے اظہار کے ساتھ تذکرہ کیا، لیکن حضرت مولانا نے خاموشی کے ساتھ سن لیا کوئی جواب نہیں دیا۔

مولانا افضال الحق صاحب کی صلاحیت اچھی تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے تلامذہ میں سے تھے، لیکن زبان آپ کی صاف نہیں تھی جس کی وجہ سے طلباء آپ کی بات وتقریر سمجھ نہیں پاتے تھے، حضرت مدنی کی تلمیذیت کی وجہ سے مدنی خاندان اور تحریک جمعیۃ علماء سے بہت قریبی تعلق تھا اور ان کے اکثر پروگراموں میں شرکت کیا کرتے تھے اور دلی کی جمعیۃ آفس میں ہر مہینہ آپ کا آنا جانا ہوتا تھا، چونکہ آفس کی بہت سے انتظامی لائن کے کام آپ سے وابستہ تھے، مدرسہ ریاض العلوم کی مسجد کے اتر طرف دو کمرے تھے جس میں سے ایک میں آپ کا قیام تھا، زبان کی کمزوری اور جمعیۃ سے قربت کی وجہ سے طلباء واساتذہ ان سے غیر مانوس تھے۔ ایک دن عزیزم کوثر سلمہ جو کمراواں ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب کے عزیز بھی تھے اور دورۂ حدیث کے اس سال کے وہ طالب علم تھے، انہوں نے ایسے لہجہ میں ایک بات کہی جو اس خادم کے دل ودماغ میں پیوست ہوگئی، اس نے کہا کہ اتنی مشکل سے تلاش بسیار کے بعد حضرت مولانا ایک استاذ ڈھونڈ کر لائے ہیں اور ایک ماہ سے زیادہ ہوگیا، دیکھتا ہوں وہ بکلول کی طرح کمرے میں اکیلے بیٹھے رہتے ہیں، کوئی استاذ یا طالب علم ان کے پاس نہیں جاتا، آپ ہی ان کے

پاس چلے جایا کریں تاکہ ان کی کچھ دلبستگی ہوجایا کرے۔ چنانچہ اس کے کہنے کے بعد یہ خادم ان کے پاس عصر کے بعد جانے لگا، دھیرے دھیرے کچھ اساتذہ کو بھی وہاں بیٹھانے لگا، کچھ طلباء کو بھی بلانا شروع کیا، اس طرح بالتدریج طلباء اساتذہ بھی ان سے مانوس ہوگئے اور یہ خادم بھی کثرت آمدورفت اوراکل وشرب کی وجہ سے ان سے قریب ہوگیا اور مولانا بھی مجھ سے قریب ہوگئے، نوبت بایں جارسید ہم دونوں کی رفاقت حضر کے ساتھ سفر میں بھی ہونے لگی اور کئی اسفار ان کے ساتھ میرے ہوئے، ایک دن وہ آیا کہ قربت اتنی بڑھی کہ اپنے گھریلو اور عائلی مسائل میں حتی کہ بہوؤں کے مسائل میں بھی مجھ سے مشورہ کرنے لگے اور اپنے منامات بتا کر تعبیر لینے لگے۔

لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ درس وتدریس اور جمعیۃ کے کام کے ساتھ وہ دعاء تعویذ کا بھی کام کرتے تھے، دھیرے دھیرے ان کے یہاں وقفہ ظہیرہ میں عورتوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی، جس سے اس خادم نے بھی ازراہ تعلق ان کو کئی مرتبہ منع کیا اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، لیکن تسلسل کے ساتھ وہ یہ کام کرتے رہے، بالآخر ایک دن ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا وہ یہ کہ دوپہر کے وقت بہت سی عورتیں جھاڑ پھونک کے لئے آئیں اور جھاڑ پھونک اور تعویذ لے کر واپس ہوگئیں، انہی عورتوں میں سے ایک کا بھائی اس وقت مدرسہ میں پہونچا جب سارے لوگ ظہر کی نماز کے لئے مسجد جاچکے تھے، وہ شخص سیدھے آپ کے کمرے میں آیا اور اتنا زوردار طمانچہ آپ کے چہرے پر مارا کہ اس کی وجہ سے آپ کے دو دانت ٹوٹ گئے، چونکہ سارے لوگ ظہر کی نماز کے

لئے مسجد میں تھے اس لئے وہ بغیر کسی اخذ وبطش کے مدرسہ سے نکل گیا جب نماز پڑھ کر لوگ آئے تب لوگوں کو یہ معلوم ہوا اور پورے مدرسہ کے اساتذہ، طلباء میں یہ بات پھیل گئی، ادھر یہ راقم اعظم گڑھ شہر گیا ہوا تھا جہاں مولانا مستقیم صاحب بستوی کا پروگرام تھا، ان کے پاس حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے اس خادم کو ایک خط لے کر بھیجا تھا جس میں حضرت مولانا نے مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں تبلیغی اجتماع کا مطالبہ کیا تھا، مغرب بعد جب مولانا مستقیم صاحب کا جواب لے کر مدرسہ میں یہ خادم پہونچا تب جا کر مولانا افضال صاحب کے ساتھ پیش آنے والے حادثہ کی اطلاع ملی، ادھر مولانا افضال صاحب شام کے وقت دہلی کے لئے روانہ ہوگئے اور ادھر مدرسہ میں موجود طلباء اساتذہ میں ایک ہیجانی کیفیت اس واقعہ کو لے کر ایک صاحب نے پیدا کرادی اور وہ صاحب وہی تھے جو دارالعلوم کی اسٹرائک میں بھی پیش پیش تھے اور اسی اسٹرائک کی وجہ سے ان کا اخراج بھی ہوا تھا اور اس اخراج کے بعد انہوں نے امروہہ چلہ میں آکر مولانا افضال صاحب سے بخاری شریف پڑھا تھا، یعنی مولانا اعجاز احمد اعظمی، انہوں نے استاذ محترم ہونے کا اس طرح حق ادا کیا کہ کل ہو کر طلباء میں اتنا جنون پیدا کردیا کہ دورۂ حدیث کے طلباء نے ان کے حکم اور ایماء پر دارالحدیث میں تالا لگادیا اور پورے مدرسہ کا نظام تعلیم اس درجہ مختل کردیا کہ کئی روز تک تعلیمی نظام معطل ہو کر رہ گیا اور طلباء کو یہ کہہ کر انہوں نے اکسایا کہ شمشیر نامی جس شخص نے یہ حرکت کی ہے اس کو بلایا جائے اور اس سے بدلہ لیا جائے، صورتحال کو تنہا اعجاز اعظمی نے اتنا خراب کردیا کہ تمام طلباء

برانگیختہ وآمادہ شر ہوگئے۔ اس پورے واقعہ میں سب سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ رہی کہ اس پورے واقعہ کا الزام اعجاز اعظمی نے اس خادم کے سرڈال دیا اور اس بے بنیاد الزام کو اس شخص نے اتنی ہوا دی کہ سارے طلباء اور مولانا افضال صاحب کے آنے والے لڑکوں کو بھی یہ یقین کروادیا کہ یہ ساری حرکت مفتی حبیب اللہ کی ہے، جبکہ جس دن یہ واقعہ پیش آیا اس دن یہ خادم مدرسہ میں موجود بھی نہیں تھا، شام کو آنے کے بعد اس کی اطلاع ملی، نہ میں شمشیر نامی شخص سے واقف تھا، جس نے آکر مولانا افضال صاحب کی پٹائی کی تھی اور نہ میرے فرشتوں کو اس کی خبر تھی اور نہ ہی مولانا افضال صاحب سے ذاتی کوئی ایسی خلش تھی جس کا انتقام میں ان سے لیتا بلکہ جس انداز سے اس خادم نے ان کا تعاون کیا اور جس انداز کی قربت رہی اس کا مختصر تذکرہ بھی گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

لیکن اعجاز اعظمی کی یہ ساری حرکت صرف اور صرف اس لئے تھی کہ طلباء اساتذہ اور علاقہ میں اس خادم کا جو اعتماد اور وقار اور اثر ورسوخ تھا وہ ختم ہوجائے اور مدرسہ کے طلباء پر اس خادم کا جو رعب تھا وہ زائل ہوجائے اور مدرسہ کے ذمہ داران اس بہانے ان سے اتنے بدگمان ہوجائیں کہ ان کو نکال باہر کردیں، اس کے بعد طلباء میری مٹھی میں آجائیں اور پھر اس کو جس طرح چاہوں نچاؤں اور مدرسہ پر میرا قبضہ ہوجائے۔

ایک بدقسمتی یہ بھی رہی کہ اس حادثہ کے موقعہ پر مدرسہ کے نائب ناظم موجود نہیں تھے، سفر میں گئے ہوئے تھے، ان کی عدم موجودگی میں نیابت کے فرائض ان کے

برادر خورد مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی انجام دے رہے تھے، لیکن اعجاز اعظمی نے مدرسہ کے ماحول کو اتنا پراگندہ کردیا تھا اور طلباء میں اتنی سورش پیدا کردی تھی کہ موجودہ نائب ناظم کے کنٹرول سے حالات باہر نکل گئے تھے، مجبوراً ایک دن ظہر کی نماز کے بعد اس خادم کو انہوں نے اپنی آفس میں بلایا اور بلا کر کہا کہ مفتی صاحب حالات بہت خراب ہیں اور اعجاز اعظمی نے بالقصد حسد اور تعصب میں آپ کو مکمل بدنام کردیا ہے اور اس پورے حادثہ کا الزام آپ کے سر پر ڈال دیا ہے، آج مولانا افضال صاحب کے لڑکے رگھولی ضلع اعظم گڑھ سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ بھر کر بندوق لے کر دوپہر میں آئے، ان کے ذہن کو بھی اس خبیث نے خراب کیا اور اس پورے حادثہ کا ملزم اعجاز نے آپ کو بنادیا، لہٰذا اس صورتحال میں میری رائے یہ ہے کہ آپ چند روز کے لئے روپوش ہوجائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اعجاز اعظمی کچھ لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر آپ کے خلاف کوئی غلط حرکت کروادے۔

مولانا عبدالعظیم صاحب ندوی کی یہ بات سننے کے بعد تھوڑی دیر میں کشمکش میں رہا کہ میں کیا کروں، اس لئے کہ اگر روپوش ہوتا ہوں تو بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ مل جائے گا کہ اگر مفتی صاحب مجرم نہیں تھے تو روپوش کیوں ہوئے اور اگر نہیں جاتا ہوں اور یہاں رہتے ہوئے کوئی صورتحال خراب ہوتی ہے تو ندوی صاحب کو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے سامنے یہ کہنے کا جواز حاصل ہوجائے گا کہ میں نے تو مفتی صاحب سے کہا تھا کہ چند روز کے لئے روپوش ہوجائیں، لیکن مفتی صاحب میری رائے مانے نہیں، بالآخر یہ سوچ کر کہ روپوشی بھی اللہ کے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، مکہ مکرمہ سے ہجرت کے موقعہ پر تین روز غار ثور میں آپ بھی روپوش رہے، باوجودے کہ آپ حق پر تھے اور کفار باطل پر، یہ سوچ کر یہ خادم تیار ہوگیا۔

چنانچہ ندوی صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ عبداللہ کو بلایا اور وہ اپنے اسکوٹر پر بیٹھا کر لپری تک لے گئے اور لپری پہونچ کر میں بس پر بیٹھ کر جونپور پہونچ گیا اور چند روز بھائی منیر صاحب کے مکان پر قیام کیا جو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے سب سے بڑے لڑکے تھے، چند روز کے بعد جب اطلاع ملی کہ آپ واپس آجائیں تو واپسی پر معلوم ہوا کہ آج شام کو شمشیر جس نے مولانا افضال کو مارا تھا وہ آنے والا ہے، وہ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی خدمت میں پہونچ کر صحیح صورتحال بیان کرے گا، چونکہ اعجاز اینڈ کمپنی کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ اس کو بلایا جائے اور ہم اس سے بات کریں گے، لیکن طے یہ پایا کہ وہ حضرت مولانا کے یہاں آکر اپنا بیان دے گا۔ چنانچہ اس کو آنے پر آمادہ کرنے کے لئے مشورہ سے علاقائی چند افراد طے پائے جن میں سب سے اہم جناب ریاض احمد تھے جو بھادوں ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور اعظم گڑھ سے لے کر بمبئی تک ان کا بڑا نام تھا، چونکہ شمشیر نامی شخص جو ضارب تھا وہ بھی شرفاء میں سے نہیں تھا، اس لئے اس سے بات کرنے کے لئے اسی کے ہم جنس کا انتخاب کیا گیا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر مغرب کی نماز کے بعد جناب ریاض احمد صاحب بھادوں والے، شمشیر کو لے کر حضرت مولانا کی خدمت میں پہونچے، ان کے

ساتھ لدرہی کے حاجی اشفاق احمد صاحب اور علاقائی دوسرے اہم ذمہ دار حضرات بھی تھے، جب حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کے مہمان خانہ میں مجلس منعقد ہوئی تو اس وقت حضرت مولانا کے تمام صاحبزدگان مدرسہ کے تمام ذمہ داران اوراساتذہ بھی موجود تھے۔

ادھرایک ہفتہ سے اعجاز اعظمی نے جو ماحول بنایا تھااور جس انداز سے آگ کا رُخ میری ذات کی طرف کردیا تھا اس کی وجہ سے میری اہلیہ اور بچوں کے ساتھ میرے اعزاء بالخصوص میرا بھانجہ محمد عالم میرا ساڑھو صبغت اللہ، میرے سالے مظہر عالم واختر عالم کا برا حال تھا کہ اگران لوگوں نے اس شخص سے جھوٹ بلوا کر یہ کہلوادیا کہ ہاں مولانا افضال صاحب کے مارنے میں مفتی حبیب اللہ صاحب کا ہاتھ تھا تو پھر آپکا اور ہم سب کا آج کیا حشر ہوگا، اعجاز نے جس طرح ماحول خراب کر رکھا ہے یہ سب مل کر آج ہم سب کی بوٹی بوٹی کردیں گے۔

لیکن اس خادم کی پیشانی پر کوئی بل نہیں تھا، اور نہ کوئی گھبراہٹ، چونکہ اس خادم کو یقین تھا کہ جب کہیں سے کہیں تک میری شرکت نہیں ہے تو میرا نام کیسے آسکتا ہے، بدنام کرنے والے کرتے رہیں، لیکن انشاءاللہ وہی ہوگا جو واقعہ افک کے موقع پر حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہوا، یعنی منافقین اور رئیس المنافقین کے سارے الزامات دھرے کے دھرے رہ گئے اور حضرت جبرئیل نے آکر پانی کا پانی اور دودھ کا دودھ کردیا اور نتیجۃً حق کو غلبہ حاصل ہوا اور حق کی جیت ہوئی، نیز جب یہ معلوم ہوا کہ شمشیر بھی خودداد اقسم کا آدمی ہے تو میرا یقین اور بڑھ گیا کہ ایسے لوگوں سے کوئی جھوٹ

نہیں بلوا سکتا ہے اور کوئی دباؤ ڈال کر غلط نہیں کہلوا سکتا ہے جو حق اور سچ ہوگا وہی وہ بتلائے گا۔

چنانچہ یہ تسلی دیتے دیتے مغرب کا وقت ہوگیا، یہ خادم نماز پڑھنے مسجد گیا اور مغرب کے بعد سب لوگ پھونچ گئے اور مجلس کا آغاز ہوا اس مجلس میں جہاں سارے حضرات تھے جن کا اوپر تذکرہ میں نے کیا، یہ خادم بھی تھا اور اسٹرائیکی اعجاز اعظمی بھی تھا، جب سارے لوگ آ کر بیٹھ گئے تو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب کی موجودگی میں شمشیر نامی شخص کھڑا ہوا اور بغیر کسی رعب اور خوف کے پوری برجستگی اور سلاست کے ساتھ اس نے حضرت مولانا کو مخاطب کر کے اپنی بات رکھی جس کا آغاز اس نے ان الفاظ سے کیا کہ چند روز پہلے کی بات ہے کہ چند عورتوں کے ساتھ میری بہن بھی مولانا افضال صاحب کے یہاں دعاء تعویذ کے سلسلہ میں آئی، یہاں سے واپسی کے بعد مجھ سے رو کر اس نے کچھ ایسی بات کہی جس کی وجہ سے میں جذبات میں آ گیا اور موٹر سائیکل اٹھا کر میں سیدھے مدرسہ پہونچا اور پہونچ کر مولانا کو میں نے ایک تھپڑ مارا جس کی وجہ سے ان کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے، مجھے اس حرکت پر بہت ندامت اور ملامت ہے، مجھے مدرسہ پہونچ کر اس کی شکایت حضرت مولانا سے یا دوسرے ذمہ داروں سے کرنا چاہئے تھا، لیکن یہ نہ کر کے میں وہ کر بیٹھا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا جس پر میں بہت نادم اور شرمندہ ہوں اور آپ سبھی حضرات سے بالخصوص حضرت مولانا سے معافی کا خواستگار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سبھی حضرات مجھ کو معاف کریں گے اور انشاء اللہ آئندہ مجھ

سے کبھی ایسی نادانی نہیں ہوگی۔

اس بیان کے بعد سارے حاضرین اور حضرت مولانا مطمئن ہو گئے اور سب نے اس معذرت اور معافی کو منظور کرلیا، لیکن ابلیس لعین نے ایک ہفتے سے جو نشانہ فٹ کرر کھا تھا اور جو اس کا مقصد تھا چونکہ اس بیان سے پورا نہیں ہوا اس نے دیکھ لیا کہ اب تو معاملہ رفع دفع ہو رہا ہے، اس لئے وہ آگ بگولہ ہو گیا اور حضرت مولانا اور پورے مجمع کے سامنے شمشیر کو مخاطب کر کے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو، بات یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے یعنی وہ اپنے ابلیسی چال سے مجمع میں دھونس جما کر وہ اس کی زبان سے وہ کہلوانا چاہ رہا تھا جس کا ماحول اس نے ایک ہفتے سے بنا رکھا تھا، اس نے دیکھا میری ساری محنت پر پانی پھر گیا، تب اس نے پینترا بدل کر ابلیسی چال میں اس کو پھنسانا چاہا، لیکن جیسے اعجاز اعظمی نے یہ بات کہی حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب پورے جلال میں آ گئے اور پورے غصے میں اتنے زور سے اس کو ڈانٹا، یہ کہہ کر اعجاز تم میرے مدرسہ میں آگ لگانا چاہتے ہو، دار العلوم میں تم نے اسٹرائیک کروائی، میرے مدرسے میں بھی تم نے اسٹرائیک کروایا، میرے دار الحدیث میں تالا بند کروایا، اب صرف آگ لگانا باقی ہے، وہ بھی کرنا چاہتے ہو، حضرت مولانا کے اس پُر ہیبت اور پُر جلال ڈانٹ کے بعد پورا مجمع ان کے خلاف ہو گیا اور سب سے زیادہ غصہ میں عبد الکریم نامی حضرت مولانا کا لڑکا آیا جس نے گالی دے کر اس کا نام لے کر اس کو کہا کہ باہر نکلو میں تم کو بتاتا ہوں، اس کے بعد وہ ابلیس لعین ذلیل وخوار و رسوا ہو کر جیسے اس کے چہرے پر شیطان لعین نے پیشاب کر دیا ہو سر جھکائے ہوئے تیزی کے ساتھ بھاگا ورنہ یقیناً

وہ مارکھاجاتا۔

اس کے بعد ماحول میں بالتدریج سکون پیدا ہوااور تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوگیا۔ لیکن اس خادم کا دل ودماغ اس چھوٹے اور بے بنیاد تہمت تراشی والزام وپروپیگنڈہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کو سنبھلنے میں کئی ماہ لگ گئے اور بار بار یہ خیال دل ودماغ کو چوں کے لگاتا رہا کہ جہاں قرآن وحدیث ۲۴ گھنٹہ پڑھا پڑھایا جاتا ہو، دین ودیانت اور صداقت کی تعلیم دی جاتی ہو وہاں کا حال یہ ہے تو دوسری جگہوں کا حال کیا ہوگا اور اسی کے بعد سے وہاں سے دل اچاٹ ہونے لگا اور دل ودماغ کے رُخ میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی اور جو یکسوئی اور استحکام تھا اس میں تزلزل شروع ہوگیا، ادھر نائب ناظم جب سفر سے واپس آئے اور انہوں نے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا تو چند ہفتوں کے جائزہ کے بعد اگرچہ انہوں نے اس خادم کو یہ سرٹیفکٹ ضرور دیا کہ مولانا افضال الحق صاحب کے واقعہ میں میرے نزدیک آپ بے داغ بری ہیں اور آپ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا اور اڑایا گیا وہ مبنی بر کذب اور الزام وتہمت ہے، اس کے باوجود ان کے ذہن میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی اور جو بات اس حادثہ سے پہلے میں ان کے لب ولہجہ سے محسوس کرتا تھا اس میں بالتدریج فرق آنے لگا۔

اس حادثہ کے چند مہینے کے بعد یہ خادم عمرہ کے سفر پر روانہ ہوگیا، عمرہ کے سفر سے جب واپسی ہوئی اور دفتر نظامت میں نائب ناظم کی ملاقات کے لئے پہونچا تو انہوں نے بہت پرتپاک انداز میں ملاقات کی اور یہ بتلایا کہ اعجاز اعظمی کو تو مدرسہ نے نوٹس دے دیا ہے اور ان کا سامان بندھ رہا ہے، شام تک وہ روانہ ہوجائیں

گے اور مولانا افضال الحق صاحب نے خود ہی استعفیٰ دے دیا ہے اور مدرسہ نے ان کا استعفیٰ منظور کرلیا ہے۔اس طرح گویا کہ مدرسہ کی تطہیر عمل میں آچکی ہے اس خادم نے خاموشی کے ساتھ ان کی یہ بات سنی اور اپنے امور مفوضہ میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

(نوٹ)

حیات حبیب الامت کے باقی گوشے اور حالات انشاء اللہ حضرات قارئین جلد دوم میں ملاحظہ کریں گے۔لہٰذا جلد دوم کا انتظار کریں، ان شاء اللہ بہت جلد جلد دوم بھی آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہوگی۔